مولانا ابوالکلام آزاد
اور ہندوستانی قومی تحریک
مصنف: ڈاکٹر اجے انوپم
مترجم: ڈاکٹر جمیل اختر
www.bookmaza.com
خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

مولانا ابوالکلام آزاد

اور ہندوستانی قومی تحریک

مصنف

ڈاکٹر اے انوپم

مترجم

ڈاکٹر جمیل اختر

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

اشاعت : ۲۰۱۱ء

قیمت : -/۳۰۰روپے

طابع : اردو بک ریویو، ۱۷۳۹/۳ بیسمنٹ نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

ناشر: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ-۴

فہرست مضامین

حرف آغاز

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری محض ایک روایتی کتب خانہ نہیں بلکہ علم و ادب کی ترویج و اشاعت کا ایک فعال مرکز ہے۔ اس کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا ایک اہم حصہ کتابوں کی اشاعت سے تعلق رکھتا ہے۔ لائبریری کے شعبۂ اشاعت نے اب تک مختلف زبانوں میں اور مختلف موضوعات پر ۵۵۰ سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں۔ ان میں مخطوطات کے عکسی اور تدوین شدہ نسخے، تحقیقی مقالے، سیمناروں کی روئداد، خطبات کے متون، دواوین اور ناولٹ شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور کارہائے نمایاں کے حوالے سے بھی تقریباً ۲۰ کتابیں لائبریری نے مولانا آزاد ریسرچ سنٹر کے زیر اہتمام شائع کی ہیں۔

خدابخش لائبریری میں مولانا آزاد ریسرچ سنٹر کا قیام ۲۰۰۲ء میں ہوا۔ اس کے بعد لائبریری نے مولانا آزاد کے سلسلے میں تحقیق و تالیف کے کام میں متواتر دلچسپی لی ہے۔ گرچہ اس کے قبل بھی مولانا آزاد کے متعلق لائبریری نے چند کتابیں شائع کی تھیں لیکن اس مرکز کے قیام کے بعد ان کوششوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ برسوں میں مولانا آزاد کے متعلق ہندی میں ایک اور اردو میں تین کتابیں لائبریری نے شائع کی ہیں۔ ان میں ہندوستانی اور پاکستانی محققوں اور مصنفوں کی تصنیفات یکساں طور پر شامل رہی ہیں، کیونکہ مولانا آزاد کی شخصیت برصغیر کے مشترکہ تاریخی اور ثقافتی ورثے کا ایک بیش قیمت حصہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد گذشتہ صدی میں برصغیر کی اہم ترین شخصیتوں میں ممتاز و منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کی ذات ہمہ جہت تھی۔ ایک مدبر سیاست داں، عظیم مجاہد آزادی، اسلامی علوم کے جید عالم، عربی اور اردو زبانوں کے صاحب طرز انشا پرداز، شعلہ بیان مقرر، معروف صحافی اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے انفرادی شناخت رکھنے کے ساتھ وہ سیکولر روایات

کے علم بردار اور متحدہ قومیت کی درخشاں مثالوں میں ایک تھے۔

ڈاکٹر اجئے انوپم کے تحقیقی مقالے ''بھارتیہ راشٹریہ اندولن اور مولانا ابوالکلام آزاد'' کی ہندی زبان میں اشاعت خدابخش لائبریری کے ذریعہ ۱۹۸۹ء میں مولانا آزاد کی پیدائش کی صدی کے موقع پر کی گئی تھی۔ ڈاکٹر انوپم نے ۱۰ ابواب میں مولانا کی پیدائش کے وقت ہندوستان کے سیاسی منظر نامہ سے لے کر مولانا کی زندگی کے مختلف ادوار اور ان کی سیاسی بصیرت اور کاوشوں کا عالمانہ اور منصفانہ محاسبہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کے پیش نظر اس کی اشاعت ثانی ۲۰۰۷ء میں کی گئی۔ اسی وقت کتاب کے اردو ترجمے کی ضرورت بھی محسوس کی گئی۔ اس کام کی ذمہ داری ڈاکٹر جمیل اختر کو دی گئی اور انہوں نے کافی محنت سے اسے مکمل کیا۔ ان کی یہ کاوش اب قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ مجھے امید ہے کہ مولانا آزاد کے متعلق لائبریری کی دیگر مطبوعات کی طرح، اور اس کتاب کے ہندی ایڈیشن کی طرح بھی، اس اردو ترجمے کو عام مقبولیت حاصل ہوگی۔

ایک ایسے وقت میں جب نئی نسل اسلاف کے کارناموں کو یا تو فراموش کر چکی ہے یا ان سے ناواقف ہوگئی ہے، اس کتاب کے ذریعہ ماضی کے ایک درخشاں باب کو دیکھنے اور سمجھنے میں یقیناً مدد حاصل ہوگی۔

امتیاز احمد

دو لفظ

مولانا آزاد صدی کے موقع پر خدا بخش لائبریری نے پروگرام بنایا کہ مولانا کی اپنی مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابیں، ان کے خطوط، ان کے بکھرے ہوئے مضامین، جو بھی ضروری ہوں، چھاپے جائیں۔ مولانا آزاد کی اپنی مندرجہ ذیل کتابوں کی طباعت لائبریری کرچکی ہے یا کر رہی ہے:

(۱) آثارِ آزاد
(۲) حجت ابراہیمی
(۳) والعصر
(۴) پیغام
(۵) جامع الشواہد

ساتھ ہی اس کی تلاش بھی رہی ہے کہ آزاد پر کوئی اچھا کام ہوا ہو تو اس کو بھی سامنے لایا جائے۔

آزاد کے بارے میں ابھی تک ہندی میں ایک ملی جلی کتاب کے سوا جس میں ان کی تخلیقات بھی تھیں اور ان پر مضامین بھی تھے، کوئی اور کتاب نہیں آئی تھی۔ پھر ایک دن اتفاق سے ایک اچھی چیز مل گئی۔ یہ ڈاکٹر اجے انوپم کا تحقیقی کام تھا۔ ہمیں یہ مولانا آزاد پر ایک قابل ذکر کام لگا، جس میں مصنف نے ایک اہم موضوع کو لے کر ان کے کارناموں کو سامنے لانے کی ایک اچھی کوشش کی ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ یہ کتاب آزاد کے مطالعے میں بہت ہی معاون ثابت ہوگی۔

اے. آر. بیدار

ڈاکٹر اجے کمار اگروال (اجے انوپم)

پیدائش : ۱۱؍جولائی ۱۹۴۸ء
ایم.اے. آگرہ یونیورسٹی (سیاسیات، تواریخ)
پی ایچ.ڈی (۱۹۷۹ء) آگرہ یونیورسٹی
لکچرر شعبۂ تاریخ، اس.ڈی. ہندو انٹر کالج، ٹھاکردوارا، مرادآباد

پتہ : ریتی اسٹریٹ، مرادآباد

انسانی زندگی احساسات و تجربات کا ایک ایسا خزانہ ہے جو ہمیشہ بڑھتا ہی جاتا ہے، کبھی کم نہیں ہوتا، اس لازوال خزانے میں اضافے کے دوران کئی ایسے حادثات و واقعات رونما ہوتے ہیں جو انسانی ذہن و دماغ پر گہرے چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ چھاپ نہ صرف یہ کہ ایک فرد یا کچھ افراد پر مشتمل ایک چھوٹے طبقے کو متاثر کرتے ہیں بلکہ پورے ملک و قوم کے حال و مستقبل پر اپنے اثرات چھوڑتے ہیں۔ تاریخ ان اثرات کی جستجو کا مرتب نتیجہ ہے جو آنے والی نسل کو ماضی کی یاد تازہ کراتی ہے۔ اپنی زمین اور ملک کی تاریخ ہمیں اپنی قوم سے جوڑتی ہے۔

بچپن سے ہی میرے اس جذبے نے مجھے اپنے ملک کی تاریخ کے مطالعہ کا ذوق بخشا ہے۔ سیکڑوں اور ہزاروں سال کی اس امانت نے مجھے اپنے ملک کی مسلسل ترقی پذیر تہذیب کے توسط سے ملک کو سمجھنے کا شعور عطا کیا ہے۔ اس سمجھ سے ہی میں نے ویدک عہد کے جھروکے سے جھانکتی توصیف خداوندی و ثناگوئی سے لے کر دور جدید کے سیکولر آئین کی پالیسیوں پر عمل درآمدگی کا غیر معمولی سفر کرتے ہوئے مختلف فرقوں، ذاتوں، تہذیبوں اور مذاہب کے طبل جنگ، اعلانِ فتح نیز صدائے شادمانی و مسرت سنے ہیں۔ ان میں رفاقت و شفقت، رنج و غم، دکھ سکھ، شکست و فتح اور عروج و زوال کی ہلچل اور شور و غوغا کے درمیان رواں دواں ''ستیم شوم سندرم'' کا مکمل سبق پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں مجھے ہندوستان میں اسلام کی آمد اور اس کے بعد پیدا شدہ فرقہ وارانہ اونچ نیچ کا تعارف حاصل ہوا۔ گہرے مطالعے پر میں نے پایا کہ تمام تر تاریخ میں یہ اونچ نیچ اُبھرتی رہی ہے اور انھیں غیر مؤثر بنانے کے لیے کچھ کوشش بھی کی جاتی رہی ہے، لیکن انھیں جڑ سے اکھاڑا نہیں جاسکا ہے۔

ہندوستان میں غیر ملکی حکومت کے تقریباً دو سو برسوں کی مدت میں ہندو مسلمان کا

متعلق زیادہ سے زیادہ جانکاری فراہم کرا سکے۔

کام کے جوش و ولولے میں جب میں دریائے علم میں اُترا تو مجھے معلوم ہوا کہ بے انتہا مواد بکھرے پڑے ہیں، اگر انھیں ایک جگہ اکٹھا کیا جائے تو کئی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا مجھے ان کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو چھوڑتے ہوئے اپنا دائرہ عمل صرف مولانا آزاد کی سیاسی سرگرمیوں کی حد تک ہی سمیٹ لینے کے لیے مجبور ہونا پڑا جو اس تحقیقی کام کا بنیادی مقصد ہے۔ مولانا آزاد کی سیاسی سرگرمیوں کی صحیح شکل و صورت کو سمجھنے کے لیے ضروری تھا کہ ہندوستان کی قومی تحریک کے گاندھیائی دور سے قبل کی ان کی سرگرمیاں بھی جان لی جائیں۔ لہٰذا میں نے مولانا آزاد کی پیدائش سے لے کر حصول آزادیٔ ہند تک انجام دیے گئے ان کے سیاسی کاموں کو اپنے تحقیقی کام میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔

پیش نظر معروضات کو ختم کرنے سے قبل میں اپنے نگراں محترم ڈاکٹر وشوناتھ جی ٹنڈن، میرے استاد اور سابق پروفیسر شعبۂ تاریخ کے. جی. کے. کالج مرادآباد اور موجودہ گاندھی اسارک نیدھی راج گھاٹ کے خادم کے متعلق اپنے تمام تر دلی جذبات نیز عزت و احترام کے ساتھ اظہار تشکر کرتا ہوں۔ ان کی رہنمائی و مہربانی کے بغیر یہ کام مکمل ہونا ممکن نہیں تھا۔ موصوف نے جتنی محبت و شفقت مجھے دی ہے اس سے مجھے اپنے تحقیقی کام کو مکمل کرنے کی تحریک ملی ہے نیز اخلاقی قوت حاصل ہوئی ہے۔ یہ محبت و شفقت میرے لیے بے بہا خزانہ ہے۔ تحقیقی کام کے دوران مجھے متعدد رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ کبھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ مشکلات سے تنگ آکر کام کو چھوڑ دینے کا خیال بھی میرے ذہن میں اُبھرا ہے لیکن حصول علم کے تجسس نے میرے ڈگمگاتے قدم کو جمے رہنے کی قوت و طاقت عطا کی۔

مجھے شری مہندر پرتاپ جی پرنسپل کے. جی. کے. کالج مرادآباد سے وقت وقت پر اپنے مقالے کی تحریر میں جو تعاون اور رہنمائی ملتی رہی ہے اس کے لیے میں تہ دل سے ان کا مشکور و ممنون ہوں۔ شری مہندر پرتاپ جی کے علاوہ اپنا کام کرنے کے لیے مجھے شری سریش دت شرما چھک پرنسپل امبیکا پرساد انٹر کالج مرادآباد سے جو تحریک ملی ہے اس کے لیے ان کا شکریہ ادا کیے بغیر یہ کام شاید ادھورا ہی رہے گا۔

میں مولانا آزاد کے ساتھی پنڈت سندر لال جی کا بھی احسان مند ہوں جنھوں

نے مجھے اپنا قیمتی وقت دے کر میری رہنمائی کی ہے، جامعہ ملیہ، دہلی کے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا بھی میں دل سے احسان مند ہوں، جنھوں نے اپنی بے پناہ مشغولیت کے باوجود میرے لیے وقت نکالا اور مجھے کئی قیمتی مشوروں سے نواز کر میری رہنمائی فرمائی ہے۔

میں مہاتما گاندھی کی غیر مطبوعہ خط و کتابت نیز ہریجن سیوک کی پرانی فائلوں کے مطالعے کی سہولت فراہم کرنے کے لیے دہلی کے گاندھی اسارک سنگرہالیہ ایوم پُستکالیہ، راج گھاٹ، موتی لال نہرو پیپرس اور اے. آئی. سی. سی. پیپرس کے مطالعے کی سہولت بہم پہنچانے کے لیے جواہر لال نہرو سنگرہالیہ ایوم پستکالیہ، تین مورتی بھون، دہلی، ڈاکٹر راجندر پرساد پیپرس، ایم. آر. جیکر پیپرس، پدکانت مالویہ سنگرہ کی ابھودے مائیکروفلم، ڈاکٹر نارائن بھاسکر کھرے پیپرس، سوراج پارٹی پیپرس اور وزارتِ داخلہ و خارجہ کی پرانی فائلوں کے مطالعہ کی اجازت دینے کے لیے نیشنل آرکائیوز، جن پتھ، دہلی، مولانا آزاد سے متعلق اردو کتابیں، رسالے و جریدے، مولانا آزاد کی غیر مطبوعہ تصانیف، ان کی ادارت میں مطبوعہ رسائل و جرائد کی پرانی فائلوں کے مطالعے کی فراہمی کے لیے اندر پرستھ، دہلی کے آزاد بھون میں واقع گورنمنٹ آف انڈیا کی سانسکرتک سمبندھ پریشد، مولانا آزاد کی ادارت میں نکلنے والے اردو رسائل ''الہلال'' اور ''البلاغ'' نیز اردو کے قدیم اخبارات کے مشاہدے و مطالعے کی سہولت دینے کے لیے مسلم پبلک لائبریری، مرادآباد اور اس سلسلے کی دیگر کتابوں کے مطالعے کی سہولت بہم پہنچانے کے لیے جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی، مارواڑی لائبریری، چاندنی چوک، دہلی، گاندھی شانتی پرتشٹھان پُستکالیہ، دہلی، برج رتن ہندو پبلک لائبریری، مرادآباد، میونسپل پبلک لائبریری، مرادآباد، کے. جی. کے. کالج لائبریری، مرادآباد، پریم سبھا پستکالیہ، کاشی پور ضلع نینی تال کے لائبریرین حضرات نیز کارکنندگان کا میں بطور خاص تہ دل سے ممنون ہوں جنھوں نے بہت ساری مشکلات کے باوجود میرے تحقیقی کام میں حتی المقدور وحتی الامکان مدد کی ہے۔

جس خدائے برتر کی مہربانی سے یہ کام مکمل ہوا ہے اس خدائے برتر کے حضور میں عاجزانہ و منکسرانہ التجاؤں کے ساتھ۔

ڈاکٹر اے انوپم

(۱)

آزاد کی پیدائش سے آزادی تک

(۱۸۸۸ء تا ۱۹۴۷ء)

مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش ۱۸۸۸ء میں ہوئی تھی اس وقت تک ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کو ۳۱ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور اس دوران انگریزوں کی حکومت پورے ہندوستان پر قائم ہو چکی تھی بلکہ ریاستوں اور دیگر جاگیردارانہ قوتوں کے اندر اب اتنی توانائی باقی نہیں رہی تھی کہ وہ انگریزوں کی مخالفت کر سکتیں لہٰذا انگریز بھی ان کی طرف سے مطمئن ہو چکے تھے۔ ملک میں انگریزی تعلیم کے پھیلاؤ کی وجہ کر تعلیم یافتہ طبقے میں قومیت کے جذبات کا ارتقا ہوا۔ اس سے متفکر ہو کر انگریزی سرکار نے ملکی ریاستوں کو تحفظ دے کر ان کی موافقت اور تعاون سے جذبۂ قومیت کی مخالفت کرنی شروع کر دی (۱)۔ دیشی ریاستیں انگریزوں کی محافظ بن گئیں۔ بیس سالوں تک رائے مشورے کے بعد ۱۸۷۰ء میں لارڈ میو کی سرکار نے اقتصادی نظام میں سدھار کے لیے صوبائی حکومتوں کو ریاستی خود مختاری (پروونشیل آٹونومی) کے نام پر اقتدار میں خود مختارانہ حقوق عطا کیے (۲)۔ لیکن درحقیقت اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ مختلف صوبوں کے باشندوں کے درمیان آپسی اتحاد و اتفاق نیز قومی جذبات پیدا نہ ہونے پائے (۳)۔ ہندوستان کا انگریزی پڑھا لکھا طبقہ انگریزوں کی تاریخ اور انگلستان کی سیاسی صورتحال سے واقف ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ طبقہ انگریزوں کی فراخدلی اور وسعت نظری سے بھی کافی متاثر تھا۔ جاگیرداروں اور نوابوں کے کمزور پڑنے سے ان تعلیم یافتہ متوسط طبقوں کو آگے بڑھ کر سماج کی نمائندگی کرنے کا موقع حاصل ہوا۔ غدر کے بعد ہندستان میں انگریزی سرکار نے جو پالیسی اپنائی تھی اس سے یہ طبقہ غیر مطمئن تھا کیوں کہ کمپنی کا اقتدار ختم کیے جانے کے وقت انگلینڈ کی ملکہ وکٹوریہ نے مذہب اور ذات پات کا

خیال کیے بغیر سبھوں کو حکومت میں حصہ داری کے حقوق بالخصوص خدمات نظم و نسق میں مقام دینے کا جو اعلان کیا تھا اسے عملی طور پر بروئے کار لانے کے لیے انگریز حکمرانوں اور ان کی انتظامیہ کے ذریعہ یکسر نظر انداز کیا جا رہا تھا (۴)۔ نتیجتاً پورے ہندستان میں سیاسی اداروں کا قیام عمل میں آنے لگا۔

دادا بھائی نوروزی نے لندن میں ''ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن'' قائم کیا۔ ہندستان کے خاص خاص شہروں میں بھی اس کی شاخیں قائم کی گئیں (۵)۔ جسٹس مہادیو گوبند سرراناڈے نے ۱۸۷۰ء میں ایک عوامی مجلس کی بنیاد رکھی۔ بنگال میں سریندر ناتھ بنرجی اور آنند موہن بوس کی کوششوں سے ۲۶ر جولائی ۱۸۷۶ء کو انڈین ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا (۷)۔ اس وقت اٹلی کے دیش بھگت میجینی اور گیری بالڈی کی دیکھا دیکھی بنگال میں بھی خفیہ ادارے قائم کیے گئے لیکن ان خفیہ اداروں کے ذریعہ کوئی عوامی تحریک اُجاگر کرنا یا عوام الناس میں سیاسی شعور پیدا کرنا بہت مشکل تھا۔ اس لیے اس وقت ان خفیہ اداروں کی تنظیم اور اثرات دونوں ہی کم رہے لیکن سماجی تنظیمیں برابر قائم ہوتی رہیں۔ ۱۸۸۱ء میں مدراس مہاجن سبھا قائم ہوئی (۹)۔ ۱۸۸۳ء میں انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کے ہندستانی افسر کلکتہ کے پریسڈنسی مجسٹریٹ بہاری لال گپتا کی کوششوں سے لارڈ رپن کے قانونی سکریٹری سرکوٹنی البرٹ نے ہندستانی ججوں کا دائرہ اختیار بڑھانے کے لیے البرٹ بل پیش کیا (۱۰)۔ اس بل کے مطابق ہندوستانی ججوں کو انگریزوں کے مقدمے سننے اور ان پر فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جانا تھا۔ انگریزوں نے متحد ہو کر اس بل کی مخالفت کی جس کے نتیجے میں سرکار نے یہ بل واپس لے لیا۔ ہندوستان میں یہ دوسرا موقع تھا جب گوروں کے ذریعہ مخالفت کرنے پر کوئی بل سرکار نے واپس لیا تھا (۱۱)۔ سرکار کے ذریعہ البرٹ بل واپس لے لیے جانے پر ہندوستانی افسران کو تنظیم کی اہمیت کا احساس ہوا اور انھوں نے فوراً ہی کلکتہ کے البرٹ ہال میں ۲۸ر تا ۳۰ دسمبر ۱۸۸۳ء ایک قومی اجلاس منعقد کیا۔ مسٹر آنند موہن بوس اور مسٹر سریندر ناتھ بنرجی نے ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے پیش نظر ایک سیاسی تنظیم بنانے کا خیال پیش کیا (۱۲)۔ جناب بدرالدین طیب جی، فیروز شاہ مہتہ اور جسٹس کاشی ناتھ تریمبک تیلنگ کی کوششوں سے ۳۱ر جنوری ۱۸۸۵ء کو بمبئی پریسڈنسی ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا (۱۳)۔ ۱۸۸۵ء میں ریٹائرڈ سرکاری افسر مسٹر اے۔ او۔ ہیوم نے موجودہ گورنر جنرل اور وائسرائے لارڈ ڈفرن

کے مشورے سے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی (۱۴)۔ یوم تاسیس سے لے کر اوائل کے چند برسوں تک کانگریس ایک وسیع النظر اور برٹش حکومت کی حلیف تنظیم رہی کیوں کہ اس کے قیام کے وقت سے ہی حکومت کا دست شفقت اس کے سر پر رہا (۱۵)۔ لیکن بعد میں سرکار کی جانب سے کانگریس کی ہرممکن طور پر مخالفت کی جانے لگی (۱۶)۔

شروع سے ہی کانگریس پارٹی کا نظریہ قومی تھا۔ ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی وغیرہ سبھی مذاہب کے لوگ اس کے ممبر تھے۔ کانگریس کے پہلے اجلاس کے صدر مسٹر امیش چندر بنرجی ہندوستانی عیسائی تھے۔ دوسرے اجلاس کے صدر دادا بھائی نوروزی پارسی تھے۔ تیسرے اجلاس کے صدر جناب بدرالدین طیب جی مسلمان تھے جب کہ چوتھے اور پانچویں اجلاس کی صدارت بالترتیب جارج ویول اور سرولیم ویڈرورن انگریز نے کی تھی لیکن اس وقت کانگریس میں مسلمان ممبروں کی تعداد ملک میں ان کی آبادی کے تناسب سے کم تھی۔ اس کے کچھ خاص وجوہات بھی تھے جس کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ وقت کے ساتھ ساتھ کانگریس کے ممبران بالخصوص نوجوانوں میں بیداری بڑھتی جا رہی تھی۔ دنیا میں اس وقت گوروں کے اثرات کم ہوتے جا رہے تھے (۱۷)۔ ملک کی اقتصادی حالت بگڑتی جا رہی تھی اور یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ بار بار کی مانگ کرنے کے باوجود سرکار کے ذریعہ سدھار نہ کرنے سے مزید غیر مطمئن ہوتا جا رہا تھا اور حکومت کا رُخ برابر کانگریس کے مطالبات کے تعلق سے ہمدردانہ نہیں رہ رہا تھا۔ ۱۸۹۲ء کے کاؤنسل ایکٹ میں کیے گئے سدھاروں سے ایک طرف کانگریس غیر مطمئن تھی ہی، دوسری طرف اس کی وسیع النظر پالیسی کو بھیک مانگنے کا رویہ کہہ کر نوجوان طبقے نے کچھ ایسا انقلابی اقدام کرنے کا تہیہ کیا جس سے بے بس ہو کر سرکار کو ان کی سدھاروں سے متعلق باتیں ماننے پر مجبور ہونا پڑا۔ نتیجتاً جیسے جیسے وقت گزرتا گیا کانگریس میں انتہا پسند (پُرجوش) خیالات پنپتے گئے۔ اس انتہا پسند طبقے کی نمائندگی لوک مانیہ بال گنگا دھرتلک، بپن چندر پال اور لالہ لاجپت رائے یعنی بال، پال، لال کے نام سے مشہور مثلث کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ اس وقت کی سیاسی حالت ہے جب مولانا ابوالکلام آزاد اپنے بچپن کے دور میں تھے۔ اس انتہا پسند خیالات کی وجہ کر ہی ۱۹۰۷ء میں کانگریس کے ''نرم'' اور ''گرم'' دَلوں کا اختلاف اتنا بڑھا کہ سورت کے اجلاس میں کانگریس کے اندر پھوٹ پڑ گئی اور ''نرم دَل'' والوں نے جن کی ابھی بھی پارٹی میں اکثریت تھی، کانگریس کے دستور میں ترمیم

کر کے اس کا دروازہ ''گرم دَل'' والوں کے لیے بند کر دیا (۱۸)۔

مسلم فرقہ واریت کا آغاز اور مسلم لیگ کا قیام

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد انگریز ہندو اور مسلمان دونوں ہی کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے تھے کیوں کہ ہندو راجاؤں اور مسلمان نوابوں نے مل کر انقلاب میں حصہ لیا تھا (۱۹)۔ ہندوستان اور خاص کر شمالی ہند کے مسلمان سمجھتے تھے کہ انگریزوں نے اقتدار ہم سے چھینا ہے اس لیے وہ انگریزوں سے متنفر تھے۔ انگریزوں کے ذریعہ بھارت کے ادھیوگ دھندے برباد کر دیے جانے کا سب سے زیادہ اثر بھی انھیں پر پڑا تھا۔ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ کاریگر تھا اس لیے گھریلو صنعتوں کے برباد ہونے سے وہ غریب اور بے سہارا ہو گیا تھا۔ زمیندار طبقہ بھی انھیں سہارا نہ دے سکا۔ اپنی غریبی اور تنگ حالی کی وجہ کر مسلمان انگریزی تعلیم بھی حاصل نہ کر سکے لہٰذا سرکاری نوکریوں کے دروازے بھی ان کے لیے بند تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف غم وغصہ اور نفرت کے جذبات تھے۔ انگریز بہت پہلے سے ہی اس جانب سے چوکنے تھے۔ لارڈ ایلنبرا کا کہنا تھا کہ اس (مسلمان) ذات کی ہم سے متعلق بنیادی دشمنی ہے اس لیے ہماری پالیسی ہندوؤں کو اپنی حمایت میں لانے کی ہونی چاہیے (۲۰)۔ غدر کے بعد یہ پالیسی اور بھی پختہ ہو گئی۔ وہابی تحریک کی شدت (۱۸۵۸-۶۸ء) سے مسلمانوں پر انگریزوں کا عدم اعتماد اور گہرا ہو گیا (۲۱)۔ ۱۸۷۰ء کے دوران انگریزوں کو ہندوؤں پر زیادہ اعتماد رہا۔

ہندوستان کے تعلم یافتہ طبقے میں انگریزوں کے خلاف بڑھتی ہوئی بے اطمینانی کی وجہ کر انگریزوں کو ان کے متبادل کی شکل میں مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور ۱۸۷۰ء میں ڈبلیو. ڈبلیو. ہنٹر کی تصنیف ''دی انڈین مسلمان'' کی اشاعت سے انگریزوں کی پالیسی پوری طرح ہندو مخالف اور مسلم موافق ہو گئی (۲۲)۔ مسلمانوں کو انگریزوں کا حمایتی بنانے میں سرسید احمد کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ غدر میں انگریزوں کی جان بچا کر وہ اپنی حکومت پرستی کا ثبوت دے چکے تھے (۲۳)۔ انھوں نے مسلمانوں کی انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کی اور خود ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ اورینٹل کالج قائم کیا۔ اس کا مقصد انگریز پرست مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کرنا

تھا۔ سرسید احمد خاں نے ۱۸۷۷ء میں وائسرائے لارڈ لٹن کو لکھے اپنے ایک خط میں
ہندوستانی مسلمانوں کو برٹش تاج کی اہل اور لائق رعایا بنانا اور ان میں ایک اچھی سرکار کے
نظم سے پیدا ہونے والی حکومت پرستی کے جذبات کو اُجاگر کرنا، علی گڑھ کالج کا مقصد بتایا
تھا(۲۴)۔ ۱۸۸۳ء میں اس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کر دیا گیا۔ آج یہی علی گڑھ مسلم
یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔ سرسید احمد خاں ابتدا میں نیشنلسٹ تھے(۲۴) اور خود کو
ہندوستانی ہونے کے ناطے ہندو ماننے میں فخر کا احساس کرتے تھے(۲۶)۔ جب مسٹر
سریندر ناتھ بنرجی نے آئی.سی.ایس. امتحان کے قاعدوں میں ترمیم کرنے کے لیے ملک گیر
دورہ کیا تھا تو سرسید احمد خاں نے علی گڑھ میں ہوئے جلسے کی صدارت کی تھی(۲۷)۔ لیکن وہ
آہستہ آہستہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک (۹۹-۱۸۸۳ء) سے متاثر
ہو کر قومیت کے نظریے سے دور ہٹتے گئے۔ مسٹر بیک کے نقطۂ نظر کی جانکاری ان کے
ہندوستان آنے کے پہلے ہی ہو گئی تھی(۲۸)۔ انھی مسٹر بیک کے حلقۂ اثر میں آنے کے بعد
انھوں نے مسلمانوں کو صلاح دی تھی کہ وہ سیاست سے دور رہیں(۲۹) لیکن مسلمانوں کے
ذریعہ کانگریس کے اجلاس میں حصہ لینا بند نہیں ہوا(۳۰)۔ پھر بھی انگلینڈ میں یہ پروپیگنڈہ
کیا جا رہا تھا کہ کانگریس سے مسلمان باہر آ رہے ہیں اور سرسید احمد خاں کی نمائندگی قبول کر
رہے ہیں(۳۱)۔ ملک میں اس وقت (۸۸-۱۸۸۷ء) گئو رکچھا آندولن چل پڑا تھا۔ اس کا
فائدہ اٹھا کر سرکار کے حمایتی مسلمانوں نے الہ آباد میں ایک جلسہ کر کے مسلمانوں کے
کانگریس میں حصہ نہ لینے کی حمایت میں ایک فتویٰ جاری کیا۔ اس کے خلاف مولوی
عبدالقادر لدھیانوی کی کوششوں سے ایک اہم فتویٰ جاری کیا گیا جس میں مسلمانوں کو
دنیاوی امور میں کانگریس کے ساتھ چلنے اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی اجازت
دی گئی تھی(۳۲)۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس میں مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔

۱۸۸۸ء میں کانگریس کے بڑھتے ہوئے اثرات کے خلاف ماہ اگست میں علی گڑھ میں
سرسید نے بنارس کے راجہ شیو پرساد ستارۂ ہند کے ساتھ مل کر یونائیٹڈ انڈیا پیٹریاٹک ایسوسی ایشن
قائم کی۔ اس تنظیم کا مقصد ہندو مسلمان دونوں کو کانگریس میں آنے سے روکنا تھا(۳۳)۔
ہندو اور مسلمان دونوں ہی اس کے ممبر ہو سکتے تھے لیکن اس طرح کی غیر فرقہ وارانہ ہندو
مسلمان تنظیم سے انگریزوں کی مقصد برآری نہیں ہو سکتی تھی لہٰذا ہندو مسلمان دونوں میں

سماجی طور پر افتراق پیدا کرنے کے مواقع تلاش کیے جانے لگے۔ ۱۸۸۹ء میں مسٹر بریڈلا
نے انگلستان کی پارلیامنٹ میں یہ تجویز رکھی کہ بھارت میں جمہوری نظام قائم کیا جائے۔
بھارت میں مسٹر بیک نے اس کے خلاف ایک میمورنڈم تیار کرایا اور بیس ہزار سات سو
پینتیس دستخط کرا کے انگلستان کی پارلیامنٹ کو بھیجا۔ یہ دستخط ہندو مسلم اتحاد میں پھوٹ
ڈالنے کے لیے غلط پروپیگنڈہ کرتے ہوئے لوگوں کو دھوکہ دے کر کرائے گئے تھے(۳۴)۔
۱۸۹۳ء میں مسٹر بیک کے تعاون سے محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی گئی،
جس کے سکریٹری کا عہدہ مسٹر بیک کو سونپا گیا(۳۵)۔ اس کی افتتاحی تقریر میں مسٹر بیک
نے واضح طور پر کہا کہ کانگریس کا مقصد انگریزوں سے اقتدار چھین کر ہندوؤں کے ہاتھ میں
دینا ہے اور ''گئو رکچھا آندولن'' کے ذریعہ مسلمانوں کی مخالفت کرنا ہے۔ اس لیے اس تنظیم کا
نام محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن رکھا گیا ہے(۳۶)۔ سرسید نے مسلمانوں کو
کانگریس سے الگ رکھنے کے لیے آگے چل کر ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' نام کی ایک تنظیم
قائم کی، جس کے اجلاس انھیں دنوں ہوتے تھے جب کانگریس کے اجلاس ہوا کرتے تھے
تاکہ مسلمان کانگریس کے اجلاس میں حصہ نہ لے سکیں(۳۷)۔

۱۸۹۸ء میں سرسید احمد خاں اور ۱۸۹۹ء میں مسٹر تھیوڈور بیک کا انتقال ہو گیا۔ مسٹر
بیک کی جگہ پر مسٹر تھیوڈور ماریسن علی گڑھ کالج کے پرنسپل مقرر کیے گئے۔ مسٹر ماریسن کے
بعد یہ جگہ مسٹر آرچ بولڈ کو ملی۔ آہستہ آہستہ مسلمان انگریزوں کے قریب تر آتے گئے۔ اکتوبر
۱۹۰۶ء کو سر آغا خاں کی نمائندگی میں مسلمانوں کی ایک نمائندہ جماعت وائسرائے لارڈ منٹو
سے ملی اور کچھ مطالبات پیش کیے۔ وائسرائے نے ان لوگوں کو یہ یقین دلایا کہ مسلمانوں کی
نمائندگی ایک الگ فرقے کی شکل میں قبول کی جائے گی(۳۸)۔ اس کے بعد ۳۰ر دسمبر
۱۹۰۶ء کو مسلم لیڈران نے مسلم لیگ قائم کی۔

لیگ کا قیام ایک حکمراں پرست اور فرقہ پرست تنظیم کی شکل میں ہوا تھا۔ اس کا
مقصد مسلمانوں میں حکمراں پرستی کے جذبے کو فروغ دینا، مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت
کرنا اور نرم الفاظ میں ان کے خیالات حکومت کے سامنے رکھنا اور ان بنیادی مقاصد کو
نقصان پہنچائے بغیر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان دوستی کے جذبات پیدا کرنا طے
کیا گیا(۳۹)۔

اس طرح اس دور میں مسلم فرقہ واریت کو بڑھاوا ملا، جس کا عروج ۱۹۰۶ء میں آغا خاں کی تحریک پر مسلم لیگ کے قیام کی شکل میں سامنے آیا۔

انگریزوں کے تعلق سے ہندوستانی مسلمانوں کی مایوسی

انگریزوں کی تحریک اور حوصلہ افزائی سے ہی مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ آغا خاں نمائندہ جماعت کو وائسرائے کے ذریعہ دی گئی یقین دہانیوں سے مسلمان انگریزوں کے حلیف۔ بنتے جارہے تھے لیکن بعد میں یہی مسلمان انگریزوں کو اپنا مخالف اور بدخواہ ماننے لگے۔.اس کے پس پشت کچھ وجوبات تھے:

(۱) لارڈ کرزن نے بنگال کو تقسیم کر دیا تھا، جس سے نیشنلسٹ مسلمان خوش نہیں تھے۔ ملک کے ان حصوں میں جہاں انگریزوں کے حمایتی مسلمان لیڈر نہیں تھے یا پھر ان کا اثر نہیں تھا وہاں ہندو مسلمان دونوں مل کر سودیشی تحریک میں حصہ لے کر انگریزی سامانوں کا بائیکاٹ کر کے تقسیم بنگال کے خلاف اپنا غصہ ظاہر کر رہے تھے(۴۰)۔

(۲) مسلمان انگریزوں کو اپنا بہی خواہ سمجھتے تھے لیکن جب انھیں یہ محسوس ہوا کہ انگریز مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں نہ صرف دخل دیتے بلکہ انھیں نقصان بھی پہنچاتے ہیں تو انھوں نے انگریزوں کی مخالفت کرنا شروع کر دی۔ اسلامی ممالک کے تعلق سے انگریزوں کے توہین آمیز رویے کے پیش نظر مسلمانوں میں بیداری آئی۔ ترکی کے بین الاقوامی سطح پر لگاتار کم ہوتے وقار سے مسلمانوں کو انگریزوں پر پہلے جیسا اعتماد نہیں رہا کیوں کہ ترکی کا وقار گرانے میں انگریزوں کا بڑا ہاتھ تھا(۴۱)۔ ۱۹۰۸ء میں جب ینگ ترک موومنٹ کے اثرات بڑھے تو وہاں کے قوم پرستانہ افکار اور ان انقلابیوں کے ذریعہ حکومت میں جمہوری نظام کی تائید کیے جانے سے ہندوستانی مسلمان کافی متاثر ہوئے۔

(۳) ہندوستانی مسلمان مذہبی طور پر بھی ترکی کے حکمراں سے جڑے تھے کیوں کہ ترکی کا سلطان مذہب اسلام کا سربراہ ہوتا تھا اور وہ خلیفہ کہلاتا تھا۔ اس لیے ترکی کی سلطنت مسلمانوں کی نظر میں مذہب اسلام کی سلطنت تھی۔ اس سلطنت کو ہونے والا کسی بھی طرح کا نقصان مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ جب ترکی

کی اندرونی مشکلات کا فائدہ اٹھا کر اٹلی نے ۱۹۱۱ء میں ترکی کی ایک ریاست ''ترپولی'' پر قبضہ کرلیا اور انگلینڈ نے اٹلی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا جب کہ اٹلی انگلستان کے دشمنوں کی صف میں مانا جاتا تھا اور انگلستان کا شمار ترکی کے دوستوں میں ہوتا تھا — تو ہندوستانی مسلمانوں میں بے چینی پھیل گئی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیڈران نے ترکی کے قوم پرست رہنماؤں سے رابطہ قائم کیا۔ اس رابطے سے مسلمانوں پر یہ انکشاف ہوا کہ انگلینڈ کی پالیسی ترکی کو کمزور کرنے کی ہے اور جان بوجھ کر اسلامی طاقت کی مخالفت کرنا ہی انگریزوں کی بنیادی پالیسی ہے(۴۳)۔ یہ معلوم ہو جانے پر انگریزوں کی وسیع النظری پر سے مسلمانوں کا اعتماد ختم ہوگیا۔

(۴) ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم کرتے وقت وائسرائے لارڈ کرزن نے مسلمانوں کو ایک الگ مسلم اکثریت والی ریاست کا سنہرا خواب دکھا کر انھیں بٹوارے کی حمایت کرنے کے لیے راضی کیا تھا(۴۴)۔ لیکن ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کو اچانک ختم کر دیا گیا تھا اس سے برٹش سرکار کے حمایتی مسلمان انگریزوں سے ناخوش ہو گئے اور ان کا اعتماد انگریزوں پر سے اٹھنے لگا۔

(۵) اس وقت دنیا کے مسلم ممالک میں مثلاً ترکی، مصر، سوڈان، ایران، سیریا، جارڈن، فلسطین وغیرہ ملکوں میں دھیرے دھیرے جذبۂ قومیت کا آغاز ہو رہا تھا جس کا اثر ہندوستانی مسلمانوں پر پڑنا فطری بات تھی۔

(۶) مسلمانوں میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ جیسے قوم پرست رہنما مسلمانوں کو مذہبی تنگ نظری اور علیحدگی پسندی کی جگہ پر جذبۂ قومیت کے احساس کے ساتھ ایک ہو کر چلنے کا راستہ دکھا رہے تھے۔ لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں میں برٹش حکمراں پرستی کی جگہ پر حکومت مخالف اور قوم پرستانہ جذبات مضبوط و مستحکم ہو رہے تھے(۴۶)۔

(۷) مسلم اخباروں جیسے کلکتہ سے شائع ہونے والے ''الہلال''، دلی کے ''ہمدرد'' اور ''کامریڈ''، لاہور کے ''زمیندار'' وغیرہ نے انگریز مخالف جذبات کو پھیلانے میں اہم رول ادا کیا۔ ترکی سے شائع ہونے والا اخبار ''جہانِ اسلام'' نے بھی ترکی کی

حمایت اور انگریزوں کی مخالفت میں عوامی جذبات کو اُکسانے میں کافی مدد دی (۴۷)۔

کانگریس اور مسلم لیگ

انگریزوں کی پالیسیوں کا حقیقی چہرہ سامنے آجانے سے مسلم لیگ اب کانگریس کے نزدیک آتی جا رہی تھی۔ دوسری طرف ہندوستانی لیڈران قومی جذبے کو پھیلانے میں لگاتار مشغول تھے اور لیگ کو کانگریس کی مخالفت چھوڑ کر تحریک آزادی میں کانگریس کی مدد کرنے پر زور دے رہے تھے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۱۳ء میں سرابراہیم رحمت اللہ کی صدارت میں منعقد لیگ کے اجلاس میں لیگ نے اپنے آئین میں ترمیم کی، نیز اپنے مقاصد میں تبدیلی کا اعلان کیا۔ اب لیگ کا مقصد برٹش سامراج کے تحت موجودہ طرز حکمرانی میں سدھار اور ملک کے دیگر فرقوں کے تعاون سے اپنی حکومت قائم کرنا ہو گیا تھا (۴۸)۔

کانگریس نے ستمبر ۱۹۱۳ء میں اپنے کراچی اجلاس میں لیگ کے ان مقاصد کا استقبال کیا۔ ۱۹۱۵ء میں لیگ اور کانگریس دونوں کے اجلاس ایک ہی وقت میں بمبئی میں ہوئے۔ یہاں آپسی تعاون کے لیے ملک کے آئندہ طرز حکومت میں سدھار وغیرہ کے لیے منصوبے بنانے کا پروگرام طے کیا گیا (۴۹)۔

۱۹۱۶ء میں کانگریس اور لیگ دونوں کے اجلاس ایک ہی ساتھ لکھنؤ میں ہوئے۔ مسز اینی بیسنٹ کی کوششوں سے اعتدال پسند اور شدت پسند طبقے کے درمیان سمجھوتہ ہو جانے سے وہ لوگ بھی جو سورت اجلاس میں پرانے والے پھوٹ کی وجہ کر کانگریس سے الگ ہو گئے تھے، کانگریس میں پھر سے لوٹ آئے (۵۰)۔ یہاں سے لیگ اور کانگریس دونوں کے لیڈران نے ملکی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے ایک آپسی سمجھوتہ کیا، جس میں دونوں تنظیموں نے ایک دوسرے کے وجود و اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ملک میں آئینی اصلاحات کے لیے مل کر کام کرنے کی بات قبول کی (۵۱)۔

یہاں ہوئے سمجھوتے کے مطابق کانگریس نے لیگ کی الگ انتخاب اور فرقہ وارانہ نمائندگی کی مانگ قبول کر لی (۵۲)۔ اور قومی حکومت کی جہت میں کوشش کرنے اور بھارت کو انگریزوں کے زیر نگیں حکومت کی شکل میں رہنے کی مخالفت کرنے کا تہیہ کیا (۵۳)۔

تحریک خلافت

لکھنؤ سمجھوتے سے ملک میں فرقہ وارانہ اتحاد و اتفاق کا ماحول پیدا ہوا تھا، اگرچہ کچھ فرقہ پرست مسلمان اس کی مخالفت کر رہے تھے (۵۴)۔ اس کے باوجود سارے ملک میں آزادی حاصل کرنے کے جذبے کو اس سمجھوتے سے بڑی تقویت ملی تھی۔ مسٹر بال گنگا دھر تلک اور مسز اینی بیسنٹ نے "ہوم رول آندولن" چھیڑ دیا تھا۔ ملک کے عوام بڑے ہی جوش و خروش کے ساتھ اپنی تحریکوں کو تیزی سے آگے بڑھا رہے تھے۔ حصول آزادی کی اس تحریک میں ملک کے ہندو مسلمان دونوں ہی فرقوں کے لیڈران شامل تھے (۵۵)۔ مولانا مظہر الحق نے کہا کہ آپ پورے ملک میں پروپیگنڈہ کریں جس سے ہمارے انگریز حکمراں دیکھیں کہ ہندوستان کا ہر مرد، عورت اور بچہ آزادی حاصل کرنے پر آمادہ ہے (۵۶)۔

مسلمانوں میں جمعیۃ العلمائے ہند نام کی تنظیم کا قیام ہوا لیکن اس کے کاموں کا سرکار پر کوئی اثر نہیں پڑا (۵۷)۔ اس طرح مسلم لیگ کانگریس جمعیۃ العلماء اور خلافت کمیٹی میں نزدیکی بڑھی (۵۸) اور تحریک آزادی میں تیزی آئی۔ ان حالات کے پیش نظر ملک کے سکریٹری مسٹر مانٹیگیو نے ۲۰ راگست ۱۹۱۷ کو یہ اعلان کیا کہ برٹش سرکار کی پالیسی انگلینڈ کے تحت ہی بھارت کو دھیرے دھیرے خود مختاری دینے کی ہے۔ ۱۹۱۸ء میں ماؤنٹ فورڈ رپورٹ (۵۹) شائع ہوئی، جس میں کانگریس اور لیگ کے لکھنؤ سمجھوتے کی الگ انتخاب کی دفعہ کو تو منظور کر لیا گیا لیکن خود مختاری کا اس میں کوئی ذکر نہ تھا۔ کانگریس میں شدت پسندوں نے اس بات کی سخت مخالفت کی لیکن لیگ نے اس کو صحیح مانتے ہوئے انگریزوں کے ذریعہ ہندوستان کو دیر سے خود مختاری دینے کی پالیسی کی حمایت کی (۶۰)۔

یہ کانگریس کے ساتھ ہوئے لکھنؤ سمجھوتے کے بالکل خلاف بات تھی لیکن اتنے پر بھی ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں کانگریس کے موجودہ صدر پنڈت موتی لال نہرو نے کہا کہ جب ایک طبقے پر اتنی بھاری پریشانی ہے تو دوسرا طبقہ منہ اٹھائے دیکھتا نہیں رہ سکتا (۶۱)۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں نے مسلمانوں کی امیدوں کے خلاف کام کیا تھا یعنی ہندوستانی مسلمانوں کی خواہشات کا احترام نہ کرتے ہوئے ترکی کی مخالفت کی تھی جس کی وجہ کر مسلمانوں میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ جنگ ختم ہونے پر ہندوستانی مسلم لیڈران نے

ترکی کے ساتھ کی گئی بے انصافی کے خلاف انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ میسوپوٹامیا، سیریا، فلسطین وغیرہ ممالک حسب سابق ترکی کے زیر اثر ہی رہنے دیے جائیں۔ اس وقت ہندو حصول خودمختاری کے لیے پرجوش تھے اور مسلمان ترکی کے سلطان جوان کے خلیفہ بھی تھے، کے ساتھ کیے گئے برتاؤ سے بے چین تھے۔ ایسی حالت میں دونوں فرقوں کے رہنماؤں نے خلافت آندولن چلانے کا فیصلہ کیا۔ اُبھرتی عوامی طاقت اور بڑھتے فرقہ وارانہ اتحاد کو دیکھتے ہوئے سرکار بھی چوکنا تھی۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہونے پر انگریزوں کے لیے فوجی افراد مہیا کرانے والے صوبے پنجاب میں عوام کے ذریعہ سیاسی سہولتیں مانگے جانے پر سرکار نے ''رولٹ ایکٹ'' جاری کر دیا۔ گاندھی جی نے عوام کے جوش وخروش کو دیکھتے ہوئے تحریک عدم تعاون کا اعلان کر دیا(۶۲)۔ تحریک کے پروگرام کے مطابق ۶؍اپریل کو ملک گیر مظاہرے، ہڑتال اور جلسے کیے گئے(۶۳)۔ سرکار نے اس طرح کے واقعات کو دبانے کے لیے طاقت کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس سلسلے کی کڑی کی شکل میں امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں قتل عام کا ہولناک واقعہ پیش آیا، جس سے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور بے چینی پھیل گئی۔ جمعیۃ العلماء نے نو سو چھپیس علماء کے دستخط سے ایک فتویٰ جاری کر کے غیر تشدد آمیز عدم تعاون کی تحریک کو منظوری دی اور مسلمانوں کو اس میں تعاون کرنے کو کہا(۶۴)۔

۱۹۲۰ء کے فروری مارچ میں خلافت کا مسئلہ نہایت سنجیدہ شکل اختیار کر گیا۔ ۲۰؍فروری ۱۹۲۰ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے بنگال خلافت کانفرنس میں عہدۂ صدارت سے پہلی مرتبہ مسلمانوں کو انگریزوں سے عدم تعاون کی صلاح دی(۶۵)۔ مارچ میں مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں انگلینڈ جا کر وزیر اعظم سے ملا لیکن وزیر اعظم مسٹر لائیڈ جارج نے ان کی کوئی بھی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا(۶۶)۔ لہٰذا ۱۹؍مارچ ۱۹۲۰ء کو ملک گیر سطح پر یوم غم منایا گیا۔ حکومت کے تئیں مخالفت کا مظاہرہ کرنے کے لیے فاقہ کیا گیا نیز دعائیہ جلسے اور ہڑتالیں کی گئیں(۶۷)۔ مولانا شوکت علی نے ۱۹؍مارچ کو پاس کرنے کے لیے ایک تجویز تیار کی کہ اگر انگلینڈ اور ترکی کے درمیان پہلی جنگ عظیم کے بعد ہونے والے اَمن سمجھوتے کی صلح کی شرطیں ہندوستانی مسلمانوں کے مطابق نہیں ہوئیں تو ہندوستانی مسلمان برٹش حکومت پرستی کو طلاق دے دیں گے(۶۸)۔ گاندھی جی نے

بھی مسلمانوں سے عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہونے کا مطالبہ کیا۔ اس وقت کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء تینوں ایک ساتھ مل کر کام کر رہے تھے لیکن لیگ نے کانگریس سے اپنے تعلقات توڑ لیے تھے(۶۹) پھر بھی تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون دونوں ایک ساتھ چل رہے تھے۔ ''چوری چورا'' کے واقعات اور دیگر پُرتشدد واردات کی وجہ کر گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک پر روک لگا دی اس کے بعد ہی ۲۴؍جولائی ۱۹۲۳ء کو یورپ میں ''لوزان'' کا امن سمجھوتہ ہوگیا۔ ۲۳؍اگست ۱۹۲۳ء کی ترکی پارلیامنٹ نے اسے منظور کر لیا(۷۰)۔ اس کے بعد ہندوستان میں تحریک خلافت بھی ختم ہوگئی۔

دونوں فرقوں کے تعلقات

ہندوستان میں جب سے مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تھا تبھی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان لگاتار فکری ونظریاتی اختلافات چلے آرہے تھے۔ کسی کسی وقت ان میں قربت ہو جاتی تھی لیکن مکمل نزدیکی کبھی نہ ہو سکی۔

۱۹۲۱ء میں خلافت اور عدم تعاون کی تحریک کے دوران یہ لگنے لگا تھا کہ اب دونوں فرقے پوری طرح اتحاد کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہندوؤں نے خلافت کے سوال پر مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا اور مسلمانوں نے خلافت کمیٹی ۲۷؍اکتوبر ۱۹۱۹ء کی بیٹھک میں بخوشی گئوکشی چھوڑنے کا فیصلہ لے لیا تھا(۷۱)۔ اس بیٹھک میں مولانا عبدالباری نے کہا تھا کہ ایک مولوی کی حیثیت سے میں کہتا ہوں کہ اپنی مرضی سے گئوکشی چھوڑنے میں شریعت کی کوئی مخالفت نہیں ہوتی(۷۲)۔ عوام عدم تعاون کے جوش میں گاندھی جی کی جے کے ساتھ محمد علی اور شوکت علی کی جے کے نعرے بھی لگاتی تھی(۷۳)۔ دلّی کی جامع مسجد کے منبر سے تقریر کرنے کے لیے سوامی شردھانند جیسے کٹر ہندو کو مدعو کیا گیا تھا(۷۴)۔

لیکن خلافت تحریک ختم ہوتے ہی سارا اتحاد بکھر گیا۔ لیگ پہلے ہی کانگریس سے اپنا تعلق توڑ چکی تھی۔ اب کچھ مسلم لیڈر جو نیشنلسٹ تھے اور تحریکوں میں کانگریس کے ساتھ تھے وہ بھی فرقہ پرستی کی طرف لوٹ رہے تھے۔ ۱۹۲۱ء کی ۲۵؍جولائی سے ۷؍جنوری ۱۹۲۲ء تک جنوب میں موپلوں نے ہندوؤں کو نسلی طور پر برباد کرنے کے لیے ناقابل بیان ظلم کیے اور مولانا حسرت موہانی جیسے رہنما نے ان سب کی تائید کی(۷۵)۔ ان فسادات کے بعد

آگے چل کر آزاد ہندوستان کے تیسرے صدر جمہوریہ بنے، کے تعلیمی منصوبے کو بھی مسلم مخالف کہہ کر اس کی نکتہ چینی کی گئی۔ کانگریس کے سینئر لیڈروں کے ذریعہ ان الزامات کی غیر جانبدارانہ جانچ اور فرقہ وارانہ مسائل کو سلجھانے کی تجاویز لیگ کے ذریعہ قبول نہیں کی گئی (۹۰)۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہونے سے بھارت کی سیاسی صورت حال میں تبدیلی آگئی۔ حکومت نے ہندوستانی لیڈران سے مشورہ کیے بغیر ہی ہندوستان کو جنگ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ کانگریس نے اس پر ناراض ہو کر اور مستقبل کی سرکاری پالیسی سے متعلق سرکار کے ذریعہ کوئی وضاحت نہ کیے جانے کی وجہ کر اپنی مجلس وزارت کو ختم کر کے اقتدار سے باہر آجانے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسری طرف لیگ نے جنگ میں انگریزی حکومت کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا اور کانگریس کے اقتدار کو چھوڑنے کے فیصلے کا خیرمقدم کرتے ہوئے ۲۲/دسمبر ۱۹۳۹ء کا دن یوم نجات اور روزِ فرماں برداری کے طور پر منایا۔

اس طرح اس زمانے میں لیگ اور کانگریس واضح طور پر ایک دوسرے کی مخالف تنظیم کی شکل میں اُبھر کر سامنے آگئی تھی لیکن اس کا نقطۂ عروج مطالبۂ پاکستان کی صورت میں ظاہر ہوا۔ کانگریس حکومت کے دوران لیگ کے ذریعہ مسلمانوں پر مظالم کے جو الزام لگائے گئے تھے ان سے کانگریس خود کو بے قصور ثابت کر چکی تھی (۹۱)۔ لیکن مسٹر جناح اور ان کے معاونین اپنی بات کا پروپیگنڈہ کرتے رہے اور کہتے رہے کہ ان کے مظالم سے بچنے کا واحد حل پاکستان کا قیام ہے۔ آگے چل کر ۱۹۴۰ء میں لیگ کے لاہور کانفرنس میں ایک تجویز پاس کر کے دوقومی نظریے پر زور دیتے ہوئے قیامِ پاکستان کی مانگ کی گئی (۹۲)۔ مسٹر جناح کی سربراہی میں لیگ نے اس کے بعد حصول پاکستان کو اپنا واحد مقصد بنا لیا۔ مسٹر جناح کا کہنا تھا کہ زمین پر کوئی بھی طاقت پاکستان بننے سے نہیں روک سکتی (۹۳)۔ اب مسٹر جناح کی نظر میں ہندو مسلم اتحاد صرف ایک خواب تھا۔ انھوں نے لکھنے والوں کی ایک تنظیم قائم کر کے اسے دوقومی نظریے کے پروپیگنڈے پر مبنی ادب پیش کرنے کی ذمہ داری سونپ دی (۹۴)۔ مذکورہ تنظیم کا مقصد جغرافیائی، اقتصادی، تہذیبی، سماجی، مذہبی اور تاریخی بنیادوں پر قیامِ پاکستان کو لازمی قرار دینا اور ہندو مسلم فرقوں کے درمیان ماضی، حال اور مستقبل میں کبھی بھی اتحاد کا ہونا غیر ممکن ثابت کرنا تھا (۹۵)۔ اس طرح ۱۹۴۰ء میں لیگ

نے پاکستان کی مانگ کی اور اب وہ اس سے کم کچھ بھی قبول نہیں کر سکتی تھی۔

تقسیم ہند

جب سے لیگ نے پاکستان کی بات کی تھی تب سے اسے مطمئن کرنے کے لیے یا اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے پاکستان کے متبادل کی صورت میں کئی منصوبے پیش کیے گئے تھے (۹۶)۔ ۱۹۴۲ء کے کرپس تجویز میں بھی ایسا ہی ایک متبادل تھا۔ اس میں بغیر تقسیم ملک کے سب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی تھی اس لیے لیگ نے اس تجویز کو نامنظور کر دیا (۹۷)۔ مسٹر کرپس نے کانگریس اور لیگ کو مطمئن کرنے کے لیے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں سے بات چیت کی لیکن ۱۱/اپریل ۱۹۴۲ء کو آخر کار انھوں نے گفتگو کے ناکافی ہونے کا اعلان کر دیا اور اپنی تجاویز واپس لے لی (۹۸)۔ کانگریس اس وقت محسوس کر رہی تھی کہ کرپس کے آنے کا مقصد ہندوستانیوں کو کچھ دینا نہیں بلکہ دینے کی محض نمائش کرنا تھا۔ چنانچہ اب انگریز یہ کہہ کر کہ وہ بھارت کو اس لیے کچھ نہیں دے سکے کہ بھارت کے سیاستداں ان سے متفق نہیں ہو سکے، اپنی ذمہ داری سے بچنا چاہتے ہیں۔

کانگریس نے ۷-۸/اگست کو بمبئی میں کل ہند کانگریس کمیٹی کی بیٹھک میں ''بھارت چھوڑو تحریک'' کی تجویز پاس کر دی، جس کے ردِّعمل میں ۹/اگست سے حکومت کے ظلم کی چکّی چلنا شروع ہو گئی۔ تمام بڑے لیڈران گرفتار کر لیے گئے۔ عوام گاندھی جی کے ساتھ تحریک میں شریک تھی لیکن مسٹر جناح اس تحریک کو خطرناک بتاتے ہوئے مسلمانوں کو اس میں شریک نہ ہونے کا مشورہ دے رہے تھے (۹۹)۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد لارڈ ویول ہندوستان کے نئے وائسرائے ہو کر آئے۔ سیاسی تعطل دور کرنے کے لیے انھوں نے ۲۵/جون ۱۹۴۵ء کو شملہ میں ملک کے سرکردہ رہنماؤں کی ایک کانفرنس بلائی (۱۰۰)۔ یہاں مرکز میں ایک نمائندہ حکومت بنانے کی تجویز پاس کی گئی جس میں پانچ ہندو، پانچ مسلم، ایک سکھ، ایک اچھوت اور ایک پارسی کو رکھنے کی سفارش کی گئی تھی۔ یہ پانچ مسلمان کون ہوں، لیگ اور کانگریس اس پر متفق نہیں ہو سکے۔ لیگ کا کہنا تھا کہ یہ پانچوں مسلمان لیگ کے نمائندے ہوں گے جب کہ کانگریس کا کہنا تھا کہ چار مسلمان کو لیگ نامزد کرے گی اور ایک مسلمان کو کانگریس۔ اس پر اتفاق نہ

کی اندرونی مشکلات کا فائدہ اٹھا کر اٹلی نے ۱۹۱۱ء میں ترکی کی ایک ریاست ''تریپولی'' پر قبضہ کر لیا اور انگلینڈ نے اٹلی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا جب کہ اٹلی انگلستان کے دشمنوں کی صف میں مانا جاتا تھا اور انگلستان کا شمار ترکی کے دوستوں میں ہوتا تھا — تو ہندوستانی مسلمانوں میں بے چینی پھیل گئی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیڈران نے ترکی کے قوم پرست رہنماؤں سے رابطہ قائم کیا۔ اس رابطے سے مسلمانوں پر یہ انکشاف ہوا کہ انگلینڈ کی پالیسی ترکی کو کمزور کرنے کی ہے اور جان بوجھ کر اسلامی طاقت کی مخالفت کرنا ہی انگریزوں کی بنیادی پالیسی ہے(۴۲)۔ یہ معلوم ہو جانے پر انگریزوں کی وسیع النظری پر سے مسلمانوں کا اعتماد ختم ہو گیا۔

(۴) ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم کرتے وقت وائسرائے لارڈ کرزن نے مسلمانوں کو ایک الگ مسلم اکثریت والی ریاست کا سنہرا خواب دکھا کر انھیں بٹوارے کی حمایت کرنے کے لیے راضی کیا تھا(۴۴)۔ لیکن ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کو اچانک ختم کر دیا گیا تھا اس سے برٹش سرکار کے حمایتی مسلمان انگریزوں سے ناخوش ہو گئے اور ان کا اعتماد انگریزوں پر سے اٹھنے لگا۔

(۵) اس وقت دنیا کے مسلم ممالک میں مثلاً ترکی، مصر، سوڈان، ایران، سیریا، جارڈن، فلسطین وغیرہ ملکوں میں دھیرے دھیرے جذبۂ قومیت کا آغاز ہو رہا تھا جس کا اثر ہندوستانی مسلمانوں پر پڑنا فطری بات تھی۔

(۶) مسلمانوں میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ جیسے قوم پرست رہنما مسلمانوں کو مذہبی تنگ نظری اور علیحدگی پسندی کی جگہ پر جذبۂ قومیت کے احساس کے ساتھ ایک ہو کر چلنے کا راستہ دکھا رہے تھے۔ لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں میں برٹش حکمراں پرستی کی جگہ پر حکومت مخالف اور قوم پرستانہ جذبات مضبوط و مستحکم ہو رہے تھے(۴۶)۔

(۷) مسلم اخباروں جیسے کلکتہ سے شائع ہونے والے ''الہلال''، دلّی کے ''ہمدرد'' اور ''کامریڈ''، لاہور کے ''زمیندار'' وغیرہ نے انگریز مخالف جذبات کو پھیلانے میں اہم رول ادا کیا۔ ترکی سے شائع ہونے والا اخبار ''جہانِ اسلام'' نے بھی ترکی کی

حمایت اور انگریزوں کی مخالفت میں عوامی جذبات کو اُکسانے میں کافی مدد دی(۴۷)۔

کانگریس اور مسلم لیگ

انگریزوں کی پالیسیوں کا حقیقی چہرہ سامنے آجانے سے مسلم لیگ اب کانگریس کے نزدیک آتی جا رہی تھی۔ دوسری طرف ہندوستانی لیڈران قومی جذبے کو پھیلانے میں لگاتار مشغول تھے اور لیگ کو کانگریس کی مخالفت چھوڑ کر تحریک آزادی میں کانگریس کی مدد کرنے پر زور دے رہے تھے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۱۳ء میں سرابراہیم رحمت اللہ کی صدارت میں منعقد لیگ کے اجلاس میں لیگ نے اپنے آئین میں ترمیم کی، نیز اپنے مقاصد میں تبدیلی کا اعلان کیا۔ اب لیگ کا مقصد برٹش سامراج کے تحت موجودہ طرز حکمرانی میں سدھار اور ملک کے دیگر فرقوں کے تعاون سے اپنی حکومت قائم کرنا ہو گیا تھا(۴۸)۔

کانگریس نے ستمبر ۱۹۱۳ء میں اپنے کراچی اجلاس میں لیگ کے ان مقاصد کا استقبال کیا۔ ۱۹۱۵ء میں لیگ اور کانگریس دونوں کے اجلاس ایک ہی وقت میں بمبئی میں ہوئے۔ یہاں آپسی تعاون کے لیے ملک کے آئندہ طرز حکومت میں سدھار وغیرہ کے لیے منصوبے بنانے کا پروگرام طے کیا گیا(۴۹)۔

۱۹۱۶ء میں کانگریس اور لیگ دونوں کے اجلاس ایک ہی ساتھ لکھنؤ میں ہوئے۔ مسز اینی بیسنٹ کی کوششوں سے اعتدال پسند اور شدت پسند طبقے کے درمیان سمجھوتہ ہو جانے سے وہ لوگ بھی جو سورت اجلاس میں پرانے والے پھوٹ کی وجہ کر کانگریس سے الگ ہو گئے تھے، کانگریس میں پھر سے لوٹ آئے(۵۰)۔ یہاں سے لیگ اور کانگریس دونوں کے لیڈران نے ملکی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے ایک آپسی سمجھوتہ کیا، جس میں دونوں تنظیموں نے ایک دوسرے کے وجود و اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ملک میں آئینی اصلاحات کے لیے مل کر کام کرنے کی بات قبول کی(۵۱)۔

یہاں ہوئے سمجھوتے کے مطابق کانگریس نے لیگ کی الگ انتخاب اور فرقہ وارانہ نمائندگی کی مانگ قبول کر لی(۵۲)۔ اور قومی حکومت کی جہت میں کوشش کرنے اور بھارت کو انگریزوں کے زیرِ نگیں حکومت کی شکل میں رہنے کی مخالفت کرنے کا تہیہ کیا(۵۳)۔

تحریک خلافت

لکھنؤ سمجھوتے سے ملک میں فرقہ وارانہ اتحاد و اتفاق کا ماحول پیدا ہوا تھا، اگرچہ کچھ فرقہ پرست مسلمان اس کی مخالفت کر رہے تھے(۵۴)۔ اس کے باوجود سارے ملک میں آزادی حاصل کرنے کے جذبے کو اس سمجھوتے سے بڑی تقویت ملی تھی۔ مسٹر بال گنگا دھر تلک اور مسز اینی بیسنٹ نے ''ہوم رول آندولن'' چھیڑ دیا تھا۔ ملک کے عوام بڑے ہی جوش و خروش کے ساتھ اپنی تحریکوں کو تیزی سے آگے بڑھا رہے تھے۔ حصول آزادی کی اس تحریک میں ملک کے ہندو مسلمان دونوں ہی فرقوں کے لیڈران شامل تھے(۵۵)۔ مولانا مظہرالحق نے کہا کہ آپ پورے ملک میں پروپیگنڈہ کریں جس سے ہمارے انگریز حکمراں دیکھیں کہ ہندوستان کا ہر مرد، عورت اور بچہ آزادی حاصل کرنے پر آمادہ ہے(۵۶)۔ مسلمانوں میں جمعیۃ العلمائے ہند نام کی تنظیم کا قیام ہوا لیکن اس کے کاموں کا سرکار پر کوئی اثر نہیں پڑا(۵۷)۔ اس طرح مسلم لیگ کانگریس جمعیۃ العلماء اور خلافت کمیٹی میں نزدیکی بڑھی(۵۸) اور تحریک آزادی میں تیزی آئی۔ ان حالات کے پیش نظر ملک کے سکریٹری مسٹر مانٹیگیو نے ۲۰؍اگست ۱۹۱۷ء کو یہ اعلان کیا کہ برٹش سرکار کی پالیسی انگلینڈ کے تحت ہی بھارت کو دھیرے دھیرے خود مختاری دینے کی ہے۔ ۱۹۱۸ء میں ماؤنٹ فورڈ رپورٹ(۵۹) شائع ہوئی، جس میں کانگریس اور لیگ کے لکھنؤ سمجھوتے کی الگ انتخاب کی دفعہ کو تو منظور کر لیا گیا لیکن خود مختاری کا اس میں کوئی ذکر نہ تھا۔ کانگریس میں شدت پسندوں نے اس بات کی سخت مخالفت کی لیکن لیگ نے اس کو صحیح مانتے ہوئے انگریزوں کے ذریعہ ہندوستان کو دیر سے خود مختاری دینے کی پالیسی کی حمایت کی(۶۰)۔

یہ کانگریس کے ساتھ ہوئے لکھنؤ سمجھوتے کے بالکل خلاف بات تھی لیکن اتنے پر بھی ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں کانگریس کے موجودہ صدر پنڈت موتی لال نہرو نے کہا کہ جب ایک طبقے پر اتنی بھاری پریشانی ہے تو دوسرا طبقہ منہ اٹھائے دیکھتا نہیں رہ سکتا(۶۱)۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں نے مسلمانوں کی امیدوں کے خلاف کام کیا تھا یعنی ہندوستانی مسلمانوں کی خواہشات کا احترام نہ کرتے ہوئے ترکی کی مخالفت کی تھی جس کی وجہ کر مسلمانوں میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ جنگ ختم ہونے پر ہندوستانی مسلم لیڈران نے

ترکی کے ساتھ کی گئی بے انصافی کے خلاف انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ میسوپوٹامیا، سیریا، فلسطین وغیرہ ممالک حسب سابق ترکی کے زیر اثر ہی رہنے دیے جائیں۔ اس وقت ہندو حصول خود مختاری کے لیے پرجوش تھے اور مسلمان ترکی کے سلطان جو ان کے خلیفہ بھی تھے، کے ساتھ کیے گئے برتاؤ سے بے چین تھے۔ ایسی حالت میں دونوں فرقوں کے رہنماؤں نے خلافت آندولن چلانے کا فیصلہ کیا۔ اُبھرتی عوامی طاقت اور بڑھتے فرقہ وارانہ اتحاد کو دیکھتے ہوئے سرکار بھی چوکنا تھی۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہونے پر انگریزوں کے لیے فوجی افراد مہیا کرانے والے صوبے پنجاب میں عوام کے ذریعہ سیاسی سہولتیں مانگے جانے پر سرکار نے ''رولٹ ایکٹ'' جاری کر دیا۔ گاندھی جی نے عوام کے جوش و خروش کو دیکھتے ہوئے تحریک عدم تعاون کا اعلان کر دیا(۶۲)۔ تحریک کے پروگرام کے مطابق ۶؍اپریل کو ملک گیر مظاہرے، ہڑتال اور جلسے کیے گئے(۶۳)۔ سرکار نے اس طرح کے واقعات کو دبانے کے لیے طاقت کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس سلسلے کی کڑی کی شکل میں امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں قتل عام کا ہولناک واقعہ پیش آیا، جس سے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور بے چینی پھیل گئی۔ جمعیۃ العلماء نے نو سو پچیس علماء کے دستخط سے ایک فتویٰ جاری کر کے غیر تشدد آمیز عدم تعاون کی تحریک کو منظوری دی اور مسلمانوں کو اس میں تعاون کرنے کو کہا(۶۴)۔

۱۹۲۰ء کے فروری مارچ میں خلافت کا مسئلہ نہایت سنجیدہ شکل اختیار کر گیا۔ ۲۰؍فروری ۱۹۲۰ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے بنگال خلافت کانفرنس میں عہدۂ صدارت سے پہلی مرتبہ مسلمانوں کو انگریزوں سے عدم تعاون کی صلاح دی(۶۵)۔ مارچ میں مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں انگلینڈ جا کر وزیر اعظم سے ملا لیکن وزیر اعظم مسٹر لائیڈ جارج نے ان کی کوئی بھی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا(۶۶)۔ لہٰذا ۱۹؍مارچ ۱۹۲۰ء کو ملک گیر سطح پر یوم غم منایا گیا۔ حکومت کے تئیں مخالفت کا مظاہرہ کرنے کے لیے فاقہ کیا گیا نیز دعائیہ جلسے اور ہڑتالیں کی گئیں(۶۷)۔ مولانا شوکت علی نے ۱۹؍مارچ کو پاس کرنے کے لیے ایک تجویز تیار کی کہ اگر انگلینڈ اور ترکی کے درمیان پہلی جنگ عظیم کے بعد ہونے والے امن سمجھوتے کی صلح کی شرطیں ہندوستانی مسلمانوں کے مطابق نہیں ہوئیں تو ہندوستانی مسلمان برٹش حکومت پرستی کو طلاق دے دیں گے(۶۸)۔ گاندھی جی نے

بھی مسلمانوں سے عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہونے کا مطالبہ کیا۔ اس وقت کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء تینوں ایک ساتھ مل کر کام کر رہے تھے لیکن لیگ نے کانگریس سے اپنے تعلقات توڑ لیے تھے(۶۹) پھر بھی تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون دونوں ایک ساتھ چل رہے تھے۔ ''چوری چورا'' کے واقعات اور دیگر پُرتشدد واردات کی وجہ کر گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک پر روک لگا دی اس کے بعد ہی ۲۴؍ جولائی ۱۹۲۳ء کو یورپ میں ''لوزان'' کا امن سمجھوتہ ہو گیا۔ ۲۳؍ اگست ۱۹۲۳ء کی ترکی پارلیامنٹ نے اسے منظور کر لیا(۷۰)۔ اس کے بعد ہندوستان میں تحریک خلافت بھی ختم ہو گئی۔

دونوں فرقوں کے تعلقات

ہندوستان میں جب سے مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تھا تبھی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان لگاتار فکری ونظریاتی اختلافات چلے آرہے تھے۔ کسی کسی وقت ان میں قربت ہو جاتی تھی لیکن مکمل نزدیکی کبھی نہ ہو سکی۔

۱۹۲۱ء میں خلافت اور عدم تعاون کی تحریک کے دوران یہ لگنے لگا تھا کہ اب دونوں فرقے پوری طرح اتحاد کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہندوؤں نے خلافت کے سوال پر مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا اور مسلمانوں نے خلافت کمیٹی ۲۷؍ اکتوبر ۱۹۱۹ء کی بیٹھک میں بخوشی گؤکشی چھوڑنے کا فیصلہ لے لیا تھا(۷۱)۔ اس بیٹھک میں مولانا عبدالباری نے کہا تھا کہ ایک مولوی کی حیثیت سے میں کہتا ہوں کہ اپنی مرضی سے گؤکشی چھوڑنے میں شریعت کی کوئی مخالفت نہیں ہوتی (۷۲)۔ عوام عدم تعاون کے جوش میں گاندھی جی کی جے کے ساتھ محمد علی اور شوکت علی کی جے کے نعرے بھی لگاتی تھی (۷۳)۔ دلّی کی جامع مسجد کے منبر سے تقریر کرنے کے لیے سوامی شردھانند جیسے کٹر ہندو کو مدعو کیا گیا تھا(۷۴)۔

لیکن خلافت تحریک ختم ہوتے ہی سارا اتحاد بکھر گیا۔ لیگ پہلے ہی کانگریس سے اپنا تعلق توڑ چکی تھی۔ اب کچھ مسلم لیڈر جو نیشنلسٹ تھے اور تحریکوں میں کانگریس کے ساتھ تھے وہ بھی فرقہ پرستی کی طرف لوٹ رہے تھے۔ ۱۹۲۱ء کی ۲۵؍ جولائی سے ۷؍ جنوری ۱۹۲۲ء تک جنوب میں موپلوں نے ہندوؤں کو نسلی طور پر برباد کرنے کے لیے ناقابل بیان ظلم کیے اور مولانا حسرت موہانی جیسے رہنما نے ان سب کی تائید کی (۷۵)۔ ان فسادات کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی باڑھ آگئی اور ۱۹۲۷ء تک کہیں نہ کہیں دنگے ہوتے رہے(۷۶)۔ ماحول اتنا زہرآلود ہو گیا تھا کہ مولانا محمد علی نے گاندھی جی کو مذہبی معاملات میں اپنے سے نچلے درجے کا کہنا شروع کر دیا(۷۷)۔ بنگال مسلم کانفرنس کے صدر اے۔ کے۔ فضل الحق اور ۱۹۲۵ء میں لیگ کے صدر سر عبدالرحیم نے مسلمانوں سے ہندوؤں کے خلاف تیار رہنے کی اپیل کی (۷۸)۔ اسی درمیان ایک مسلمان نے مذہبی جنون میں آکر سوامی شردھانند کا قتل کر دیا(۷۹)۔

ملکی سطح کے قوم پرست رہنما جیسے مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں، مہاتما گاندھی وغیرہ اب بھی سمجھداری سے کام لے رہے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایکتا سمیلن بلائے جا رہے تھے۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی دھارا سبھاؤں میں ایک ہو کر کام کر رہے تھے۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے مدراس اجلاس میں ڈاکٹر ایم۔ اے۔ انصاری کی صدارت میں مکمل خودمختاری کے حصول کا اعلان کیا گیا اور برٹش حکومت کے ذریعہ متعین سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ لیا گیا۔ اس اجلاس میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کو دیگر تنظیموں سے مشورہ کر کے ملک کی آزادی کا مسودہ تیار کرنے کا اختیار دیا گیا۔ یہ مسودہ آگے چل کر نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوا(۸۰)۔ لیگ کے لیڈر مسٹر جناح نے مکمل خودمختاری کے مطالبے کا ساتھ دینے سے بھی انکار کر دیا۔ وہ مسلمانوں کے لیے ایک الگ خودمختار حکومت حاصل کرنا چاہتے تھے(۸۱)۔ اس طرح ملک میں سیاسی، سماجی اور مذہبی سطح پر ہندو مسلم تعلقات جو بہت اچھے بن گئے تھے، اب لگاتار بگڑتے چلے جا رہے تھے۔

مطالبۂ پاکستان اور کانگریس۔ لیگ تعلقات

۱۹۲۸ء میں نہرو کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی۔ مسٹر جناح نے اس میں اپنی جانب سے ۱۴ ترمیمات پیش کیے جو سبھی نامنظور ہو گئے(۸۲)۔ اس وقت مسٹر جناح نے بددل ہو کر پوری طرح کانگریس کا ساتھ چھوڑنا طے کر لیا اور رنجیدہ خاطر ہو کر انگلینڈ چلے گئے۔ کانگریس کو پوری طرح چھوڑنے کا اشارہ انھوں نے اپنے ایک پارسی دوست جمشید نوشیرواں کو یہ کہہ کر دیا کہ ''جمشید، یہ راستوں کا الگ ہونا ہے''(۸۳)۔

لیگ اور کانگریس کے الگاؤ کے بعد برٹش سرکار نے گول میز کانفرنسوں کے ذریعہ

ہندوستان کے مسائل کا حل نکالنا چاہا۔ پہلی گول میز کانفرنس ۱۲ر نومبر ۱۹۳۰ء سے ۱۹ر جنوری ۱۹۳۱ء تک چلی۔ مسٹر جناح اس میں برٹش بھارت کے نمائندے کی شکل میں شامل ہوئے اور انھوں نے بھارت کے لیے مسلم مفادات کو تحفظ فراہم کرنے والا آئین بنانے پر زور دیا۔ کانگریس نے اس کانفرنس میں حصہ نہیں لیا تھا۔ دوسری گول میز کانفرنس ۷ر ستمبر ۱۹۳۱ء سے یکم دسمبر ۱۹۳۱ء تک چلی۔ کانگریس کی طرف سے گاندھی جی نے اس میں شرکت کی۔ مسٹر جناح، لیگ کے نمائندہ محمد شفیع، مسٹر آغا خاں وغیرہ نے یہاں مہاتما گاندھی کی حتی الامکان مخالفت کی۔ انگریزی حکومت نے اس کانفرنس میں اپنے اثرات کا پورا استعمال کیا اور اس کی کوششوں سے یہاں مسلمانوں، دیگر اقلیتی طبقوں، ہندوستانی عیسائیوں وغیرہ کی جانب سے ایک تجویز رکھ کر کاؤنسل (کیندریہ دھارا سبھا) میں مسلمانوں کو کل سیٹوں میں ۱/۳ سیٹ دینے کی مانگ کی گئی (۸۵)۔ گاندھی جی نے اس تجویز کی مخالفت کی لیکن وہ اکیلے پڑ گئے اور انگریزوں نے ۴ر اگست ۱۹۳۲ء کو یہ فیصلہ لے کر اسے فرقہ وارانہ فیصلے کی شکل میں لاگو کر دیا۔

۱۹۳۵ء میں بھارت سرکار ادھی نیم کا اعلان کیا گیا۔ اس کے مطابق ریاستوں کو حکومت میں خود مختاری دینے کا نظم کیا گیا۔ اس دفعہ کے مطابق ہونے والے انتخابات اور بعد میں حکومت کرنے کے دوران لیگ و کانگریس کے تعلقات میں بھاری تبدیلی آئی۔ انتخابی پروپیگنڈہ کے دوران مسٹر جناح نے مارچ ۱۹۳۶ء میں دہلی میں کہا تھا کہ ہمیں اپنے فرقے کی فلاح و بہبود دیکھنا ہے ورنہ ہم ناکامیاب رہیں گے اور اپنا وقار کھو دیں گے (۸۶)۔ کانگریس پر انھوں نے مسلمانوں کو بانٹنے کا الزام لگاتے ہوئے اسے مسلمانوں سے دور رہنے کا انتباہ بھی دیا (۸۷)۔ اس کے برخلاف کانگریس کا مقصد عوام میں قومی جذبہ جگائے رکھنے کا تھا (۸۷)۔ انتخاب میں لیگ کو بہت بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے امید سے کہیں کم ووٹ ملے اور کانگریس کو ملک میں حکومت کرنے کا موقع حاصل ہوا (۸۹)۔ لیگ نے کانگریسی حکومت کو بدنام کرنے کے لیے کانگریس کے ذریعہ مسلمانوں پر ظلم کرنے کا پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا پروپیگنڈہ مذہبی تنگ نظری پر مبنی اور سراسر بے بنیاد تھا۔ ان نام نہاد مظالم کی جانچ کے لیے شریف کمیٹی اور ''پیرپور کمیٹی'' بنائی گئی جنھوں نے کانگریس کے ہر کام کو غلط ثابت کیا۔ قوم پرست مسلمان ڈاکٹر ذاکر حسین جو

آگے چل کر آزاد ہندوستان کے تیسرے صدر جمہوریہ بنے، کے تعلیمی منصوبے کو بھی مسلم مخالف کہہ کر اس کی نکتہ چینی کی گئی۔ کانگریس کے سینئر لیڈروں کے ذریعہ ان الزامات کی غیر جانبدارانہ جانچ اور فرقہ وارانہ مسائل کو سلجھانے کی تجاویز لیگ کے ذریعہ قبول نہیں کی گئی (۹۰)۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہونے سے بھارت کی سیاسی صورت حال میں تبدیلی آگئی۔ حکومت نے ہندوستانی لیڈران سے مشورہ کیے بغیر ہی ہندوستان کو جنگ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ کانگریس نے اس پر ناراض ہو کر اور مستقبل کی سرکاری پالیسی سے متعلق سرکار کے ذریعہ کوئی وضاحت نہ کیے جانے کی وجہ کر اپنی مجلس وزارت کو ختم کر کے اقتدار سے باہر آجانے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسری طرف لیگ نے جنگ میں انگریزی حکومت کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا اور کانگریس کے اقتدار کو چھوڑنے کے فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۹ء کا دن یوم نجات اور روزِ فرماں برداری کے طور پر منایا۔

اس طرح اس زمانے میں لیگ اور کانگریس واضح طور پر ایک دوسرے کی مخالف تنظیم کی شکل میں اُبھر کر سامنے آگئی تھی لیکن اس کا نقطۂ عروج مطالبۂ پاکستان کی صورت میں ظاہر ہوا۔ کانگریس حکومت کے دوران لیگ کے ذریعہ مسلمانوں پر مظالم کے جو الزام لگائے گئے تھے ان سے کانگریس خود کو بے قصور ثابت کر چکی تھی (۹۱)۔ لیکن مسٹر جناح اور ان کے معاونین اپنی بات کا پروپیگنڈہ کرتے رہے اور کہتے رہے کہ ان کے مظالم سے بچنے کا واحد حل پاکستان کا قیام ہے۔ آگے چل کر ۱۹۴۰ء میں لیگ کے لاہور کانفرنس میں ایک تجویز پاس کر کے دو قومی نظریے پر زور دیتے ہوئے قیامِ پاکستان کی مانگ کی گئی (۹۲)۔ مسٹر جناح کی سربراہی میں لیگ نے اس کے بعد حصول پاکستان کو اپنا واحد مقصد بنا لیا۔ مسٹر جناح کا کہنا تھا کہ زمین پر کوئی بھی طاقت پاکستان بننے سے نہیں روک سکتی (۹۳)۔ اب مسٹر جناح کی نظر میں ہندو مسلم اتحاد صرف ایک خواب تھا۔ انھوں نے لکھنے والوں کی ایک تنظیم قائم کر کے اسے دو قومی نظریے کے پروپیگنڈے پر مبنی ادب پیش کرنے کی ذمہ داری سونپ دی (۹۴)۔ مذکورہ تنظیم کا مقصد جغرافیائی، اقتصادی، تہذیبی، سماجی، مذہبی اور تاریخی بنیادوں پر قیامِ پاکستان کو لازمی قرار دینا اور ہندو مسلم فرقوں کے درمیان ماضی، حال اور مستقبل میں کبھی بھی اتحاد کا ہونا غیر ممکن ثابت کرنا تھا (۹۵)۔ اس طرح ۱۹۴۰ء میں لیگ

نے پاکستان کی مانگ کی اور اب وہ اس سے کم کچھ بھی قبول نہیں کرسکتی تھی۔

تقسیم ہند

جب سے لیگ نے پاکستان کی بات کی تھی تب سے اسے مطمئن کرنے کے لیے یا اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے پاکستان کے متبادل کی صورت میں کئی منصوبے پیش کیے گئے تھے(٩٦)۔ ١٩٤٢ء کے کرپس تجویز میں بھی ایسا ہی ایک متبادل تھا۔ اس میں بغیر تقسیم ملک کے سب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی تھی اس لیے لیگ نے اس تجویز کو نامنظور کر دیا(٩٧)۔ مسٹر کرپس نے کانگریس اور لیگ کو مطمئن کرنے کے لیے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں سے بات چیت کی لیکن ١١/اپریل ١٩٤٢ء کو آخرکار انھوں نے گفتگو کے ناکافی ہونے کا اعلان کر دیا اور اپنی تجاویز واپس لے لی(٩٨)۔ کانگریس اس وقت محسوس کر رہی تھی کہ کرپس کے آنے کا مقصد ہندوستانیوں کو کچھ دینا نہیں بلکہ دینے کی محض نمائش کرنا تھا۔ چنانچہ اب انگریز یہ کہہ کر کہ وہ بھارت کو اس لیے کچھ نہیں دے سکے کہ بھارت کے سیاستداں ان سے متفق نہیں ہو سکے، اپنی ذمہ داری سے بچنا چاہتے ہیں۔

کانگریس نے ٧-٨/ اگست کو بمبئی میں کل ہند کانگریس کمیٹی کی بیٹھک میں ''بھارت چھوڑو تحریک'' کی تجویز پاس کر دی، جس کے ردّعمل میں ٩/ اگست سے حکومت کے ظلم کی چکّی چلنا شروع ہوگئی۔ تمام بڑے لیڈران گرفتار کر لیے گئے۔ عوام گاندھی جی کے ساتھ تحریک میں شریک تھی لیکن مسٹر جناح اس تحریک کو خطرناک بتاتے ہوئے مسلمانوں کو اس میں شریک نہ ہونے کا مشورہ دے رہے تھے(٩٩)۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد لارڈ ویول ہندوستان کے نئے وائسرائے ہو کر آئے۔ سیاسی تعطّل دور کرنے کے لیے انھوں نے ٢٥/ جون ١٩٤٥ء کو شملہ میں ملک کے سرکردہ رہنماؤں کی ایک کانفرنس بلائی(١٠٠)۔ یہاں مرکز میں ایک نمائندہ حکومت بنانے کی تجویز پاس کی گئی جس میں پانچ ہندو، پانچ مسلم، ایک سکھ، ایک اچھوت اور ایک پارسی کو رکھنے کی سفارش کی گئی تھی۔ یہ پانچ مسلمان کون ہوں، لیگ اور کانگریس اس پر متفق نہیں ہوسکے۔ لیگ کا کہنا تھا کہ یہ پانچوں مسلمان لیگ کے نمائندے ہوں گے جب کہ کانگریس کا کہنا تھا کہ چار مسلمان کو لیگ نامزد کرے گی اور ایک مسلمان کو کانگریس۔ اس پر اتفاق نہ

ہونے سے کانفرنس ناکام ہوگئی۔ ستمبر ١٩٤٥ء میں وائسرائے لارڈ ویول نے بھارت میں عام انتخاب کرانے کا اعلان کر دیا۔ انتخاب سندھ، پنجاب اور بنگال کو چھوڑ کر دیگر بھی ریاستوں میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہوئی۔

٤/ ستمبر ١٩٤٥ء کو ہندوستان کے سکریٹری لارڈ پیتھک لارنس نے برٹش پارلیمانی ارکان کے وفد کو بھارت بھیجنے کا اعلان کیا، جس کا مقصد ہندوستانی آئین بنانے کے لیے یہاں کے حالات کا جائزہ لینا تھا(١٠١)۔ مارچ ١٩٤٩ء میں یہ نمائندہ وفد ہندوستان آیا۔ اس سے قبل جو بھی کمیشن ہندوستان آتا تھا اسے صرف بات چیت کرنے کے حقوق دیے جاتے تھے لیکن کیبنٹ مشن کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ خود بھی کسی بات کا فیصلہ کرسکتا ہے(١٠٢)۔ اس مشن نے جو تجاویز پیش کیے اس کے دفعات کچھ اس طرح تھے:

(١) بھارت ایک وفاقی حکومت ہوگا۔ اس میں خارجی تعلقات، کرنسی، حفاظتی نظام، نشریات اور بنیادی حقوق نیز ان پر عمل در آمد کرنے کا اختیار مرکزی سرکار کے پاس ہوگا۔

(٢) بقیہ حقوق ریاستوں کے پاس رہیں گے۔

(٣) ریاستوں کے گروپ بنائے جائیں گے۔ یہ گروپ چاہیں گے تو ریاستی معاملوں کو مل جل کر حل کرسکیں گے۔

(٤) وفاقی اسمبلی میں مسلم اور ہندو اکثریت والے صوبوں سے برابر برابر نمائندے آئیں گے۔ چاہے ان صوبوں نے اپنے آپ کو صوبوں کے بننے والے کسی گروپ میں شامل کیا ہو یا نہیں۔

(٥) وفاقی سرکار میں بھی دونوں کا یہی تناسب رہے گا(١٠٣)۔

حکومت کے باقی معاملات میں ریاستوں کو 'اے'، 'بی'، 'سی' تین گروپ میں بانٹنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس کے مطابق 'اے' گروپ میں ہندو اکثریت، 'بی' گروپ میں مسلم اکثریت اور 'سی' گروپ میں کم مسلم اکثرت والے صوبے رکھے جانے تھے۔ اس طریقۂ کار سے مسلمانوں کو گھریلو معاملوں میں ہندو اکثریتی قبضے سے بچانے کی کوشش کی گئی تھی۔

مذکورہ تجویز کو لیگ اور کانگریس دونوں نے قبول کر لیا اور ایسا لگا کہ فرقہ واریت کے زہریلے ماحول سے چھٹکارا مل جائے گا۔ لیکن جواہرلال نہرو کے ذریعہ ایک پریس

کانفرنس میں یہ کہے جانے پر کہ کانگریس مشن تجویز میں جیسی مناسب سمجھے ویسی تبدیلی لانے اور ترمیم کرنے کے لیے خود کو آزاد سمجھتی ہے۔ مسٹر جناح نے لیگ کی ایک بیٹھک بلا کر کیبنٹ مشن تجاویز نامنظور کر دیا اور حصول پاکستان کے لیے سیدھی کارروائی کی تجویز پاس کر دی (۱۰۴)۔

۱۳/ اگست ۱۹۴۶ء کو وائسرائے نے لیگ اور کانگریس دونوں کو سرکار بنانے کی دعوت دی۔ لیگ نے اسے نامنظور کر دیا۔ لیگ سیدھی کارروائی کے لیے ۱۶/ اگست کا دن طے کر چکی تھی۔ بنگال میں لیگی سرکار کے وزیراعظم حسن شہید سہروردی نے اس دن عوامی چھٹی کا اعلان کر دیا۔ فوج اور پولس کو تیار رہنے لیکن کوئی کام نہ کرنے کے حکم دیے۔ ۱۶/ اگست کو عام چھٹی کرنے کے بارے میں بنگال اسمبلی کے ہندو اراکین کی مخالفت کو انھوں نے نامنظور کر دیا (۱۰۵)۔ ۱۶/ اگست کی صبح کو جواہر لال نہرو نے لیگ کی ''سیدھی کارروائی'' کو چھوڑنے اور سرکار میں شامل ہونے کے بارے میں مسٹر جناح کو سمجھایا لیکن وہ انھیں راضی نہیں کر سکے (۱۰۶)۔ ۱۶/ اگست کو کلکتہ میں بھیانک فساد، لوٹ، قتل ہوا اور اسی دن دوپہر کو مسٹر سہروردی نے کلکتہ میدان کے عوامی جلسے میں لوگوں کو ان کے حوصلے اور پاکستان پانے کی کوششوں کے لیے انھیں مبارکباد دی اور ان کا شکریہ ادا کیا (۱۰۷)۔

۱۷/ اگست کو کانگریس نے اکیلے ہی مرکز میں سرکار بنانے کا فیصلہ کیا۔ ۲/ ستمبر کو سرکار بن گئی۔ لارڈ ویول کی کوششوں سے ۱۸/ اکتوبر کو لیگ بھی اس میں شامل ہو گئی۔ لیگ سرکار پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ ویول نے کانگریس اور لیگ کے اختلافات دور کرنے کے لیے لندن میں دونوں فریقوں کی بات چیت کا موقع فراہم کیا لیکن اختلافات مزید بڑھتے چلے گئے (۱۰۸)۔ اب تک انگلینڈ میں لیبر پارٹی کی حکومت اقتدار میں آ گئی تھی۔ اس کے وزیراعظم لارڈ اٹلی ہندوستان چھوڑ دینے کی حمایت میں تھے لیکن لارڈ ویول کا کہنا تھا کہ بھارت سے انگریزی حکومت اور فوج سلسلہ وار ہٹائے جانے چاہئیں (۱۰۹)۔ ۲۰/ جنوری ۱۹۴۷ء کو مسٹر اٹلی نے اعلان کیا کہ جون ۱۹۴۸ء سے پہلے ہی ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں ویول کی جگہ پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا نیا وائسرائے مقرر کر دیا گیا۔ انھوں نے ملک کے سرکردہ رہنماؤں سے بات کی اور انھیں بتایا کہ وہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کو سونپنے آئے ہیں (۱۱۰)۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان

کے لیڈروں کے ساتھ ہندوستان کے مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ کئی مرتبہ کی گفتگو اور تبادلۂ خیال کے بعد ملک کی تقسیم کا فیصلہ لیا گیا۔ ۱۴-۱۵/ جون ۱۹۴۷ء کو کل ہند کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ میں برٹش سرکار کے آئندہ اگست تک سارے حقوق پوری طرح ہندوستانیوں کو سونپنے کے فیصلے کا استقبال کیا گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن جون ۱۹۴۸ء سے پہلے ہی اقتدار کی تبدیلی چاہتے تھے (۱۱۱)۔ ماؤنٹ بیٹن کے کمشنر برائے اصلاح مسٹر بی. پی. مینن کی ۱۱/ مئی ۱۹۴۷ء کی ایک تجویز کی بنیاد پر (۱۱۲) ۱۶/ جولائی ۱۹۴۷ء کو انگلینڈ کے پارلیامنٹ میں ایک بل پاس کر کے ہندوستان کے بٹوارے کا سرکاری فیصلہ کر لیا گیا اور وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو بٹوارہ کرنا طے کر دیا (۱۱۳)۔

*****

(۲)

ابتدائی زندگی

(۱۸۸۸ء تا ۱۹۱۲ء)

مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش ماہ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ میں شہر مکہ میں ہوئی تھی (۱)۔ انگریزی تاریخ کے مطابق یہ زمانہ ۹/اگست ۱۸۸۸ء سے ۶/ستمبر ۱۸۸۸ء کے درمیان کا ہوتا ہے۔ (لہٰذا اسی دوران مولانا آزاد کی پیدائش ہوئی تھی) (۲)۔ ان کے والد کا نام مولانا شیخ خیرالدین تھا۔ شیخ خیرالدین مکہ میں اپنے نانا منور الدین کے گھر رہتے تھے (۳)۔ پیدائش کے وقت مولانا آزاد کا نام محی الدین احمد رکھا گیا تھا۔ مولانا کے والد پیار سے انھیں ان کے تاریخی نام فیروز بخت سے پکارتے تھے (۴)۔ مولانا آزاد کا بچپن مکہ کے ایک مشہور مقام باب السلام کے پاس محلہ کدوا (قدوا) میں گزرا۔ ۱۸۹۰ء میں جب مولانا آزاد کی عمر دو سال ہوئی اس وقت ان کے والد اپنا خاندان مکہ سے کلکتہ لے آئے اور سارا خاندان کلکتہ میں ہی بس گیا (۶)۔

تعلیم و تربیت

مولانا آزاد کے خاندان کا ماحول پوری طرح مذہبی تھا۔ اسی مذہبی ماحول میں ان کی تعلیم شروع ہوئی۔ تعلیم کی ابتدائی رسم پانچ سال کی عمر میں شیخ عبداللہ میر داد سے ادا کرائی گئی۔ بچپن میں انھوں نے فارسی کا علم والد کے قدموں میں، عربی کا علم ماں کی گود میں اور اردو کا علم اپنی بہنوں کے زیر سایہ حاصل کیا تھا (۷)۔ بعد میں مختلف مضامین کی تعلیم کے لیے مختلف اساتذہ مقرر کیے گئے۔ ان میں قاری شیخ حسین، مولوی محمد یعقوب دہلوی، نظیرالحسن انبیٹھوی، مولوی محمد ابراہیم، مولوی محمد عمر اور مولانا سعادت حسین کے نام قابل ذکر

ہیں (۸)۔ مولانا آزاد بچپن سے ہی تعلیم میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اسی دلچسپی کی وجہ کر وہ صبح منہ اندھیرے اُٹھتے اور شمع جلا کر اپنا سبق یاد کرتے تھے نیز ہر رات بہنوں سے منتیں کرتے تھے کہ صبح آنکھ کھلے تو مجھے جگا دینا (۹)۔ وہ اتنے ذہین و تیز طبع تھے کہ بارہ برس کی چھوٹی عمر میں ۱۹۰۰ء میں ہی فارسی کی تعلیم پوری کر چکے تھے اور عربی کا ابتدائی نصاب مکمل کر لیا تھا (۱۰)۔ وہ ترکی زبان بھی پڑھنا چاہتے تھے لہٰذا ایک اجنبی ترک کو اپنے ساتھ رکھ کر انھوں نے ترکی زبان کی جانکاری بھی حاصل کی تھی (۱۱)۔ کچھ دنوں تک انھوں نے اپنی خالہ سے بھی پڑھا تھا۔ اپنے والد کے ایک بزرگ دوست سے انھوں نے اسلامی آرٹ، مذہب اور فلسفے کا علم حاصل کیا تھا (۱۳)۔ مولانا آزاد کی تعلیم و تربیت زیادہ تر ان کے والد کی سرپرستی میں گھر رہ کر ہی ہوئی تھی۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ ''کم از کم یہ تو ہو سکتا تھا کہ قدیم تعلیم کے مدرسوں میں سے کسی مدرسے سے واسطہ پڑتا۔ مدرسے کی تعلیمی زندگی بہرحال گھر کی چار دیواری کے گوشۂ تنگ سے زیادہ وسعت رکھتی ہے اور اس لیے طبیعت کو کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع مل جاتا ہے، لیکن والد مرحوم یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ کلکتہ کے سرکاری مدرسے یعنی مدرسہ عالیہ کی تعلیم ان کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی اور فی الحقیقت قابل وقعت تھی بھی نہیں۔ اور کلکتہ سے باہر بھیجنا انھیں گوارہ نہ تھا۔ انھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ خود تعلیم دیں یا بعض خاص اساتذہ کے قیام کا انتظام کر کے ان سے تعلیم دلائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں تک تعلیمی زمانے کا تعلق ہے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نکالنے کا موقع ہی نہیں'' (۱۳)۔ مولانا کی تعلیم پندرہ برس تک پوری ہو چکی تھی۔ یہ ساری تعلیم ان کے خاندن میں استاد شاگرد کے رواج کے مطابق شاہ ولی اللہ کے طریقے سے ہوئی تھی۔ اس کے مطابق انھوں نے اس وقت پڑھائی جانے والی نصابی کتابیں ازبر کر لی تھیں اور اسلامی عدلیہ کی کتابوں کا علم حاصل کر لیا تھا (۱۴)۔ مولانا آزاد کبھی کسی تعلیم گاہ میں پڑھنے نہیں گئے تھے۔ ان کی بہن فاطمہ بیگم کے مطابق مولانا کی تعلیم و تربیت والد کی سرپرستی میں گھر پر ہی ہوئی تھی (۱۵)۔ اپنی تعلیم پوری کر لینے کے وقت تک مولانا آزاد اپنی اہمیت و صلاحیت کے بل پر اپنے سماج میں نہایت عزت و احترام کا مقام حاصل کر چکے تھے۔ ۱۲ برس کی عمر پوری ہونے تک وہ مولوی غلام محی الدین احمد آزاد دہلوی کے نام سے جانے جاتے تھے (۱۶)۔ ۱۹۰۱ء میں پہلی مرتبہ ان کے نام کے ساتھ ابوالکلام لفظ جڑا ہوا ملتا

ہے۔ وہ اب مولوی ابوالکلام احمد کے نام سے مشہور تھے۔ بعد میں انھیں مولوی ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی لکھا جانے لگا (۱۸)۔

مولانا آزاد کے والد سخت مذہبی خیالات کے حامل شخص تھے لہٰذا انگریزی پڑھنے کے خلاف تھے۔ مولانا کی خواہش تھی کہ انگریزی تعلیم بھی حاصل کریں۔ والد کو ناراض نہ کرنے اور اپنے حصول علم کی خواہش میں مطابقت قائم کرنے کے لیے انھوں نے والد سے چھپا کر انگریزی پڑھنا شروع کر دیا۔ انگریزی کی ابتدائی تعلیم انھوں نے محمد یوسف جعفری سے حاصل کی تھی (۱۹)۔ بعد میں انھوں نے اپنے مطالعہ کی بنیاد پر انگریزی کا اتنا علم حاصل کرلیا تھا کہ تاریخ اور فلسفے کی انگریزی کتابیں پڑھنے لگے تھے (۲۰)۔ لیکن زندگی کے آخری دور میں بھی وہ آسانی سے انگریزی بول نہیں پاتے تھے (۲۱)۔ والد کے ایک دوست سید باقر حسین سے انھوں نے طب کی تعلیم پائی تھی (۲۲)۔ والد سے طب، ریاضی اور جیوتش کا علم حاصل کیا تھا۔ اپنے زمانۂ تعلیم میں ہی جب وہ طب پڑھ رہے تھے اسی وقت کچھ طلبا کو پڑھایا بھی کرتے تھے (۲۳)۔

دلچسپیاں اور کارنامے

خاندان کے مذہبی ماحول کا مولانا آزاد پر گہرا اثر پڑا تھا۔ وہ خود قبول کرتے ہیں کہ ''میں اپنی خاندانی ونسلی وراثت سے بے خبر نہیں ہوں۔ خاندانی زندگی کی روایتیں مجھے میرے دادیہال اور نانیہال دونوں سلسلے سے ملیں اور دونوں پر صدیوں کی قدامت اور تسلسل کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بہرحال میرے حصے میں آئی تھیں۔ انھیں قبول کرنے یا نہ کرنے میں میری خواہش اور پسند کا کوئی دخل نہ تھا (۲۴)۔ بچپن میں پیغمبر اسلام کی زندگی اور حصولیابی ان کے ساتھیوں کی فتوحات اور شہیدوں کی ناقابل فراموش خدمات اور قربانیوں کا مطالعہ کرنے میں ان کی خاص دلچسپی تھی (۲۵) لیکن فلسفہ پڑھنے میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لیتے تھے جو عمر کے بڑھنے کے ساتھ اور زیادہ بڑھتی چلی گئی (۲۶)۔ عام بچوں سے الگ ان کا رجحان مطالعہ کی طرف زیادہ تھا۔ مولانا آزاد کے لفظوں میں ہی ''لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں مگر بارہ تیرہ سال کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتابیں لے کر کسی گوشے میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں'' (۲۷)۔ اسی شوق

میں جب سیر کے لیے نکلتے تھے تب بھی کتاب ساتھ لے کر آتے تھے اور گھومنے کی بہ نسبت کسی گوشہ وتنہائی میں بیٹھ کر پڑھنے لگتے۔ اور اکثر ہی ایسا کرنے پر ٹہلانے کے لیے ساتھ آنے والے شخص کی ڈانٹ بھی کھاتے تھے۔ لیکن پڑھنے کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اکثر دن کے تیسرے پہر کتاب لے کر کسی پُرسکون مقام پر چلے جاتے اور شام تک پڑھتے رہتے تھے (۲۸)۔ پڑھنے میں دلچسپی کی وجہ کر وہ ہر اس کتاب کو پڑھتے تھے جو ان کے ہاتھ لگ جاتی تھی اور والد کے خوف کی وجہ کر رات کے دو دو تین تین بجے تک چپ چاپ پڑھتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ والد کے ذریعہ ایسے ہی موقع پر دیکھ لیے جانے پر جب انھوں نے پوچھا کہ اس وقت کون سی کتاب پڑھ رہے تھے، تو جواب میں مولانا نے جھوٹ بول دیا اور جو کتاب پڑھ رہے تھے اس کی جگہ پر اپنی کورس کی کتاب کا نام بتا دیا جس سے والد ناراض نہ ہوں (۲۹)۔ مولانا آزاد قرآن حفظ کر کے ایک باعزت اور باوقار حافظ بننا چاہتے تھے (۳۰)۔ سیاست سے انھیں کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ انھوں نے بذاتِ خود یہ قبول کیا ہے کہ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا، انھوں نے مجھے ڈھونڈ لیا (۳۱)۔ متلاشی الذہن ہونے کی وجہ کر ان کا رُجحان موسیقی کی طرف بھی ہوا تھا اور انھوں نے اپنے والد کے شاگرد مسیتا خاں سے موسیقی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ آلات موسیقی میں انھیں ستار بطور خاص پسند تھا۔ بعد میں لکھنؤ کے مرزا محمد ہادی سے بھی انھوں نے ستار بجانے کی ٹریننگ لی تھی (۳۲)۔

مولانا آزاد روایتوں سے بندھ کر چلنے کی بہ نسبت نئی باتوں کا استعمال پسند کرتے تھے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ ''میری تعلیم خاندان کے موروثی عقائد کے خلاف نہ تھی کہ اس راہ سے کوئی کشمکش پیدا ہوتی۔ وہ سرتاسر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی جو مؤثراتِ نسل اور خاندان نے مہیا کر دیے تھے۔ تعلیم نے انھیں اور زیادہ تیز کرنا چاہا اور گرد وپیش نے انھیں اور زیادہ سہارے دیے ...... مگر بار بار یہی سوال سامنے اُبھرنے لگا تھا کہ اعتقاد کی بنیاد علم و نظر پر ہونی چاہیے۔ تقلید و توارث پر ہی کیوں ہو۔ یہ گویا دیوار کی بنیادی اینٹوں کا ہل جانا تھا کیوں کہ موروثی اور روایتی عقائد کی پوری دیوار صرف تقلید ہی کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے، جب بنیاد ہل گئی تو دیوار کب کھڑی رہ سکتی تھی۔ کچھ دنوں تک طبیعت کی درماندگیاں سہارا دیتی رہیں لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اب کوئی سہارا بھی اس گرتی دیوار کو نہیں

سنبھال سکتا"(۳۳)۔

مولانا کے اس طرح سوچنے کے طریقے پر، دوسرے لفظوں میں ان کے روایت پسند ہونے کی جگہ ارتداد روایت کی وجہ کر ان کے والد اور بہنیں ان سے ناراض بھی رہتے تھے(۳۴)۔ حصول علم کی تشنگی کی وجہ کر ہی وہ سرسید احمد خاں کے مضامین سے متعارف ہوئے اور ان سے اتنے متاثر ہوئے کہ ایک بت کی طرح ان کی پوجا کرنے لگے(۳۵)۔ لیکن مصر کے ایک دانشور سید رشید رضا کے مضامین کو پڑھ کر ان کا خیال بدل گیا۔ انھیں ایسا لگا کہ سرسید احمد خاں مسلمانوں کی ترقی کے لیے جس فکری تحریک کو چلانا چاہتے تھے وہ مقامی سطح کا ہے جب کہ اس کے لیے قومی سطح پر تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ سرسید احمد خاں کے ذریعہ دکھایا گیا راستہ مسلمانوں کے لیے صحیح نہ ہو کر غلط راستہ ہے(۳۶)۔

تقسیم بنگال اور دہشت گردانہ اثرات

تین دسمبر ۱۹۰۳ء کو لارڈ کرزن نے بنگال کے بٹوارے کی تجویز کا اعلان کیا تھا۔ اس وقت بنگال میں حکومت مخالف خفیہ تنظیمیں پنپ رہی تھیں۔ چنانچہ بٹوارے کے خلاف پورے بنگال میں پُرتشدد عوامی تحریک شروع ہوگئی۔ عوام کے جذبات کو نظر انداز کر کے حکومت کے اہل کاروں نے ۱۶/اکتوبر ۱۹۰۵ء کو تقسیم بنگال کا اعلان کر دیا تھا(۳۷)، جس کے نتیجے میں بنگال میں فرقہ پرست طاقتوں کو بڑھاوا ملا تھا۔ تقسیم بنگال کی حمایت کرتے ہوئے کٹر قسم کے ملّا مولوی کہہ رہے تھے کہ سرکار اس وقت مسلمانوں کے ساتھ ہے لہٰذا ہندوؤں پر قہر ڈھا دو۔ سرکار نے تین ماہ کے لیے عدالتیں بند کر دی ہیں۔ اس وقت کوئی سزا نہیں دی جائے گی(۳۸)۔ اسی خلاصے کا ایک لال پرچہ چھپوا کر سبھوں میں بانٹا گیا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ عدالتوں میں جج حضرات بھی کھلے عام مسلمانوں کی طرفداری کر رہے تھے(۳۹)۔ دوسری جانب قوم پرست لیڈر اس بٹوارے کی مخالفت کر رہے تھے۔ قومیت کی لہر پورے بنگال میں ایک طوفان کی طرح چھا گئی تھی۔ امبیکا چرن مجمدار کے لفظوں میں "بنگالی خود کو دبا کچلا، بے عزت اور ٹھگا ہوا محسوس کر رہے تھے"(۴۰)۔

بنگال میں قوم پرستی کے بیج تو قبل سے ہی موجود تھے۔ اٹلی کو متحد کرنے کی تحریک

کے رہنما میجینی اور گیری بالڈی سے متاثر ہو کر ۷۶-۱۸۷۵ء کے آس پاس بنگال میں خفیہ تنظیموں کی تشکیل ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ ٹیگور خاندان کے لوگ بھی اس کے حامیوں میں تھے(۴۱)۔ لیکن اس وقت بنگال بہت پُرتشدد بنا ہوا تھا۔ بنکم چندر چٹرجی کے ناول "آنند مٹھ" کا گیت "وندے ماترم" عوام کا اعلان فتح بن گیا تھا۔ بنگال کے اشونی کمار دت، بھوپیش چندر ناگ، کرشن کمار متر، منورنجن گپتا ٹھاکر (برتی سمیتی فرید پور کے سربراہ) شیام سندر چکرورتی، راجہ سبودھ چندر ملک، ستیش چندر چٹوپادھیائے، شچیندر ناتھ بسو، پولین بہاری داس جیسے نو شہرت یافتہ لیڈروں نے سرکار کے خلاف عوامی انقلاب کا بگل بجا دیا(۴۲)۔ سوامی وویکانند کی تقریر کے قوم پرستانہ لب و لہجے نیز پیغام کو ان دنوں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مرتبہ بنگال بھر میں کئی خفیہ انقلابی تنظیموں کا قیام ہوا اس میں ڈھاکہ کی "انوشیلن سمیتی" کی شاخیں بنگال میں کئی مقامات پر قائم کی گئیں(۴۳)۔ فرید پور میں "برتی سمیتی، میمن سنگھ میں سوہرد سمیتی اور "سادھنا سمیتی" باقر گنج اور باری سال میں "سودیش باندھو سمیتی" کے نام اس ضمن میں قابل ذکر ہیں(۴۴)۔ ان سبھی تنظیموں کا مقصد ولایتی اشیاء کا بائیکاٹ کرنا اور سودیشی چیزوں کو اپنا کر تقسیم بنگال کی بے عزتی کا بدلہ لینا تھا۔ بنگالی سماج میں تقسیم کے خلاف عوامی اتحاد ثابت کرنے کے لیے روبندر ناتھ ٹیگور نے آپسی راکھی بندھن اور اپنا دکھ ظاہر کرنے کے لیے ایک مشہور عوامی رہنما اور ادیب شری رامیندر سندر دویدی نے "بنگ بھنگ" (۱۶/اکتوبر) کے دن کھانا نہ بنانے اور فاقہ کرنے کی تجویز رکھی جسے بنگال بھر میں سبھوں نے منظور کیا(۴۵)۔ مسٹر اروند گھوش بڑودہ میں ایک اچھی تنخواہ کی نوکری چھوڑ کر کلکتہ چلے آئے اور انقلابی کاموں میں لگ گئے(۴۶)۔ برہم بندھو اُپادھیائے، اروند گھوش، واریندر گھوش، سکھا رام گنیش دیوسکر، بھوپیندر ناتھ دت (سوامی وویکانند کے چھوٹے بھائی) وپن چندر پال، اویناش چکرورتی اور سبودھ چندر ملک وغیرہ نے سندھیا یوگانتر اور وندے ماترم جیسے اخبارات نکال کر بنگ بھنگ کی مخالفت کے پروپیگنڈے کو پُرتشدد شکل دے دی(۴۷)۔ جب سارے بنگال میں تقسیم کے خلاف طوفان اُٹھ رہا تھا تو روس پر جاپان کی فتح سے حوصلہ پاکر "واریندر گھوش" (اروند گھوش کے چھوٹے بھائی) نے اپنا سارا دھیان بنگال میں مسلح انقلاب کی تحریک میں لگا دیا اور کچھ دوستوں کی مدد سے مذکورہ انقلاب کا آغاز کر دیا(۴۸)۔ بٹوارے کی مخالفت میں ان انتہا پسندوں نے بنگال میں سرکار کے خلاف

لوٹ، ڈاکہ اور سیاسی قتل کی ۳۷ کوششیں کی تھیں (۴۹)۔ مسلمان ان تمام سرکار مخالف انقلابی عمل میں شامل نہیں تھے۔ بلکہ ان سے الگ تھلگ تھے (۵۰)۔

مولانا آزاد بنگال کے ان حالات و واقعات سے بے خبر نہیں تھے۔ بنگال کے ایک با اثر مولانا شاہ مرشد علی کے لڑکے مولوی ارشاد قادری مدناپوری سے تعلقات ہونے کی وجہ کر مولانا آزاد کو بنگال میں عزت و شہرت حاصل ہو چکی تھی (۵۱)۔ اس وقت تک وہ ''لسان الصدق'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی مشہور ہو چکے تھے۔ انگریز مخالف جذبات ان کے خون میں سرایت کر چکے تھے (۵۲)۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے دوران کیے گئے مظالم کی داستان وہ بچپن سے ہی سنتے آئے تھے (۵۳)۔ اس طرح وہ دل سے انگریز مخالف ہو چکے تھے اور اس وقت ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ قومی مفاد کے لیے کچھ کام کرنے کی اپنی اندرونی خواہش کی وجہ کر وہ اس وقت بڑھتے ہوئے قوم پرستانہ جذبات سے الگ نہیں رہ سکے اور پوری طرح اس رنگ میں رنگ گئے۔ اس جھکاؤ کی وجہ سے مولانا آزاد بنگال کے مشہور انقلابی رہ نما اروند گھوش اور شیام سندر چکرورتی کے قریب آئے اور چکرورتی کے ذریعے سے انقلابیوں کی جماعت میں شامل ہو گئے (۵۴)۔ مسٹر اروند گھوش انقلاب کے پرچار کے لیے ''کرم یوگن'' نام کا ایک اخبار نکالتے تھے۔ مولانا پر اس اخبار کا کافی اثر پڑا۔ وہ ''کرم یوگن'' سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ انھوں نے اسے قومی بیداری اور غیروں کی حکومت کے خلاف جنگ کا جھنڈا کہا تھا (۵۵)۔ اس وقت بنگال کے ہندو سیاست داں انگریزی مال کا بائیکاٹ کرنے کے ارادے پر قائم تھے۔ مشرقی بنگال کے نئے صوبے کے نائب گورنر سروام فیلڈ فولر نے اس آندولن کو دبانے کے لیے کچھ قدم اُٹھانے چاہے تھے لیکن مرکزی سرکار کے ذریعہ اس کی حمایت نہ کرنے پر انھوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ نتیجتاً تقسیم مخالف تحریک مزید تیز ہو گئی تھی۔ عوام یہ ماننے لگی تھی کہ اب انگریزی حکومت کا اختتام قریب ہے (۵۶)۔ لیکن اس پر بھی مسلمان اس تحریک سے دور رہے۔ مسلمانوں کے ذریعہ انقلابی کاموں میں حصہ نہ لینے سے ہندو یہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمان سیاسی آزادی اور ہندوؤں کی جماعت کے خلاف ہیں، اس لیے مولانا آزاد نے انقلابیوں کا اعتماد حاصل کیا اور انھیں اپنی تنظیم اور دائرہ کار بڑھانے کا مشورہ بھی دیا جو قبول کرلیا گیا۔ بعد میں بمبئی اور ملک کے دیگر شہروں میں اس کی شاخیں قائم کی گئیں (۵۷)۔

اس دوران مولانا آزاد نے اپنے ہم خیال نوجوانوں کی ایک تنظیم بھی بنا لی تھی۔

بنگال میں اپنی سرگرمیوں کی وجہ کر مولانا یہاں خفیہ محکمے کی نظروں میں آ گئے تھے (۵۹)۔ تقسیم بنگال سے پیدا شدہ انقلابی سرگرمیوں سے جڑ جانے کے بعد وہ خود کو انقلابی کاموں سے الگ نہیں کر سکے۔ ریاستی خفیہ محکمے کی اطلاع کے مطابق ۱۹۰۷ء میں وہ لاہور گئے اور وہاں انھوں نے صوفی امبا پرشاد اور سردار اجیت سنگھ (سردار بھگت سنگھ کے چچا) سے ملاقات کی اور انتہا پسندانہ سرگرمیوں کو بروئے کار لانے میں تعاون کیا (۶۰)۔ وہ علی پور واقعے سے بھی جڑے ہوئے تھے۔ سرکار نے انھیں علی پور کے پاس ایک ٹرین کو پٹری سے اُتارنے کے واقعے میں ملوث پایا تھا (۶۱)۔ ۱۹۰۸ء کی سیریا، فلسطین اور عراق کے سفر کے دوران ان کے اندر وطن پرستی کے جذبات اُجاگر ہو گئے تھے، جس نے ان کے نظریات اور فکری روش کو پوری طرح ملک کی آزادی کی سمت موڑ دیا تھا اور اب وہ اپنی تمامتر توانائیوں کے ساتھ اس کے لیے کوشش کرنے لگے تھے۔

صحافت کی ابتدائی سرگرمیاں

نوعمر ابوالکلام کی غیر معمولی صلاحیتیں کچھ کر گزرنے کے لیے ان کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں۔ کوئی بھی قدم اُٹھانے سے پہلے وہ اس پر پوری طرح غور وفکر کرتے تھے۔ سرسید احمد خاں کے خیالات سے ان کے نظریات کو ایک نئی جہت حاصل ہوئی تھی۔ وہ اپنے چاروں طرف کے سماجی ماحول کو دیکھ کر ان کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ غور وفکر کے ابتدائی مرحلے میں مسلمانوں کی اسی بات کو لے کر وہ پریشان رہے کہ جب مسلمانوں کے سبھی فرقے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا مطمحِ نظر ایک ہی ہے تو پھر وہ ایک دوسرے کی اتنی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ ایک فرقہ دوسرے کو جتنے اعتماد کے ساتھ غلط اور کافر کہتا تھا اس سے بھی ان کے دل کا میل نہیں بیٹھتا تھا۔ اسی لیے وہ خود مذہب کو لے کر شبہات میں مبتلا رہتے تھے اور یہ سوچتے تھے کہ اگر مذہب ایک ہی عالمگیر صداقت کا مظہر ہے تو پھر الگ الگ مذاہب کے ماننے والوں میں اتنے اختلاف اور اتنا کشمکش کیوں ہے۔ ہر مذہب کا دعویٰ یہ کیوں ہوتا ہے کہ صداقت کی واحد بنیاد وہی ہے اور دوسرے سبھی مذاہب جھوٹے ہیں (۶۲)۔ اس طرح کے سوالات نے کچھ نئی راہ نکالنے کے لیے مجبور کر دیا اور انھوں نے

آخرکار یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں وراثت میں ملے عقیدوں سے بندھا نہیں رہ گیا ہوں، اپنا تخلص آزاد رکھنا طے کیا (۶۳)۔ یہ نام مولوی عبدالواحد خاں سہسرامی نے جن کی وجہ سے ان کو شاعری کا شوق پیدا ہوا تھا، رکھا تھا۔ اس کے رکھنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ آزاد کا ''الف'' اردو حروف تہجی میں سب سے پہلے ہونے سے اخبار و رسائل میں ان کی تخلیق سب سے پہلے چھپے گی (۶۴)۔

مطالعے کے شوقین ہونے کی وجہ کر ۹۸-۱۸۹۷ء کے دوران وہ لاہور کے ایک اخبار ''اخبار عام'' سے متعارف ہوئے۔ یہ ان کی زندگی میں آنے والا سب سے پہلا اخبار تھا (۶۵)۔ اس وقت تک شاعری میں ان کو اچھی خاصی مہارت ہوگئی تھی۔ شاعری میں وہ لکھنؤ کے ادبی رسالے ''اصلاح'' کے مالک مولوی ظہیر احسن شوق نیموی کے شاگرد بن گئے تھے (۶۶)۔ انھوں نے بمبئی سے شائع ہونے والے ادبی رسالے ''ارمغان فرخ'' سے لی گئی طرح (۶۷) ''پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی'' پر ایک غزل لکھی اور سنائی۔ یہ پہلی غزل تھی جو انھوں نے کسی کو سنائی تھی۔ ان کی یہ غزل ''ارمغان فرخ'' میں ہی چھپی تھی (۶۸)۔ اسی زمانے میں ان کا جھکاؤ فارسی میں شاعری کرنے کی طرف بھی ہوا اور انھوں نے فارسی کی ''نل دمن'' کی طرح کی ایک مثنوی بھی لکھنا شروع کی تھی (۶۹)۔ شاعری کے شوق کی تکمیل کے لیے انھوں نے ایک ادبی جریدے کی ضرورت محسوس کی اور اسی شوق کی وجہ کر پچاس روپے جمع کر کے ۱۸۹۹ء میں ہادی پریس، ہریسن روڈ، کلکتہ سے ایک جریدہ ''نیرنگ عالم'' نکالنے کا انتظام کیا گیا (۷۰)۔

اس وقت مولانا آزاد کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔ یہ پرچہ ماہانہ تھا۔ اس کے صرف آٹھ شمارے شائع ہو سکے۔ اس کے بعد اس کی اشاعت بند ہوگئی (۷۱)۔ مولانا آزاد نے مشاعروں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور اسٹیج پر اپنا ایک باوقار مقام بنا لیا تھا۔ مولانا آزاد کے بڑے بھائی ابونصر آہ بھی ان مشاعروں میں ان کے ساتھ حصہ لیتے تھے (۷۲)۔ بچپن میں ہی کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر انھوں نے ''بلاغ'' نام کا ایک پرچہ نکالا تھا (۷۳)۔ ادبی رسالے کے بند ہو جانے کے بعد مولانا آزاد نے اخبارات کی طرف قدم بڑھایا اور مولوی احمد حسن کی مدد سے ۱۹۰۰ء کی میٹھی عید (یکم یا ۲؍فروری ۱۹۰۰ء) کو اپنی ادارت میں ایک ہفتہ وار اخبار ''المصباح'' نام سے شائع کیا۔ یہ اخبار بھی تین چار مہینے

کے بعد بند ہوگیا۔ یہ پہلا اخبار تھا جس کی ادارت مولانا آزاد نے کی تھی (۷۴)۔ ۱۹۰۰ء میں مولانا آزاد کا تعلق کلکتہ سے جاری ہونے والے ہفت روزہ ''احسن الاخبار'' سے ہوگیا۔ اسے مصطفائی پریس کے مالک عبدالغفار نے نکالا تھا۔ انھیں اس اخبار کے بدلے میں قسطنطنیہ، ٹیونس وغیرہ ملکوں سے آنے والے ''المنار'' اور الہلال جیسے اخبارات کو پڑھنے کا موقع ملا۔ انھی اخبارات سے انھیں عرب ملکوں کے بارے میں مکمل اور گہری دلچسپی لینے نیز وہاں سے متعلق ساری جانکاری حاصل کرنے کے مواقع فراہم ہوئے، ساتھ ہی صحافتی میدان میں مضامین لکھنے، خبروں و مضامین کا انتخاب کر کے ان کا ترجمہ کرنے، علم و ادب کے نقطۂ نظر سے مضامین مرتب کرنے، کتابوں اور رسالوں پر تبصرہ کرنے اور اس طرح کے دیگر کاموں کا بھرپور عملی تجربہ حاصل ہوا (۷۵)۔

کچھ دنوں کے لیے انھوں نے شاہ جہاں پور سے نکلنے والے ''ایڈورڈ گزٹ'' نام کے اخبار میں بھی ایڈیٹر کا کام کیا (۷۶)۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے لکھنؤ کے منشی نوبت رائے نظر کے ماہنامہ رسالے ''خدنگ نظر'' کے نثری حصے کے ادارت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی (۷۷)۔

لسان الصدق

احسن الاخبار بند ہو جانے کے بعد ان کی خواہش اپنا ایک آزاد اخبار نکالنے کی تھی (۷۸)۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۰۳ء میں لسان الصدق نامی ایک ماہنامہ پرچے کا آغاز کیا۔ اس کی اشاعت میں انھوں نے اپنے پرانے بزرگ دوست و استاذ مولوی محمد یوسف جعفری سے مشورہ لیا تھا (۷۹)۔ ۲۰؍نومبر ۱۹۰۳ء کو اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا (۸۰)۔

ہندوستان میں انگریزوں کے ذریعہ حکومت قائم کرنے کے وقت مسلمان حکمراں طبقے کے ممبر تھے لہٰذا انھوں نے انگریزوں کی مخالفت میں اپنی سماجی وتہذیبی زندگی کو انگریزی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے آپ کو ایک محدود دائرے میں بند کر لیا تھا۔ ایک طویل عرصے تک ایسے ہی رہنے کی وجہ کر وہ آہستہ آہستہ سماجی، انتظامی اور سیاسی میدان میں دوسروں بطور خاص ہندوؤں سے پچھڑ گئے تھے۔ اس پچھڑے پن سے مسلمانوں کے سماج اور مذہب میں کئی برائیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ مولانا آزاد مسلم معاشرے کی انھیں سماجی اور

مذہبی برائیوں کو دور کرنا چاہتے تھے اور اردو ادب کو مزید وسعت دے کر ترقی یافتہ بنانا چاہتے تھے۔لوگوں کے اندر ادبی ذوق پیدا کرنا بھی ان کا ایک اہم مقصد تھا جیسا کہ اس پرچے کے پہلے شمارے کے اداریہ میں انھوں نے ''لسان الصدق'' کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''لسان الصدق'' کے مقاصد اس طرح ہیں :

(۱) سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا۔

(۲) ترقی اردو یعنی اردو زبان کے اسلامی لٹریچر کے دائرے کو وسیع کرنا۔

(۳) علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگال میں۔

(۴) تنقید اردو یعنی اردو تصانیف پر منصفانہ ریویو کرنا(۸۱)۔

مولانا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو علم و ادب نیز سائنسی معلومات کی سبھی جہتوں سے روشناس کرایا جائے۔ جس طرح سے ہندوؤں نے ترقی کی ہے اسی طرح مسلمانوں کو بھی آگے بڑھایا جائے۔ انھوں نے لکھا تھا — برخلاف بنگال کے مسلمانوں کے اگر اسی صوبے کے ہندوؤں کو دیکھا جائے تو زمین آسمان کی یہ غیر فطری تشبیہ فطری معلوم ہوتی ہے، جو علمی مذاق و دماغی ترقی ہندوؤں میں نظر آتی ہے اسے دیکھ کر ایک باریک بیں نگاہ حیرت میں پڑجاتی ہے۔ لسان الصدق اپنی کوشش سے ان میں (مسلمانوں میں) اب پہلے اس کا احساس پیدا کرے گا اور پھر اس مذاق کی اشاعت کرے گا(۸۲)۔ اس وقت وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی سیاسی حالت میں سدھار ہونا چاہیے۔ کلکتہ میں مسلمانوں کی طرف سے ایک انگریزی اخبار کے اشاعت کی خبر پر انھوں نے لکھا کہ ایک ایسے وکیل کی مسلمانوں کو سخت ضرورت ہے جو ہماری فریادوں کو حکامِ وقت تک پہنچا دے اور ان کے خیالات اور ارادوں سے ہمیں مطلع کرے(۸۳)۔ ان کا خیال تھا کہ صحافت ایک صاف وشفاف کام ہے۔ اس میں اخبارات کا ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنا، الزام لگانا غلط ہے(۸۴)۔ لہٰذا انھوں نے لسان الصدق کے دوسرے شمارے میں لکھا کہ ہماری دلی خواہش ہے کہ ہندوستان کے اخباروں اور رسالوں میں ہم سفرانہ ہمدردی پیدا ہو(۸۵)۔

مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی جانب ان کا خاص دھیان لگا ہوا تھا۔ اس وقت بنگال کے ایجوکیشن ڈائرکٹر نے بنگال میں تعلیم کا بیورا دیتے ہوئے ایک رپورٹ شائع کی تھی، اس پر اپنا ردِّعمل ظاہر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ اصلی ترقی تعلیم پروفیشنل کالجوں کی تعلیم

حاصل کرنی ہے، جہاں مسلمان طلبا کی تعداد زیادہ حسرتناک ہے۔ ۱۹۰۲ء میں ان کالجوں میں صرف ۹۳ طالب علم شامل ہوئے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ہم کو سوائے ہائے کرنے کے اور کچھ نہیں آتا۔ ہمارے تنزل کا مسئلہ حل کرنا کچھ آسان نہیں(۸۶)۔

اس سلسلے میں بنگال کی صوبائی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ پراونشیل کانفرنس کو اگر واقعی مسلمانوں کی ترقی مقصود ہے تو اس رپورٹ پر توجہ کر کے ان اسباب کو دریافت کریں، جن سے مسلمان بجائے ترقی کرنے کے روز بروز تنزل کی جانب ٹھیلے جاتے ہیں(۸۷)۔

سرسید احمد خاں انگریزی ادب کے اردو تراجم کے مخالف تھے۔ لیکن ان کے خیالات کے برخلاف مولانا آزاد اردو کی ترقی کے لیے انگریزی ادب کا ترجمہ کر کے اردو ادب کو مالا مال کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مولانا شبلی نعمانی کو خط لکھ کر ان سے مشورہ بھی طلب کیا تھا جس کے جواب میں مولانا شبلی نعمانی نے اپنی رائے ان کے حق میں ظاہر کی تھی۔ مولانا شبلی نعمانی نے اپنے خط میں مولانا آزاد کو لکھا تھا کہ تعلیم پھیل رہی ہے۔ تعلیم یافتہ جماعت روز بروز وسیع ہو رہی ہے۔ اس لیے نئی کتابوں کا ترجمہ بھی ہوتا رہے گا۔ اس کے علاوہ اردو میں ہم علوم کی کتابیں بھی جمع کرنا چاہتے ہیں۔ اردو میں علوم کی ہر شاخ میں چند جامع کتابوں کا ترجمہ کر لینا کافی ہے۔ اس کے بعد علمی ذوق خود اردو میں علوم کا سرچشمہ جاری کرے گا(۸۸)۔ مولانا اپنے موجودہ سماج کے مذہبی وفکری سطح کی تنزلی سے متفکر تھے۔ اسے سدھارنے کے لیے وہ ''لسان الصدق'' کا استعمال کرنا چاہتے تھے، لہٰذا انھوں نے مسلمانوں میں اعلیٰ ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے جنوری ۱۹۰۵ء سے ''لسان الصدق'' میں ایک نیا سلسلہ شروع کرنے کا فیصلہ لے کر بیسویں صدی کے مشرقی دانشوروں کا باتصویر تعارف چھاپنے اور خاص نقطۂ نظر سے لکھے مذہبی مضامین شائع کرنے کا اعلان کیا۔ انھوں نے اس کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے لکھا کہ :

(۱) جنوری میں (اخبار کا) ایک مقصد اور بڑھایا جائے گا، اصلاحِ خیالات۔

(۲) ضرورتیں مجبور کر رہی ہیں کہ ''لسان الصدق'' میں مذہبی مضامین شائع ہوں گے، جن میں کسی خاص تحقیقات سے کام لیا گیا ہے۔

اس کے لیے انھوں نے اپنے خط میں مضامین کی جو ترتیب رکھی وہ اس طرح تھی :

(۱) انیسویں صدی کے کسی ایشیائی عالم کے خیالات سے متعلق مضمون اس میں عالم کی تصویر چھاپنے کا بھی نظم کیا گیا تھا۔
(۲) ایک مذہبی مضمون
(۳) سائنس اور معلوماتِ عامہ سے متعلق مضامین
(۴) کسی اچھی کتاب کا ترجمہ یا کوئی دیگر مضمون (۸۹)

انھیں کے لفظوں میں ''درحقیقت کوئی رسالہ اردو میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس مرض کا شافی علاج کر سکے، جس نے ملک کے عام مذاق اور شوق و ذوق میں اضمحلال پیدا کر دیا ہے'' (۹۰)۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھوں نے خط میں لکھا تھا ''ہم نے آج سے ''لسان الصدق'' کو ایک ایسی حالت میں چلانا چاہا ہے جس میں وہ مذاق انتخاب کر کے رکھا جائے جو درحقیقت اس وقت ضروری ہے'' (۹۱)۔ عوام الناس کے علم و عقل میں اضافے کے لیے مصر، قسطنطنیہ وغیرہ کی نایاب کتابوں پر ریویو کرنے کے لیے ''ریویو'' کے نام سے ''لسان الصدق'' کا ایک ماہانہ ضمیمہ نکالے جانے اور اس کو پڑھنے کے لیے ایک انجمن قائم کیے جانے کا اعلان بھی کیا گیا (۹۲)۔

مولانا آزاد یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے علم میں اضافے کے لیے نئی کتابیں چھپنی چاہئیں بھلے ہی وہ کم مقبول ہوں، کم فروخت ہوں، پر آگے چل کر اس کا اثر بہت اچھا پڑے گا۔ انھوں نے لسان الصدق میں لکھا تھا کہ ''کتابیں شائع کی جائیں اور اس کی بالکل پروا نہ کی جائے کہ جلد نکلے گی یا مزید ضرورت اور تعلیمی ذوق تھوڑے ہی عرصے میں ناول اور دیوان پر سب جماعت کو مجبور کرلے گا کہ وہ ایجوکیشن اور فلسفۂ حسن کو خریدیں اور ناولوں کے ساتھ اپنی الماریوں میں بھی ان کے لیے جگہ نکالیں (۹۳)۔ ادبی رجحان میں اضافے کے ساتھ ہی مذہبی تعلیم و نصیحت کو بھی عصری شکل و صورت دینے میں وہ اس وقت دلچسپی لے رہے تھے۔ انھوں نے لکھا کہ ''زمانے کے حالات بدل گئے اور تعلقات نے دوسری صورت اختیار کر لی۔ اس لیے اس زمانے میں وہ خطبے کیوں کر مفید ہوں جو اب سے سو پچاس برس پیشتر ضرورتوں کے موافق قدما نے ترتیب دیے (۹۴)۔ انھوں نے کہا کہ ''خطبے خاص جماعتوں کے لیے مخصوص نہ ہو جائیں شرک و بدعت کی تردید اور غلط فہمی اور توہمات کی مخالفت ایسے طریقے سے کی جائے کہ عوام بغیر اس کے کہ ان کو ناگوار گزرے اس کے

ترک پر آمادہ ہو جائیں (۹۵)۔ لسان الصدق کا یہ شمارہ بارہواں اور آخری ثابت ہوا تھا (۹۶)۔

لسان الصدق کی اشاعت بند ہو جانے کی وجہ کر مولانا اپنے خیالات ظاہر کرنے کے لیے ایک نیا ذریعہ تلاش رہے تھے۔ اسی دوران بمبئی میں ان کی ملاقات مشہور عالم مولانا شبلی نعمانی سے ہوئی (۹۷)۔ مولانا شبلی ''خدنگ نظر'' میں چھپے مولانا آزاد کے ایکسرے پر لکھے گئے ایک مضمون ''ضوء غیر مرئی کی تاریخ: انکشاف اور حقیقت'' سے بہت متاثر ہوئے تھے (۹۸)۔ انھوں نے مولانا آزاد سے گزارش کی کہ وہ ان کے پرچے ''الندوہ'' کی ادارت قبول کر لیں۔ مولانا آزاد نے سات آٹھ مہینے اس پرچے کی ادارت کی (۹۹)۔ شبلی نامہ کے مصنف شیخ اکرام کے مطابق مولانا آزاد کو ایک عالم اور مذہبی رہنما کی شکل میں شہرت دینے والے مضامین اسی پرچے میں چھپے تھے (۱۰۰)۔ ''الندوہ'' چھوڑنے کے بعد مولانا آزاد لاہور چلے گئے۔ وہاں انھوں نے رفاہِ عام پریس کے مالک سید ممتاز علی کے ساتھ مل کر تعلیم سے متعلق کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا (۱۰۱)۔ لاہور میں ان کی ملاقات شیخ غلام محمد مالک سے ہوئی تھی وہ امرت سر سے نکلنے والے اخبار ''وکیل'' کے مالک تھے۔ ان کے اخبار کے ایڈیٹر زاہد علی صدیقی کے نوکری چھوڑ دینے سے جو جگہ خالی ہوئی تھی اس کو بھرنے کے لیے انھوں نے مولانا آزاد کو دعوت دی جسے مولانا نے قبول کر لیا اور مستقل طور پر پرچے کی ادارت کا کام شروع کر دیا (۱۰۲)۔ مولانا آزاد شیخ غلام محمد کے اس خیال سے متفق تھے کہ قوم کو تعلیم دینے کا جو ذریعہ ہو سکتا ہے وہ سب سے بہتر اخبار کا ہے۔ لہٰذا کچھ ہفتے کے بعد ہی انھوں نے اخبار کی ادارت کی ذمہ داری سنبھال لی (۱۰۳)۔ انھوں نے اخبار کی شکل و صورت میں اپنی خواہش کے مطابق کچھ تبدیلیاں بھی کیں (۱۰۴)۔ لیکن مولانا زیادہ دنوں تک یہاں کام نہ کر سکے۔ بھائی کی موت ہو جانے کے بعد انھیں ''وکیل'' کی ذمہ داری چھوڑ کر کلکتہ چلا جانا پڑا۔ ان دنوں کلکتہ میں چمڑے کے تاجر مولانا عبداللطیف اپنے والد کے جاری کیے ہوئے اخبار ''دارالسلطنت'' کو جو ایک بار بند ہو گیا تھا پھر سے نکالنا چاہتے تھے۔ چنانچہ مولوی محمد یوسف جعفری کے کہنے سے مولانا آزاد نے ''دارالسلطنت'' کی ادارت قبول کر لی (۱۰۵)۔ جنوری ۱۹۰۵ء میں یہ اخبار نکلنا شروع ہوا (۱۰۶)۔ کچھ دنوں تک مولانا آزاد نے اس کی ادارت کی لیکن مولوی عبداللطیف کے

ذریعہ اخبار کے اداراتی کاموں نیز اس کی پالیسی وسماجی مسائل کے معاملوں میں دخل اندازی کرنے کی وجہ کر مولانا ان کے ساتھ زیادہ دنوں تک کام نہیں کر سکے اور ادارت چھوڑ دی(۱۰۷)۔

مولانا اخبار کے ذریعہ اپنے خیالات کو مشتہر کرنے کے ساتھ ہی عوام کی خواہشات کا احترام بھی کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کا تعلق ''احسن الاخبار'' سے ہوا تھا اس سے کچھ پہلے ہی انھوں نے ''الاصلاح'' نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک مطالعہ گاہ بھی دارالاخبار نام سے قائم کی تھی۔ اس لائبریری میں اخبارات کا انتظام ''احسن الاخبار'' کے بدلے میں آنے والے اخبارات سے ہوتا تھا(۱۰۸)۔

ابتدائی بیانات اور مضامین

مولانا آزاد گیارہ سال کی عمر سے ہی لکھنے کی مشق کیا کرتے تھے لیکن عوام کے سامنے سب سے پہلے وہ شاعر کی حیثیت سے آئے تھے۔ ان کی غزلیں مولوی عبدالواحد کی ہدایت میں چھپنی شروع ہوئی تھیں(۱۰۹)۔ ان کی گیارہ سال کی عمر میں لکھی غزل جو ''ارمغانِ فرخ'' نامی رسالے میں چھپی تھی(۱۱۰)، اس میں اور دیگر غزلوں میں انسانی ہمدردی و ایثار ومحبت کی نہایت گہری اور واضح تصویر کشی ہوتی تھی۔ ان کی سب سے پہلی غزل میں قلب انسانی کی وسعت، نرمی فطرت نیز گہری خودداری ومستی کا تعارف ان الفاظ میں ملتا ہے:

ہوں نرم دل کہ دوست کی مانند رو دیا
دشمن نے بھی جو اپنی مصیبت بیان کی(۱۱۱)

نشتر بدل ہے آہ کسی سخت جان کی
نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی

گنبد ہے گرد بار تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی

آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی(۱۱۲)

عشق کے گہرے احساس کی واضح تصویر کشی کا ثبوت ایک غزل کے درج ذیل اشعار سے ملتا ہے۔

خاک میں آخر ملے ہم یہ ہوا انجام عشق
بھول کر یارب نہ لے کوئی جہاں میں نام عشق

میرے مرنے سے کھلا رازِ محبت خلق پر
سنگ مرقد بن گیا آئینۂ انجام عشق

یہ صلہ پایا وفا کا حسن کی سرکار سے
چہرۂ عاشق کی زردی ہے زرِ انعام عشق

پہلے تھا رخ کا تصور اب ہے گیسو کا خیال
وہ تھی صبح عشق گویا اور یہ ہے شامِ عشق

عشق کے تئیں مکمل عقیدت اور سپردگی کا بیان انھوں نے اس طرح کیا ہے۔

آستانِ یار پر ہر وقت سجدے کیجیے
ہے یہی بس دینِ عشق ایمانِ عشق اسلام عشق

سر فدا کر دوں تقاضہ ہے محبت کا یہی
تیغ قاتل دینے آئی ہے مجھے پیغام عشق(۱۱۳)

ایک اور غزل کے چند اشعار میں انھوں نے عشق کی سادگی اور بے بسی کی تشریح کی ہے۔

کیوں اسیر گیسوئے خمدار قاتل ہو گیا
ہائے کیا بیٹھے بٹھائے تجھ کو اے دل ہو گیا

اس نے تلواریں لگائیں ایسے کچھ انداز سے
دل کا ہر ارماں فدائے دستِ قاتل ہو گیا

یہ بھی قیدی ہو گیا آخر کمندِ زلف کا
لے اسیروں میں ترے آزاد شامل ہو گیا(۱۱۴)

ان کی غزلوں میں حسن وعشق کی آفاقیت کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔

کوئی شے خالی نہیں نیرنگ حسنِ یار سے
گل میں رنگ و بو تو مہر و ماہ میں تنویر بھی

وقتِ نظارہ کبھی جمتی نہیں اس پر نگاہ
جوہر آئینہ ہے اے ظالم تری تصویر بھی(۱۱۵)

اس وقت مولانا کی عمر ۱۲ سال تھی۔ اتنی کم عمری میں اتنی فکری بصیرت سے پُر تخلیقات مولانا آزاد کی گہری نظروں کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ان کا ذہن اس وقت اتنا تیز اور شاعری کا شعور اتنا بھرپور تھا کہ اردو کے مشہور شاعر مرزا غالب کے شاگرد نادر خان نے ان کی کم عمری کو دیکھتے ہوئے ان کی غزلوں کو ان کا ماننے سے انکار کر دیا تھا اور امتحان لینے کی غرض سے کہ مولانا آزاد خود اتنی اچھی غزل لکھ سکتے ہیں انھوں نے ایک دن بازار میں ہی انھیں ''یاد نہ ہو''، ''شاد نہ ہو''، ''آباد نہ ہو'' کی طرح دی کہ اس پر ابھی غزل کہو اور پھر نادر خاں نے دیکھا کہ مولانا آزاد کئی شعر ایک کے بعد ایک اس وقت فی البدیہہ کہتے چلے گئے(۱۱۶)۔ ان دنوں ان کی تخلیقات مولوی غلام محی الدین احمد آزاد دہلوی کے نام سے شائع ہوتی تھیں(۱۱۷)۔

انھی دنوں مولانا کا جھکاؤ نظم سے نثر کی طرف ہوا۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاعر ہونے سے بھی زیادہ عزت کی بات مصنف اور صحافی ہونا ہے(۱۱۸)۔ نثر لکھنے میں سب سے پہلے

ان کا دھیان دوسرے لوگوں کی کتابوں کے ترجمے کی طرف گیا۔ انھوں نے اپنے والد کے شاگرد مولوی حبیب الرحمٰن کی ضرورت کے پیش نظر فارسی کے ایک پرچے کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اسی شوق میں انھوں نے اپنے والد کی کتابوں میں سے کچھ کے ترجمے کیے۔ مولانا آزاد کے مطابق ان میں سے ایک ترجمے کو انھی مولوی عبدالرحمٰن نے حیدرآباد سے ''خصائص محمدیہ'' کے نام سے چھپوایا بھی تھا(۱۱۹)۔ اس کے علاوہ امام غزالی کی ''منہاج العابدین'' کا مکمل ترجمہ اور جامی کی ''نفحات الانس'' کے کچھ حصوں کا ترجمہ کیا نیز امام غزالی کے کچھ مضامین کا بھی ترجمہ کیا(۱۲۰)۔ انھوں نے ایک انگریزی کتاب ''سولر سسٹم'' کے فارسی ترجمے کو اردو میں ڈھالا(۱۲۱)۔ ان تراجم کے پیچھے مولانا کا یہ خیال کام کر رہا تھا کہ اردو ادب کا دائرہ وسیع ہو اور اردو کے قارئین کے اندر ادبی رُجحان پیدا کیا جائے اور اس میں ہمیں مغربی علوم سے فائدہ اٹھانا چاہیے(۱۲۲)۔

مولانا کی تشفی صرف تراجم سے ہونے والی نہیں تھی کیوں کہ وہ آزادانہ طور پر مصنف اور صحافی ہونے کو بہتر مانتے تھے لہٰذا وہ اس جانب کوشاں تھے۔ ۱۹۰۰ء میں میٹھی عید پر اپنی ادارت میں چھپنے والے اخبار ''المصباح'' میں انھوں نے ''عید'' کے نام سے پہلا اداریہ لکھا۔ آنے والے تین چار ماہ تک انھوں نے امام غزالی کی زندگی سے متعلق مضامین لکھے۔ اس اخبار کی اشاعت سے کچھ دن قبل ہی انھوں نے امام غزالی کی سوانح حیات لکھنا شروع کر دیا تھا(۱۲۳)۔ مسلمانوں میں مغربی علوم کے تعلق سے کشش و تجسس پیدا کرنے اور انھیں سائنس سے متعارف کرانے کے لیے انھوں نے سائنسی انکشافات سے متعلق مضامین بھی لکھنے شروع کیے اور اسی غرض سے انھوں نے اس اخبار میں ''نیوٹن کا اصولِ کشش'' کے موضوع پر ایک مضمون لکھا۔ یہ ان کا پہلا آزاد مضمون تھا(۱۲۴)۔ اس دور میں مولانا کٹر مذہبی خیالات کے حامل تھے اور ان کا نقطۂ نظر مسلمانوں میں اپنے مذہب، معاشرے اور تہذیب سے متعلق عقیدت پیدا کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین میں اسلام کے تعلق سے خصوصی عزت و احترام دکھائی دیتا ہے۔

مولانا آزاد اور ان کے بھائی ابو نصر آہ دونوں ہی ''خدنگ نظر'' پرچے کے مستقل مضمون نگاروں میں تھے(۱۲۵)۔ مولانا آزاد نے ''خدنگ نظر'' کے مئی ۱۹۰۲ء کے شمارے میں ''زمانۂ قدیم میں کبوتروں کی ڈاک'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جس میں کبوتروں

کے ذریعہ ڈاک لے جانے کی شروعات کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ''مغربی اور مشرقی تاریخیں اس بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ ہاں اسلام کی تاریخ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اس کا سلسلہ سلطنت میں سب سے پہلے نور الدین محمد زنگی کے وقت میں شروع ہوا اور گویا اسلام میں اس کی داغ بیل ڈالنے والا نورالدین ٹھہرا'' (۱۲۶)۔ مولانا آزاد کے مضامین علم سے پُر ہوتے تھے۔ وہ کسی ایک موضوع پر مکمل جانکاری اپنے مضمون میں دینا چاہتے تھے۔ کبوتروں کی ڈاک کا طریقہ، ان کی نسل، قیمت، خط لکھنے کا طریقہ، خطوط میں استعمال ہونے والا کاغذ، سیاہی، کبوتروں کو دی جانے والی تربیت کا انتظام وغیرہ سبھی طرح کی جانکاری انھوں نے اپنے اس مضمون میں دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کبوتروں میں بھی خاص خاص نسل کے کبوتر عمدہ و قیمتی گنے جاتے تھے۔ چنانچہ بغداد میں خلیفہ ناصر کے وقت میں ایک ایک کبوتر ہزار ہزار دینار میں فروخت ہوتا تھا۔ ان کی پرورش و پرداخت کے لیے ایک محکمہ قائم کیا گیا تھا(۱۲۷)۔ ڈاک کا طریقہ سمجھاتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ تقریباً تیس چالیس میل کے فاصلے پر چوکیاں قائم کی گئی تھیں۔ ہر چوکی میں عمدہ کبوتروں کے رہنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ ایک منشی وہاں رہتا تھا۔ خط لکھنے میں حاشیہ نہیں چھوڑتے تھے(۱۲۸)۔

جب مولانا کا اخبار ''المصباح'' بند ہو گیا تو وہ شیخ عبدالقادر کے رسالہ مخزن میں مضامین لکھنے لگے۔ اس کے اگست کے شمارے میں حکیم خاقانی کی سوانح حیات بیان کرتے ہوئے ایک مضمون لکھا اور مئی ۱۹۰۲ء کے شمارے میں اخبارات کا تعارف ان کی شروعات اقسام اور افادیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک مضمون ''اخبار اور اس کے فائدے'' کے عنوان سے سپردِ قلم کیا۔ اس دور میں مولانا کا زاویۂ نگاہ مذہبی معاملات میں مشورے دینے کا تھا۔ اس وقت نیا نیا جوش تھا، ولولہ تھا، لہٰذا جو کچھ سمجھ میں آتا تھا اسے قلم برداشتہ لکھ دیتے تھے۔ اسی دوران انھوں نے کلکتہ کا محرم دیکھ کر محسوس کیا کہ تعزیے اور علم اٹھانے کی رسموں سے دوسروں کی نظر میں اسلام کے لیے تضحیک و غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، اس لیے ان کی طبیعت میں سرے سے مسلمانوں کے موجودہ عقائد و اعمال کی طرف سے بے میلی پیدا ہو گئی تھی(۱۳۰)۔ یہ سب سوچ کر انھوں نے ''احسن الاخبار'' میں ''اسلام اور محرم'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس میں انھوں نے لکھا کہ محرم کی تمام بدعات رومن کیتھولک عیسائیوں اور بت پرست قوموں سے لی گئی ہیں اور ان کے کرنے والے اپنے تئیں اسلام کی

خالص روح سے بالکل تہی کر دیتے ہیں (۱۳۱)۔ اس مضمون کے چھپتے ہی کلکتہ کے ایرانیوں اور شیعہ فرقے کے لوگوں میں اتنا طوفان مچا کہ مولانا کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا لیکن مولانا آزاد کے والد کی ثالثی سے معاملہ رفع دفع ہو گیا (۱۳۳)۔ احسن الاخبار بند ہو چکا تھا۔ چنانچہ اسی زمانے میں اس کے مالک مولوی احمد حسن نے ایک اخبار "تحفۂ محمدیہ" کے نام سے کلکتہ سے جاری کیا۔ اس کے جاری کرنے میں مولانا آزاد سے رائے مشورہ لیا گیا تھا۔ ان کے مشورے سے ہی اسے مذہبی کے ساتھ ساتھ ادبی شکل بھی دی گئی اور تحریر کی ذمہ داری مولانا آزاد پر ہی ڈالی گئی (۱۳۳)۔

مولانا آزاد اپنی تحریروں کے ذریعہ سے مذہب اسلام کو عقیدوں کے ساتھ منطق کی کسوٹی پر بھی کھرا اُترنے کے لائق بنانا چاہتے تھے۔ اپنے ابتدائی دور کے ایک مضمون میں جو یکم جون ۱۹۰۲ء میں احسن الاخبار میں شائع ہوا تھا، لکھا تھا کہ جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے اور اسلام کو عقل کے موافق کر دیا جائے (۱۳۴)۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مغربی علوم کی نشر و اشاعت پورے ہندوستان میں کی جائے، لیکن وہ اس کے نقصانات بھی جانتے تھے کہ اس سے دہریت و لامذہبیت پھیل رہی ہے لہٰذا وہ قبل ہی اس مسئلے کو حل کر لینا چاہتے تھے۔ اسی خیال سے انھوں نے ہردوئی سے نکلنے والے اخبار "مرقع عالم" میں "علوم جدیدہ اور اسلام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا (۱۳۵)۔ مولانا تراجم کے ذریعہ سے انگریزی تعلیم کو جو نوکری پانے کا ایک ذریعہ بن کر رہ گئی تھی، اس سطح سے اٹھا کر حصول علم کے ذرائع کی شکل میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے جریدے "لسان الصدق" میں اردو کی ترقی پر خصوصی توجہ دی تھی۔ اس کے اپریل ۱۹۰۴ء کے شمارے میں انھوں نے لکھا تھا کہ کلکتہ میں جہاں ایک عمدہ اخبار، ایک عمدہ رسالہ، ایک عمدہ انجمن کی کمی ہے وہاں سب سے زیادہ قابل افسوس کسی اردو پریس کا نہ ہونا ہے (۱۳۶)۔ مولانا اس کے ساتھ ہی ملکی ضرورتوں سے بھی واقف تھے۔ ان کا بنیادی مقصد ملکی مسائل کی جانب عوام کی توجہ مبذول کرانی تھی۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسا علمی رسالہ نکالا جائے جو ملک کی ضرورتوں پر نظر رکھ کر خاص مقاصد پر اپنی توجہ زیادہ مبذول رکھے (۱۳۷)۔ بنگال کے مسلمانوں کا فکری زوال دیکھ کر انھیں دُکھ ہوتا تھا اور اسے دور کرنے کے لیے وہ فکرمند رہتے تھے۔ اپنے جریدے "لسان الصدق" کے توسط سے انھوں نے یہ زوال دور کرنے کے

لیے کوششیں بھی کی تھیں۔ جنوری ۱۹۰۵ء سے انھوں نے جریدے کے مقاصد میں اصلاحِ خیالات کو شامل کرنے اور مذہبی مضامین کے لیے اس میں جگہ محفوظ کرنے کا عہد کیا تھا (۱۳۸)۔ عوام کی دلچسپی کے گرتے معیار کو اٹھانے اور لوگوں میں ادبی رجحان پیدا کرنے اور اس خیال سے اچھی کتابیں مہیا کرانے کے لیے انھوں نے ایک ادارہ قائم کرنے کا عزم کیا تھا۔ ساتھ ہی ادبی کتابوں کا علم عوام الناس تک پہنچانے کے لیے ادبی کتب کا ریویو کرے، کی غرض سے انھوں نے "لسان الصدق" کے علاوہ ۲۰ر جون ۱۹۰۵ء سے اس کا ضمیمہ "ریویو" کے نام سے نکالنے کا فیصلہ بھی کیا تھا (۱۳۹)۔

مولانا اپنی تحریروں کو نہ صرف یہ کہ ادب پسند اذہان کی درماندگی دور کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے بلکہ وہ جس لادینیت و دہریت کے خطرے سے پریشانی محسوس کرتے تھے اس کے تدارک کے لیے انھیں تحریروں کے ذریعہ وہ غلط قسم کے مذہبی نظریات میں بھی تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک مضمون میں انھوں نے لکھا کہ زمانے کے حالات بدل گئے اور تعلقات نے دوسری صورت اختیار کر لی۔ اس زمانے میں وہ خطبے کیوں کر مفید ہوسکتے ہیں جو اب سے سو پچاس برس پیشتر ضرورتوں کے موافق قدما نے ترتیب دیے تھے (۱۴۰)۔ مولانا مذہب جیسے نازک موضوع پر بھی بے خوف ہو کر تبصرہ کرتے تھے۔ اسلام کی صحیح صورت کو بگاڑنے کے لیے وہ علما کو مجرم مانتے تھے۔ ان کو اس کا افسوس تھا کہ اسلام میں ایسے علما بھی پائے جاتے ہیں جو اس کی تعلیم میں تحریف کر دیتے ہیں اور اس کی خوشنما شکل کو بگاڑ دیتے ہیں نیز خرافات باتیں اس میں پیدا کر دیتے ہیں جو درحقیقت اس میں نہیں ہے (۱۴۱)۔

۱۹۰۵ء کے اکتوبر کے الندوہ میں ان کا مضمون "مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ" اور فروری ۱۹۰۶ء کے شمارے میں "القضا فی الاسلام" کے عنوان سے دوسرا مضمون شائع ہوا۔ ویسے فروری کا پورا شمارہ ہی مولانا آزاد کی تحریری صلاحیت کا ثبوت تھا (۱۴۲)۔ مارچ ۱۹۰۶ء کے الندوہ میں انھوں نے یورپ میں سائنسی ترقی کی رفتار کی تعریف کرتے ہوئے "یورپ میں گونگوں کی تعلیم" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب ہم تعجب کے لہجے میں کہا کرتے تھے کہ کیا گونگا بھی بول سکتا ہے؟ مگر آج ان کے علوم کی ترقی اور انسان کی حریت اور یورپ کی علمی فیاضی نے ایسے واقعات

پیش کر دیے ہیں کہ آج ہم بیانِ واقعہ کے لہجے میں کہتے ہیں کہ گونگے بھی بول سکتے ہیں(۱۴۳)۔ ۱۹۰۸ء میں شمس بنگال کے دسمبر کے شمارے میں انھوں نے تعلیم اور اتالیقی پر ''اورنگ زیب کا لکچر ایک یورپین سیاح کی زبانی'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا(۱۴۴)۔ ان کے سبھی مضامین کا اہم مقصد سماج کو مذہبی بنیادوں پر مستحکم کرتے ہوئے آگے بڑھانا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں ''الندوہ'' کے اپریل کے شمارے میں انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے واضح طور پر لکھا کہ ہمارے زوال کے اسباب کی کھوج کرنے پر صرف یہ وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے سماج کو صحیح طریقے سے چلانے والوں کی کمی ہے(۱۴۵)۔ ان سب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے مضامین کا مقصد اسلام کے عروج اور مسلمانوں کی تعلیم نیز ادب کے تعلق سے عدم دلچسپی کو دور کرنا تھا۔

مولانا آزاد یوں تو آٹھ نو سال کی عمر میں اپنے گھر کے دیوان خانے میں ہی والد کے شاگردوں کے ذریعہ اپنے شکوک وشبہات دور کرنے کے لیے عام طور سے پوچھے جانے والے مذہبی سوالات کے جواب کی صورت میں تقریر کرنے لگے تھے اور دو دو گھنٹے تک لگاتار بولتے رہتے تھے۔ یہ ساری تقریر مولانا کی اپنی نظر میں بکواس لیکن دوسروں کی نظر میں وعظ ہوتا تھا (۱۴۶)۔ فی الحقیقت کسی جلسے میں تقریر کرنے کا سب سے پہلا موقع انھیں کڑایا کی انجمن انیس الاسلام کے سالانہ جلسے میں حاصل ہوا تھا۔ یہاں ان کی تقریر سے متاثر ہو کر منتظمین نے صرف مولانا کی تقریر سننے کا انتظام کیا اور انھیں دعوت دی کہ آٹھ دنوں بعد مذہب کے موضوع پر باقاعدہ تقریر کریں۔ مقررہ وقت پر انھوں نے کئی وکیلوں اور پڑھے لکھے معزز لوگوں کی موجودگی میں ''مذہب کی ضرورت'' کے عنوان پر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک نہایت پُر اثر تقریر کی (۱۴۷)۔ مولانا کو اس وقت کے مشہور اسلامی ادارے علی گڑھ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور لاہور کی انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسوں کے ڈائس سے تقریر کرنے کی خواہش ہوتی تھی (۱۴۸)۔ ان اداروں کی تقریبات کے پیش نظر انھوں نے گیارہ سال کی عمر سے ہی دلچسپی لینا شروع کر دی تھی لیکن ایک مقرر کی حیثیت سے کسی بڑے جلسے میں تقریر کرنے کا موقع انھیں ۱۹۰۵ء میں انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسے میں حاصل ہوا(۱۴۹)۔ اس میں حصہ لینے وہ والد سے چھپ کر اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ گئے تھے(۱۵۰)۔ اس جلسے میں مولانا آزاد کو ''لسان الصدق'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بطور

خاص مدعو کیا گیا تھا۔ ۲۳؍ اپریل کی شام کو اس میں مولانا آزاد نے ''مذہب کی عقلی بنیاد'' کے موضوع پر پُر اثر تقریر کی۔ اس تقریر کے نتیجے میں انھیں مولانا مان لیا گیا(۱۵۱)۔ اس وقت ان کی عمر محض ۱۷ سال تھی۔ مولانا آزاد کی تقریر سے لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ پنجاب کے کئی شہروں سے لوگ انھیں لینے کے لیے آگئے اور انھوں نے امرت سر، جالندھر اور ہوشیار پور وغیرہ مقامات کا دورہ کیا اور مذہبی اسٹیج سے تقاریر کیے(۱۵۲)۔ اس کے بعد مولانا کو انجمن حمایت الاسلام اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے جلسوں میں بلایا جانے لگا۔ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں علی گڑھ کا دورہ کیا تھا(۱۵۳)۔

مولانا وقت کے تقاضے کو سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مذہبی حلقے میں انھیں مولانا مان لیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں اب مولانا سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے لیکن یہ دلچسپی بھی مذہبی نقطۂ نظر سے ہی تھی۔ وہ مسلمانوں کی علمی ترقی چاہتے تھے مگر مسلمانوں کی تعلیم پر کسی طور بھی غیر مذہب والوں کی حکومت کا عمل دخل انھیں پسند نہیں تھا۔ بسلسلۂ خطبات انھوں نے ۱۹۱۲ء کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے لکھنؤ اجلاس میں اس بات کی مخالفت میں تقریر کی تھی کہ مسلم یونیورسٹی گورنمنٹ کے ذریعے پیش کی گئی شرطوں پر منظور کر لی جائے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ تعلیم، جس کی بنیاد محض حکومت کی مخصوص ضرورتوں کے لیے پڑی ہو وہ کسی سماج کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی(۱۵۴)۔ اس لیے لکھنؤ کے قیصر باغ کی بارہ دری میں منعقد اس جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ تعلیمی انتظامات کے اس قدر جوش وخروش اور ہنگامے کے بعد یونیورسٹی کی قسمت پھر چند شخصیتوں کے ہاتھ میں دے دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ قوم کو اب اپنی قسمت کے فیصلے کے لیے کسی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے(۱۵۵)۔ جلسے کے منتظم نہیں چاہتے تھے کہ سرکار کی مخالفت کی جائے لہٰذا وہ مولانا کو تقریر کے لیے وقت دینا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن عوام کے ذریعہ مولانا آزاد کی تقریر سننے کے اصرار پر وہ مجبور ہو گئے اور مولانا نے منتظمین کی خواہش کے برخلاف جلسے سے خطاب کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے دیکھتے جلسے کا رُخ پلٹ گیا اور یہی تجویز پاس ہوئی کہ سرکاری شرطوں پر یونیورسٹی کا قیام منظور نہ کیا جائے(۱۵۶)۔ مولانا کے مذہبی خیالات والی تقاریر عوام پر بڑا گہرا اثر چھوڑتی تھی۔ انگریزوں کے ذریعہ ترکی کے عیسائیوں پر ڈھائے جا رہے مظالم کی مخالفت میں جب انھوں نے کلکتہ کی ہالی ڈے اسٹریٹ میں ایک تقریر کی تھی تو اس

میں انھوں نے عوام سے مدد کی اپیل بھی کی تھی۔ نتیجتاً وہیں پر تقریباً تیس ہزار روپیہ جمع ہو گیا تھا اور شہر میں ترکی کی مدد کے لیے چندہ مانگتے وقت عورتوں نے مکانوں کی کھڑکیوں سے زیور پھینک پھینک کر ان کی اپیل کا جواب دیا تھا (۱۵۷)۔

غیر ملکی سفر اور واپسی

مولانا آزاد نے اپنی زندگی میں تین بار غیر ملکی سفر کیے تھے ان کا یہ سفر دو مرتبہ ہندوستان کی آزادی سے قبل اور ایک مرتبہ آزادی کے بعد ہوا تھا۔ ان کا پہلا غیر ملکی سفر ۱۹۰۵ء میں ہوا تھا۔ خود بقول مولانا ۱۹۰۴ء میں ایسے حالات پیش آگئے کہ وہ عراق چلے گئے اور پھر کوئی نمبر ''لسان الصدق'' کا نہیں نکلا'' (۱۵۸)۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کیوں کہ ''لسان الصدق'' کا آخری شمارہ اپریل۔مئی ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا تھا، اس طرح ۱۹۰۴ء میں مولانا کے عراق جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کا پہلا غیر ملکی سفر ۱۹۰۵ء میں ہی ہوا تھا اور اسی سفر کے دوران مکہ میں ان کی ملاقات مولوی محمد صدیق سندھی سے ہوئی تھی، جو پہلے کلکتہ میں رہتے تھے (۱۵۹)۔ سال کے آخر تک وہ بھارت واپس لوٹ آئے تھے کیوں کہ اس سفر سے لوٹنے کے بعد ہی مولانا شبلی نعمانی کی گزارش پر انھوں نے ''الندوہ'' کے ادارت کی ذمہ داری سنبھالی تھی (۱۶۰)۔ مولانا کا دوسرا غیر ملکی سفر اس وقت ہوا جب بنگال میں ''بنگ بھنگ'' کے خلاف نہایت سخت آندولن چل رہا تھا۔ یہ سفر ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا (۱۶۱)۔ اس سفر سے مولانا آزاد کا نقطۂ نظر قومی تحریک کے معاملے میں اور زیادہ وسیع ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب بنگال کے چھوٹے چھوٹے بچے ''وندے ماترم'' گیت گانے کی پاداش میں سزائیں بھگت رہے تھے لیکن بنگالی مسلمان اندرون ملک چل رہی سیاسی کشمکش سے الگ رہنے کو اپنے لیے فائدہ مند سمجھ رہے تھے (۱۶۲)۔ پورے بنگال میں تھوڑے سے مسلمان ہی قومی تحریک کا ساتھ دے رہے تھے۔ ان میں ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ کے بھائی اکات اللہ بہادر، اسماعیل شیرازی، لیاقت حسین، مولوی عبد القاسم، ابوالحسین، دیدار بخش جیسے لیڈروں نے قومی آندولن کو اپنا لیا تھا (۱۶۳)۔ ایسے وقت میں مولانا آزاد نے مصر، عراق، سیریا اور ترکی کے سفر کے دوران عراق کے انقلابیوں سے ملاقات کی تھی۔ مصر میں مصطفےٰ کمال پاشا کے پیروکاروں سے بھی ان کی ملاقات ہوئی اور ترکی میں ''ینگ ترک''

تحریک کے لیڈران سے بھی ان کی دوستی ہوئی۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد بھی کئی سال تک ان لوگوں سے مولانا کی خط و کتابت ہوتی رہی (۱۶۴)۔ شیخ محمد عبدہ، شیخ جمال الدین افغانی کے پیروکاروں سے بھی اس سفر میں ان کی ملاقات ہوئی تھی (۱۶۵)۔ اس سفر میں مولانا کا ارادہ انگلینڈ اور وہاں سے یورپ جانے کا تھا لیکن والد کی علالت کے سبب انھیں جلد ہی اپنے سفر کو پیرس میں ہی ختم کر کے ہندوستان واپس لوٹنا پڑا (۱۶۶)۔

مولانا آزاد مسلم ملکوں کی قومی تحریکوں سے بڑے متاثر ہوئے تھے۔ ان غیر ملکی دوروں کے بعد انھیں مکمل یقین ہو گیا تھا کہ ملک کی جنگ آزادی میں ہندوستانی مسلمانوں کو پورا پورا تعاون دینا چاہیے۔ اس کے لیے انھوں نے ہندوستان لوٹنے کے بعد اور زیادہ لگن سے کام کرنے کا فیصلہ کیا (۱۶۷)۔ اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مولانا آزاد نے ایک طرف علی گڑھ اسکول کی مخالفت کرنے کا تہیہ کیا اور دوسری جانب انگریز پرستی کے جذبے کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کو اپنا مقصد بنایا نیز آگے چل کر اس کام کے لیے اپنی ساری قوت لگا دی (۱۶۸)۔

خلاصہ

پیدائش سے لے کر چوبیس سال کی عمر تک مولانا آزاد کی شخصیت میں ایک مخصوص صلاحیت کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ صرف گیارہ سال کی کچی عمر میں ہی انھوں نے اتنا علم اور عزت حاصل کر لی تھی کہ وہ اس وقت کے شہرت یافتہ مولانا علامہ شبلی نعمانی سے خط و کتابت کرنے لگے تھے (۱۶۹)۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخ انجمن ترقی اردو کے سلسلے میں مولانا آزاد کے خط و کتابت سے ہی متاثر ہو کر انھوں نے مولانا آزاد کو ''لسان الصدق'' کی اشاعت کے بعد اس ادارے کی مجلس منتظمہ کا رکن منتخب کیا تھا۔ بعد میں انجمن ترقی اردو نے مولانا کی سوجھ بوجھ، جذبۂ ترقیٔ اردو اور اصلاحِ رسوم کے مقاصد کو دیکھ کر ''لسان الصدق'' کی اشاعت کے تھوڑے دن بعد ہی اسے اپنا ترجمان بنا لیا تھا (۱۷۰)۔ ''لسان الصدق'' کی اشاعت کے وقت مولانا کی عمر محض پندرہ سال تھی۔ ان کی اس وقت کی علمی صلاحیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے اخبارات کی رائے یہ تھی کہ ''لسان الصدق'' ایک بڑے بزرگ، کہنہ مشق اہل قلم کی ادارت میں جاری ہوا ہے جو عرصے سے

اخبارات و رسائل میں مضمون نویسی کرتا رہا ہے(۱۷۱)۔ ان کی اس کم عمری میں ہی اتنی زیادہ صلاحیتوں کے پیش نظر مولانا الطاف حسین حالی نے انجمن حمایت الاسلام لاہور کے ۱۹۰۵ء میں منعقدہ جلسے میں یہ یقین نہیں کیا تھا کہ یہ کم عمر لڑکا ہی اس جریدے کا ایڈیٹر ہے(۱۷۲)۔ مولانا شبلی نعمانی کو تو مولانا آزاد کی اہلیت سے متاثر ہو کر یہ کہنا پڑا تھا کہ تمھارا ذہن و دماغ عجائب روزگار میں سے ہے۔ تمھیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بطور عجوبہ پیش کرنا چاہیے(۱۷۳)۔ اسی اہلیت و قابلیت کی وجہ کر آگے چل کر مسز سروجنی نائیڈو نے کہا تھا کہ مولانا کی عمر کی بات مت کرو جب وہ پیدا ہوئے تھے تب پچاس سال کے تھے(۱۷۴)۔

مولانا کی بے نظیر صلاحیت و ذہانت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے تیرہ سال سے اٹھارہ سال کی عمر تک مسلم قانون پر ''اعلان الحق''، صوفیت پر تبصرہ کرتے ہوئے ''احسن المسالک''، شاعری کا ایک دیوان، مشہور شاعر عمر خیام کی زندگی کی تصویر کشی، فارسی شاعر خاقانی کی سوانح حیات، سائنس کی ایکسرے تکنیک پر ''ضوء غیر مرئی''، اسلام اور جدید سائنس کے تقابلی مطالعے پر ''العلوم الجدیدہ والاسلام''، مذہب اسلام میں عورتوں کے مقام پر ''الامراۃ المسلمہ''، مسلم ہیئت پر ''الہیئت''، اسلام کے معتزلہ فرقے پر ''المعتزلہ''، مادّی دنیا اور جذبۂ عشق کے اصولی اتحاد پر ''کشش مادّہ اور کشش عشق''، اسلام کے اصول وحدانیت اور دنیا کے دیگر مذاہب میں یکسانیت پر ''اسلامی توحید اور مذاہب عالم''، شاعری سے متعلق ''چہار مقالہ'' اور ایک دوسری کتاب ''فرہنگ جدید'' جیسی کتابیں لکھی تھیں(۱۷۵)۔ ''لسان الصدق'' کے زمانے میں انھوں نے اس وقت کے مشہور عالم خواجہ الطاف حسین حالی کی کتاب حیات جاوید پر تنقید کرتے ہوئے ایک کتاب تصنیف کی تھی، جسے دیکھ کر لوگوں میں مولانا کے علمی لیاقت کی دھوم مچ گئی۔ اس کتاب کی وجہ کر خود حالی نے مولانا آزاد کی تعریف کی تھی(۱۷۶)۔ اٹھارہ سال کی عمر میں انھوں نے حیات سرمد لکھی تھی، جس کی تعریف کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی نے کہا تھا کہ یہ مقاماتِ درویشی پر ایک مستانہ اور البیلا خطبہ ہے(۱۷۷)۔

اٹھارہ سال کی عمر کے بعد انھوں نے ڈارون کا نظریۂ ارتقاء و قرآن، احرار اسلام، تاریخ دعوتِ اسلام، تفسیر البیان فی المقاصد القرآن وغیرہ کتابیں لکھیں۔ ان کی مشہور زمانہ تفسیر ترجمان القرآن چوبیس پچیس سال کے عمر کی ہی تصنیف ہے(۱۷۸)۔ اس نے مذہب

اسلام کی ایک ایسی تصویر دنیا کے سامنے پیش کی جو اسلام کو منطق کی کسوٹی پر صحیح ثابت کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو بھی قرآن کا علم حاصل کرنے میں آسانی پیدا کرتا ہے۔ مذہبی علم کی وسعت نیز سنجیدہ ادبی مذاق کی وجہ کر ہی سترہ اٹھارہ سال کی چھوٹی عمر میں نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، خلیفہ محمد حسین پٹیالہ والے، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ خاں، حکیم محمد اجمل خاں وغیرہ سے ان کی دوستی ہو گئی تھی اور سب سے برابری کی سطح پر ملاقات و بات چیت ہوتی تھی۔ اپنی وسیع مذہبی و ادبی معلومات کی وجہ سے ہی نواب صدر یار جنگ جن کے نام غبار خاطر کے بھی خطوط لکھے گئے ہیں، سے ان کی دوستی ہوئی تھی(۱۷۹)۔

اس زمانے میں مولانا کی بے مثال و لاثانی خوبیوں کے ظاہر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے مستقبل کے پروگرام نیز افکار و نظریات واضح طور پر اُبھر کر سامنے آنے لگتے ہیں اور آگے چل کر ۱۹۱۲ء میں الہلال کی اشاعت سے ان کی فکر اور سمت دونوں ہی پوری طرح کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

*****

(۳)

سیاست میں داخلہ

(۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۰ء)

مولانا آزاد کا بچپن میدان علم و ادب میں ہونے والی جدید تبدیلیوں، سماجی و سیاسی نظریات کی نئی تحریکوں اور مذہبی حلقوں کے نئے اقدار کے درمیان گزرا تھا۔ میدان علم میں سرسید احمد خاں انگریزی تعلیم کی تشہیر کرنے کے لیے نئی راہیں دکھا چکے تھے۔ سیاسی میدان میں تقسیم بنگال اور مسلم لیگ کے قیام سے ایک انقلابی کشمکش کا آغاز ہو چکا تھا نیز مذہبی میدان میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کے قیام سے مذہب اسلام میں دور جدید کے ساتھ تقابل اور مطابقت کے لیے علماء کی تربیت کا انقلابی کام شمس العلماء شبلی نعمانی شروع کر چکے تھے۔ انھیں حالات میں مولانا آزاد صحافت کی وساطت سے سماجی و مذہبی زندگی میں داخل ہوئے تھے اور نئے نئے تجربات حاصل کر رہے تھے۔ یہی وہ دور ہے جب مولانا آزاد پر سرسید احمد خاں کا اثر کافی حد تک چھایا ہوا تھا۔ یہ اثر مولانا کی مستقبل میں ترقی کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا۔ الہلال کی اشاعت سے پہلے سرسید احمد خاں کا اثر مولانا آزاد پر سے ختم ہو چکا تھا۔ الہلال پر اظہارِ خیال سے پہلے سرسید احمد خاں اور مولانا آزاد کے نظریاتی فرق کو جان لینا ضروری ہے۔

سرسید احمد خاں اور مولانا آزاد کے نظریات

اپنی زندگی کے پہلے پندرہ سولہ برسوں تک مولانا آزاد سرسید احمد خاں سے بیحد متاثر تھے۔ خود انھیں کے الفاظ میں ''جب قدیم خیالات و عقائد سے دل برداشتہ ہو چکا تھا تو سرسید احمد خاں مرحوم کی تعلیمات نے ایک نئی دنیا میں پہنچا دیا تھا(۱)۔ سرسید کے مضامین

سے انھوں نے کسی بھی معاملے میں کوری تقلید نہ کرنے کا سبق حاصل کیا تھا۔ وہ خود قبول کرتے ہیں کہ میں نے سرسید سے بڑی چیز جو اس وقت پائی وہ ترک تقلید تھی(۲)۔ یہ اثر اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ سرسید احمد خاں کی عظمت ان کے دل کے ریشے ریشے میں رَچ بس گئی تھی اور وہ فقہ اسلامی اور ان کے اصول و عقائد کو ماننا بھی کوری تقلید سمجھنے لگے تھے۔ ہر جدید افکار و ترقی انھیں سرسید احمد خاں کی ہی وجہ سے ہوئی، لگتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ملک میں قوم کے جتنے بھی مدرسے و انجمن ہیں وہ سب سرسید کی ہی دَین ہیں(۳)۔ انھی گہرے اثرات کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۰۴ء میں بمبئی کی تنظیم محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے احمد آباد اجلاس میں اردو تعلیم کی ترقی کے لیے سرسید احمد خاں کی جگہ پر نواب زادہ نصر اللہ خاں کو اہمیت دیے جانے کی انھوں نے سخت تنقید کی تھی(۴)۔ مولانا آزاد کی ذہنی بے چینی نے انھیں صرف سرسید احمد خاں کے نظریات تک ہی رُک جانے کے لیے نہیں چھوڑ دیا۔ سرسید احمد کے نظریات کی تائید کا یہ نقشہ صرف سال بھر رہا(۵)۔ شیخ محمد عبدہ، مولانا شبلی نعمانی و نواب محسن الملک کے نظریات سے متعارف ہونے پر ان کا زاویۂ نظر بدلنے لگا اور وہ سرسید احمد خاں کی کورانہ تقلید چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ انھیں جب یہ محسوس ہوا کہ سرسید کے ذریعہ چلائی گئی علی گڑھ تحریک کی وجہ کر ہی مسلمان ''بنگ بھنگ'' مخالف یا دیگر سیاسی تحریکوں میں حصہ نہیں لے رہے ہیں تو انھوں نے سرسید کے راستے کو چھوڑ کر انگریزوں کے افتخار کو للکارتے ہوئے بے خوف اسلامی قومیت کی بات کہنی شروع کر دی(۶)۔

مصر کے سفر سے جو نظریے مولانا کے ذہن میں پختہ ہو رہے تھے وہ اب کھل کر ظاہر ہونے لگے۔ مولانا مصر کے رہنے والے محمد عبدہ اور ان کے شاگرد جمال الدین افغانی کے جذبۂ حب الوطنی سے متعارف و متاثر ہو چکے تھے اور انھوں نے مصر میں آزادی کی ایک جھلک دیکھ لی تھی اسی لیے وہ علی گڑھ کے ان نظریات کی تائید نہ کر سکے جن میں انگلستان کی وفاداری بھی لازمی شرط کے طور پر شامل تھی۔ ان کا یہ یقین پختہ ہو گیا تھا کہ بھارت کے مسلمان جو ملک کی سیاسی تحریکوں سے الگ کھڑے تھے اور ملک کی جدوجہد آزادی کی مخالفت کر رہے تھے، انھیں اس سے جوڑنا ضروری ہے، لہٰذا انھوں نے اپنی پوری طاقت سے سرسید کے نظریات کے خلاف کام کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۱۲ء سے یہ بات پوری طرح کھل کر الہلال میں سامنے آگئی۔ مولانا آزاد جہاں پہلے سرسید کی بات ہی ٹھیک سمجھتے تھے

وہاں انھیں اب یہ کہنا پڑا کہ مسلمانوں کے ذریعہ ملکی جدو جہد آزادی کی مخالفت کرنے کی واحد وجہ سرسید احمد خاں کی لیڈرشپ تھی (۷)۔ واضح رہے کہ مولانا آزاد مذہب اور سیاست کو ایک ہی سکے کے دو پہلو مانتے تھے۔ ان کی نظر میں جذبۂ قومیت مسلمانوں کے لیے ایک مذہبی فریضہ تھا (۸)۔

اس کا مطلب واضح ہے کہ وہ سرسید کے ہندو مسلم اتحاد کے نظریے، جس میں وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو بھارت کی دو آنکھوں کی طرح مانتے تھے اور دونوں ہی فرقوں کو ہندو کا نام دیتے تھے (۹)، سے تو متفق تھے لیکن ان کے مسلمانوں کو سیاسی میدان میں ہندو مخالف اور انگریز موافق راستے کی طرف لے جانے والی علی گڑھ تحریک سے وہ کبھی متفق نہیں ہو سکے۔ لہٰذا انھوں نے تحریک علی گڑھ کی کھلے طور پر تنقید کرنا شروع کر دی تھی۔ ان کے سخت مخالفانہ لہجے سے علی گڑھ مکتب فکر کی یہ سوچ ہی ختم ہو گئی کہ مسلم ہندوستان جو بات کل سوچے گا وہی علی گڑھ آج سوچتا ہے (۱۰)۔ یعنی علی گڑھ کا انداز فکر ہی سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا انداز فکر بن جاتا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں کانگریس کے کراچی اجلاس پر اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ وہ زمانہ گیا جب انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے مسلمان کانپ اٹھتے تھے اور ڈرتے تھے کہ علی گڑھ کی برادری حقہ پانی بند نہ کر دے۔ قومی اصطلاحات کی فرہنگ میں کسی مسلمان کے لیے سب سے بڑی گالی یہ تھی کہ اسے کانگریسی کہہ دیا جائے (۱۱)۔ سرسید احمد خاں کی تنقید کرتے ہوئے انھوں نے صاف طور پر لکھا ہے کہ سرسید مرحوم نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس صرف اس خیال سے قائم کی تھی کہ انڈین نیشنل کانگریس کے مقابلے میں ایک ایسا مجمع مہیا کر دیا جائے جو انھیں تاریخوں میں منعقد ہو جن میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوتا ہے اور اس طرح مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت سے روکا جائے (۱۲)۔

مصر کے عالم جناب رشید رضا کے اثرات نے مولانا آزاد پر سے سرسید احمد کا اثر دور کرنے میں بڑا کام کیا (۱۳)۔ مولانا آزاد سرسید احمد خاں کے نظریات سے اتنا دور ہو گئے کہ ان کا نظریہ بالکل سرسید احمد خاں کے برعکس ہو گیا۔ وہ ماننے لگے کہ سرسید کی علی گڑھ تحریک مقامی سطح کی ہے جب کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے ایک بین الاقوامی تحریک کی ضرورت ہے، اس لیے وہ آگے چل کر مولانا شبلی کی طرح بین الاسلامیت کی تائید کرنے

لگے (۱۴)۔

الہلال کی اشاعت

۱۹۱۲ء کا سال مولانا آزاد کی زندگی کا ایک فیصلہ کن سال رہا ہے۔ اس سال سے انھوں نے مسلم سماج کے لیے ایک ایسا پیغام دینا شروع کیا جس نے آگے چل کر ملک کے قومی نظریے کی ترقی میں متاثر کن رول ادا کیا اور وہ تھا ''الہلال'' نامی باتصویر ہفتہ وار کی اشاعت کا آغاز۔

''لسان الصدق'' کی اشاعت بند ہونے کے بعد انھوں نے ''الندوہ'' اور ''وکیل'' کی ادارت کی ذمہ داری قبول کر لی تھی لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں تھے اور اپنا ایک آزاد پرچہ نکالنا چاہتے تھے۔ اپنی اس بے چینی کا ذکر واضح طور پر انھوں نے ''الہلال'' کے پہلے شمارے میں کیا ہے کہ ۱۹۰۶ء کے سردی کے موسم کی آخری راتیں تھیں جب امرت سر سے میری چشم بیدار نے ایک خواب دیکھا تھا۔ کامل چھ سال اسی کی تعبیر کی عشق آمیز جستجو میں صرف ہو گئے۔ امیدوں کی خلش اور ولولوں کی سوزش نے ہمیشہ مضطرب رکھا یہاں تک کہ آج اس خواب عزیز کی تعبیر عالم وجود میں پیش نظر ہے (۱۵)۔

مولانا ۱۹۱۱ء میں ہی اس کی اشاعت شروع کرنا چاہتے تھے لیکن پریس کے انتظام میں مشکل ہونے کی وجہ کر ایسا ممکن نہ ہو سکا تھا (۱۶)۔ بالآخر ان کے والد کے دوست کے لڑکے اور کلکتہ کی سندریا پٹی کی مسجد کے متولی، کلکتہ کے ہی باشندے حاجی نور محمد زکریا کی نگرانی اور مالی تعاون سے ''الہلال'' کی اشاعت شروع ہوئی (۱۷)۔

''الہلال'' کی اشاعت شروع کرنے سے پہلے اس کا نام ''ملک و ملت'' یا ''وقت'' رکھنے پر غور و خوض کیا گیا تھا لیکن مولانا شبلی نعمانی کو پسند نہیں آنے کی وجہ کر ان میں سے کوئی نام نہیں رکھا جا سکا۔ آخرکار اسے ''الہلال'' کے نام سے شائع کیا گیا (۱۸)۔ یہ ہفتہ وار جمعہ کو شائع ہوتا تھا۔ ''الہلال'' کے دفتر میں مولانا آزاد کے علاوہ تین اشخاص حامد علی صدیقی، مولانا عبداللہ عمادی اور مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا کے خاص معاونین تھے (۱۹)۔ ''الہلال'' کی بیرونی شکل و صورت اور نام مصری صحافت کے میدان میں مشہور اخبار ''الہلال'' سے مستعار تھے لیکن ''الہلال'' کے بنیادی مواد اس سے بالکل مختلف

تھے(۲۰)۔ اس کی وضع و ساخت پر مصری اخبار ''عروۃ الوثقیٰ'' کا بھی اثر پڑا(۲۱)۔

''الہلال'' کا پیغام

''الہلال'' مولانا آزاد کی قومی تحریک کے حوالے سے کیے گئے ایک طویل غور و فکر کا نتیجہ تھا۔ مصر و عراق کے سفر کے دوران انھیں اخبارات کی مؤثر نشری قوت کا احساس ہوا تھا۔ لہٰذا عراقی سفر سے لوٹ کر انھوں نے اس بارے میں غور کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ اپنے خیالات و نظریات عوام تک پہنچا کر رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کیا جانا چاہیے، اسی مقصد سے انھوں نے الہلال پریس قائم کیا(۲۲)۔ سرسید احمد کی طرح مولانا آزاد نے صحافت کی اہمیت کو سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا تھا۔ اس طرح ایک طویل عرصے سے مولانا آزاد جو ارادہ کر رہے تھے ان کو عمل میں لانے کی راہ پر انھوں نے اپنے قدم بڑھا دیے(۲۳)۔ اس سفر کے افتتاح کے طور پر جمعہ ۱۳/ جولائی ۱۹۱۲ء کو ''الہلال'' کا پہلا شمارہ شائع ہوا(۲۴)۔ اردو صحافت کے میدان میں یہ ایک انقلابی قدم تھا۔ اردو میں یہ ایک ایسا اخبار تھا جس میں سیاسی، سماجی، مذہبی سبھی طرح کے مضامین اور قارئین کے خطوط چھپتے تھے اور بیرون ملک اسلامی دنیا بالخصوص طرابلس کی جانکاری دینے والے مضامین کو خاص مقام دیا جاتا تھا۔ سماجی برائی کی طرف اشارہ کرنے والی کہانیاں مثلاً ''قمار باز'' نیز مذہبی واقعات پر مبنی مولانا آزاد کی لکھی کہانیاں جیسے حضرت محمد ﷺ کے ہم عصر لوگوں کے حالاتِ زندگی، سودہ بنت عمارہؓ، عروہ بنت الحارث کے واقعات بھی اس کے صفحات پر جگہ پاتے تھے(۲۵)۔ مارچ ۱۹۱۴ء میں رسم جہیز کی برائی پر ''شہید رسوم'' کے عنوان سے کہانی بھی چھپی تھی۔ اخبار کی عمدہ اور صاف چھپائی نیز دلکش طباعت کے ساتھ ساتھ اس میں اظہارِ جذبۂ قومیت کا پُر اثر لہجہ بھی کارفرما تھا۔

مولانا کے مذہبی اور سماجی کارنامے

مولانا آزاد نے مسلمانوں کی ترقی کے لیے جس زبردست و پُرزور تحریک کی ضرورت محسوس کی تھی اس کے لیے انھوں نے ''الہلال'' کو ایک ذریعۂ تشہیر کی شکل میں استعمال کیا۔ یہ تشہیر دو طرح کی تھی۔ اس کا ایک پہلو سماجی تھا اور دوسرا مذہبی۔ سماجی پہلو کے تحت انھوں نے تعلیم و تنظیم کا درس دیا تھا جب کہ مذہبی پہلو کی تشہیر کے تحت بین الاسلامیت کی

تائید کی تھی۔

علی گڑھ تحریک کے بدل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا آزاد نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو بے عمل بنا دیا ہے۔ بین الاسلامیت کو بڑھاوا دینا ہی ہمارا اصل مقصد ہے جو اسلام میں اصلاح و ترقی کی بنیاد ہے۔ اس کے لیے موجودہ دور سے اچھا موقع نہیں ملے گا۔ اس وقت کوئی مقامی یا ملکی تحریک مسلمانوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی، بھلے ہی علی گڑھ یونیورسٹی کا یہی خیال ہو۔ جب تک ساری اسلامی دنیا ایک بین الاقوامی اور عالمگیر دوستی کے سمجھوتے کے تحت نہیں آجاتی تب تک چھوٹے چھوٹے راستے چالیس کروڑ مسلمانوں کی مدد کیسے کر سکتے ہیں(۲۶)۔ وہ اس وقت مذہب اسلام میں اصلاح کے لیے چلنے والی تین طرح کی تحریکوں میں اپنے آپ کو روس کے شیخ صدر الدین، مصر کے شیخ محمد عبدہ اور شام کے شیخ عبدالرحمٰن کواکوی و شیخ کمال الدین کاسنی کے درجے میں مانتے تھے(۲۷)۔ مولانا آزاد کی نظر میں ان کے بنیادی اصول اس طرح تھے:

(۱) مسلم شرع میں اس دنیا اور آخرت میں کوئی فرق نہیں۔

(۲) قرآن و سنت کی پیروی کرنے سے ہی مسلمان خیرالامت کا مقام پا سکتے ہیں۔

(۳) خدا کے عطا کردہ علم میں اسلامی شرع آخری اور بالکل مکمل ہے۔

(۴) قرآن و حدیث کے غیر واضح ہونے پر صحیح راستے کی تلاش نہ کرنے اور مذہب کی باہری شکل و صورت کے ساتھ سمجھوتہ کر لینے سے ہی اسلام کا زوال ہوا۔

ان کا خیال تھا کہ جب اسلام اپنے آپ میں مکمل ہے تو پھر اس کے اندر سے ہی صحیح راستہ اپنانے کے لیے اصلاح کی ضرورت ہے، باہر سے کسی چیز کو لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اندر سے ہی اصلاح کیا جا سکتا ہے۔ کوئی نئی بات جوڑنے کی گنجائش نہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ایک امام ساری جماعت کی امامت کرے(۲۸)۔ مولانا آزاد نے اسلام کے زوال اور اس کے کرب کو محسوس کیا تھا۔ انھوں نے اسے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔ ''اسلام کا علاقہ برائے نام ایک قومی رشتہ سمجھا جاتا اور یہ بھی بہت سی طبیعتوں پر سخت شاق تھا۔ ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوان تھے جو مذہب اور مذہبیت کے ہر خیال کی تنقید کرنا اور اسے خلاف عقل و تہذیب بتلانا اپنا قابل فخر کارنامہ سمجھتے تھے''(۲۹)۔ ''الہلال'' میں انھوں نے لکھا تھا کہ آج ہر شخص جو قلم پکڑ سکتا ہے، شیخ الاسلام ہے۔ ہر انگریزی داں، ہر خطاب

یافتہ، ہر سکریٹری، ہر متولی حق رکھتا ہے کہ اپنے ہر القائے شیطانی کو تعلیم اسلامی قرار دے اور اپنے ہر ہیجان نفسانی کو اجتہاد دینی سے تعبیر کرے(۳۰)۔

مولانا آزاد مذہب کو بڑی گہرائی سے دیکھتے تھے۔ مذہب کی حالت اس کے رہنماؤں کی حالت اور فرائض بھی کچھ ان کی نظر میں رہتے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مذہبی رہنما فرائض سے پہلو تہی کر رہے ہیں تو انھوں نے سارے سماج کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تھی۔ انھیں کے لفظوں میں ''قوم کا سب سے زیادہ محترم طبقہ علماء و مشائخ کا ہے۔ لیکن اس جماعت کا وہ حال تھا کہ گویا اس کو مسلمانوں کی موت و حیات سے کوئی وابستگی نہیں۔ قوم کا جاہل سے جاہل، ادنیٰ سے ادنیٰ طبقہ بھی دنیا کے حالات اور مسلمانوں کے قومی زوال کی جتنی خبر رکھتا تھا اتنی بھی ہمارے دین و دنیا کے ان پیشواؤں کو نہ تھی۔ دنیا میں کیا انقلابات ہوئے ہیں، مسلمانانِ عالم پر کیا گزر رہی ہے، اُن کی قومی زندگی کس طرح مٹائی جا رہی ہے، خود ہندوستان میں ہمارا روز بروز کیا حال ہو رہا ہے؟ یہ تمام باتیں اس مقدس گروہ کے نزدیک دنیا اور دنیاداری کی باتیں تھیں۔ قوم قوم پکارنا اور مسلمانوں کے قومی وملکی حالات کی فکر کرنا اور اس کے لیے لوگوں میں تحریک پیدا کرنا بھی ان حضرات کے نزدیک نیچریت میں داخل تھا۔ اس سے ہر مسلمان کو پناہ مانگنا چاہیے''(۳۱)۔

اپنے اس تجربے کی بنیاد پر ہی وہ مانتے تھے کہ قومی زوال کی وجہ یہی ہے کہ عوام مذہب کی راہ سے بھٹک گئی اور گمراہ عوام کو راستہ دکھانے والا کوئی نہیں ہے۔ انھوں نے محمد عبدہ کے نظریات کی تائید کرتے ہوئے اپنے اخبار ''الہلال'' میں لکھا تھا کہ موجودہ حالات ترکِ کتاب وسنت اور پیغمبر کا نتیجہ ہے۔ علماء قوم کی روح ہیں۔ انھیں قوم کو شریعت کی اصلی وحقیقی تعلیم کی طرف بلانا چاہیے(۳۲)۔

مولانا کا خیال تھا کہ اصلاحِ دینی انجام نہیں پا سکتا جب تک قوم کو اسلام کی صحیح تعلیم نہیں دی جائے اور تمام طبقات امت کا جہل دینی دور نہ ہو(۳۳)۔

مولانا آزاد کی نظر میں اسلامی فرقے کی مشکلات کو دور کرنے کا طریقہ یہی تھا کہ تربیت یافتہ اور قابل علماء کو تیار کیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں — اس کا ذریعہ صرف علمائے کاملین وحق ہیں جو روز بروز ہم میں قلیل ومفقود ہوتے جا رہے ہیں اور جن کی قلت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم میں حیاتِ دینی کے نتائج وثمرات مفقود ہیں(۳۴)۔

مذہب کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وہ مولانا شبلی کے ندوۃ العلماء کی جانب دیکھتے تھے اور شبلی کے ذریعہ قائم کردہ لکھنؤ کے اس تعلیمی مرکز کو وہ مذہبی جہالت دور کرنے والا اور عالم طبقے کو صحیح تعلیم دینے والا ادارہ مانتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ بہت جلد اس عملی کام کی طرف متوجہ ہو گیا جو اصلاحِ دینی کی راہ کے تمام مواقع ومشکلات کو دور کرنے والی ہے(۳۵)۔

مولانا مانتے تھے کہ مسلمانوں کو جدیدیت کی طرف بھی دھیان دینا چاہیے نیز علماء کو مذہبی علوم تک ہی محدود نہ رہ کر موجودہ دنیا کی دیگر اقوام میں ہونے والی ترقی کی جانکاری بھی حاصل کرنی چاہیے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ انقلابی حالات نے ایسی ضرورتیں بھی پیدا کر دی ہیں جو کل تک نہ تھیں۔ ضروری ہے کہ علمائے حال ان سے بھی واقف ہوں(۳۶)۔

مسلم طبقے کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا سماجی زاویۂ نگاہ کوتاہ نہ ہو۔ اسی لیے وہ مذاہب کے پاکیزہ کردار کے ذریعہ کشادہ ذہنی، محبت و دوستی کا پیغام اسلامی معاشرے کی روح تک پہنچانا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ روحانی پاکیزگی کا اثر ہماری زندگی کے تمام اعمال پر پڑتا ہے۔ مذہب بتاتا ہے کہ جرم نہیں کرنا چاہیے ورنہ جرم کا بدلہ عاقبت میں ملے گا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ سوسائٹی جرم سے اجتناب کرے۔ اگر جرم سے اجتناب کرے گی تو میزان استوار ہوگا(۳۷)۔ وہ مسلمانوں کو سبھی برائیوں سے بچانا چاہتے تھے۔ برائیوں سے بچنے کے لیے انھوں نے قرآنی تعلیمات عوام کے سامنے پیش کیں۔ انھوں نے لکھا کہ قرآن نے اس پر بار بار زور دیا ہے کہ کوئی علم صالح ضائع نہیں جاتا اور نہ کوئی عمل بد بغیر سزا کے رہ جائے گا(۳۸)۔ مسلمانوں کے سماجی و اقتصادی اتحاد کو وہ بہت ضروری مانتے تھے۔ اس سماجی اتحاد کی اہمیت کو انھوں نے ان لفظوں میں سمجھایا ''تعاون، تناصر ہر مسلمان کا فرض ہے اس لیے ہر مومن محافظِ تمدن عالم ہے۔ اگر ایمان و اسلام کی حقیقت دنیا سے ناپید ہو جائے تو تمام دنیا برباد ہو جائے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان کو ایک دوسرے کا ناصر و مددگار کہا ہے''(۳۹)۔

مولانا شبلی نعمانی خود بین الاسلامیت کے ماننے والے تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کو ایک خط میں لکھا تھا کہ ''آپ کو مولویوں کے درمیان بنے رہنا چاہیے۔ آپ انھیں

کئی اچھے کاموں کے لیے ترغیب دے سکتے ہیں'' (۴۰)۔ مولانا آزاد نے انھیں سارے تجرباتی نتائج سے اخذ کردہ نظریوں، اصولوں اور ضرورتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے بین الاسلامیت کے لیے کام کیا۔

مولانا آزاد کا اخبار الہلال مندرجہ بالا اصولوں کی بنیاد پر اسلام اِزم (Islam-ism) یا بین الاسلامیت کو مشتہر کرتا تھا۔ انگریزوں کے تئیں اس کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ مذہب تھا۔ ۱۹۱۳ء میں انگلینڈ کی ترکستان کے خلاف حرکتوں کو انھوں نے ساری دنیا کے خلاف ایک بدسلوکی کا نام دیا تھا (۴۱)۔ مسلمانوں کو کعبہ و دیگر مذہبی مقامات کی حفاظت کے واسطے تیار کرنے کے لیے ۶رمئی ۱۹۱۳ء کو ''خدام کعبہ'' نام کی ایک تنظیم بنائی گئی تھی (۴۲)۔ اس کی موافقت میں مولانا آزاد نے ''الہلال'' میں لکھا کہ ''یقیناً کام کرنے کی آخری ساعت سے ہم گزر رہے ہیں اور یہ موسم خالی ہوگیا تو پھر ناکامی و نامرادی کے سوا کچھ نہیں (۴۳)۔ لیکن وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی کام بغیر سوچے یا جلدبازی میں کیا جائے اور ناکامی نصیب ہو۔ لہٰذا انھوں نے لکھا کہ ''طبیعت کے پورے اطمینان اور عزم کے انتہائی وثوق کے بعد قدم اٹھایا جائے'' (۴۴)۔ مولانا آزاد خود بھی ''خدامِ کعبہ'' کے رکن اور اس کے مؤسسین میں شامل تھے (۴۵)

حزب اللہ

مولانا آزاد نے ۱۹۱۳ء میں حزب اللہ سوسائٹی کی بنیاد رکھی تھی (۴۶)۔ اس کا مقصد بھی بین الاسلامیت کی تشہیر کرنا تھا۔ ''الہلال'' کا دفتر ہی اس کا مرکز تبلیغ و تشہیر تھا۔ ''الہلال'' کے قارئین کو اس کا ممبر بننے کے لیے ۱۴رمئی ۱۹۱۳ء کو ''الہلال'' کے ساتھ حزب اللہ کے ممبری فارم بھیجے گئے تھے (۴۷)۔ وہ حزب اللہ کو اللہ کی جماعت کہتے تھے ان کے مطابق حزب اللہ کا مقصد حقیقی ہے کیوں کہ خدائے تعالیٰ نے حزب اللہ یعنی اپنی جماعت کو شیطان کی جماعت کے مقابلے میں فرمایا ہے ''حزب اللہ کے ممبران کی خصوصیت واضح کرتے ہوئے انھوں نے قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ ان کی علامت یہ ہونی چاہیے کہ اللہ اور اس کی صداقت و عدالت کے آگے دنیا کی تمام قوتوں اور بندشوں کو ہیچ سمجھیں (۴۸)۔ حزب اللہ کے ارکان کا واحد مقصد اللہ کی پکار پر

سب کچھ چھوڑ کر دین کی حفاظت کے لیے اپنا سارا اثاثہ نچھاور کرنا بتایا گیا تھا کہ جو لوگ حب الٰہی میں دنیا کے کسی بھی رشتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے، یہاں تک کہ ماں باپ وغیرہ کو بھی ہیچ سمجھتے ہیں اور خدا کی پکار جب ان کے کانوں میں پڑ جائے تو سب کو چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف دوڑ جائیں تو ایسے لوگ حزب اللہ ہیں۔ اللہ کی جماعت کا ایک نام یا ایک درجہ حزب اللہ ہے (۴۹)۔ حزب اللہ کے اصولوں کے مطابق تعلیم دینے کے لیے ''دارالارشاد'' کے نام سے انھوں نے ایک اسکول قائم کیا اور اس کے خواہش مند لوگوں کو تربیت دینا شروع کیا (۵۰)۔ تربیت دیتے وقت پانچ قول و قرار کرائے جاتے تھے:

(۱) ہمیشہ نیکی کا حکم دیں گے۔ برائی کو روکیں گے اور صبر کی وصیت کریں گے۔

(۲) اس دنیا میں ان کی دوستی ہوگی تو اللہ کے لیے دشمنی ہوگی تو اللہ کے لیے۔

(۳) سچائی کے راستے میں وہ کسی کی پرواہ نہیں کریں گے اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈریں گے۔

(۴) اللہ اور اس کی شریعت کو دنیا کے سارے رشتوں، ساری نعمتوں اور لذتوں سے زیادہ محبوب رکھیں گے۔

(۵) شریعت کے ہر حکم کی اطاعت بجا لائیں گے جو ان تک پہنچایا جائے گا (۵۱)۔

بین الاسلامیت پر زور دیتے ہوئے مولانا آزاد نے لکھا تھا کہ خدا نے خود کہا ہے کہ اب سے جو انسان احکام اسلام کی جگہ کسی دوسری تعلیم کو تلاش کرے گا تو یقین کرو کہ اس کی تلاش کبھی مقبول نہ ہوگی اور اس کے تمام کاموں کا آخری نتیجہ ناکامی و نامرادی ہی ہوگا (۵۲)۔ ''البلاغ'' کی اشاعت کے وقت ''ترجمان القرآن'' کا چھپنا بھی شروع ہوگیا تھا جس کا مقصد مسلمانوں میں قرآن کے تئیں نئی تفہیم کو بڑھانا تھا (۵۳)۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران اسلامی ملکوں کے تئیں انگریزوں کی پالیسی کو انھوں نے اسی نقطۂ نظر سے عوام کے سامنے پیش کیا تھا، لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد انھوں نے یہ محسوس کیا کہ اسلام کے دائرے میں بھی حب الوطنی پر عمل کیا جاسکتا ہے لہٰذا انھوں نے بین الاسلامیت کی طرف دھیان دینا کم کر دیا اور اسے چھوڑ کر باشندگان ملک سے متحد ہو کر حصول آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کی وکالت کی (۵۴)۔

سماجی فکر وعمل

مولانا آزاد بین الاسلامیت کے توسط سے مسلمانوں میں ایک بین الاقوامی اخوت قائم کرنا چاہتے تھے۔ بھائی چارے والے اس سماج کی تنظیم کے لیے ان کے پاس اپنا ایک الگ نقطۂ نظر اور پروگرام تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان متعصبانہ تنگ نظری سے دور رہ کر بھی انسانوں سے محبت کریں۔ اپنی مشہور کتاب ترجمان القرآن میں انھوں نے لکھا تھا کہ قرآن کہتا ہے کہ خدا کی محبت کی راہ اس کے بندوں کی محبت میں سے ہو کر گزری ہے۔ جو انسان چاہتا ہے کہ خدا سے محبت کرے اسے چاہیے کہ خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے (۵۵)۔ مسلمانوں کو یہی بات سمجھانے کے لیے انھوں نے کہا تھا کہ قرآن میں خدا پرستی کی بنیاد ہی اس جذبے پر رکھی ہے کہ انسان خدا کی صفتوں کا پرتو اپنے اندر پیدا کرے (۵۶)۔ مولانا آزاد مانتے تھے کہ قرآن میں انسانی برادری اور بھائی چارے پر زور دیا گیا ہے اور اس خیال کی مخالفت کی گئی ہے کہ معاشرت یا نسل کی بنا پر انسان کا کوئی گروہ دوسرے گروہ سے افضل ہو سکتا ہے (۵۷)۔ محض انسان کی اس انسانیت کو وہ خدا کی وحدانیت کے نظریے سے ثابت کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا خدا دوسرے لوگوں کے خدا سے الگ نہیں ہے (۵۸)۔ مذہب کی باہری شکل کی وجہ کر دکھائی دینے والا فرق دور کرنے کے لیے انھوں نے اتنا تک کہا کہ کسی ایک نبی کو ماننا اور دوسرے سے انکار کرنا کفر ہے (۵۹)۔ ان کا کہنا تھا کہ خدا نے دنیا کو ایک ہی مذہب دیا ہے (۶۰)۔ اس طرح وہ تمام انسانوں تک اسلامی سماج کا دائرہ پھیلانا چاہتے تھے۔ ان کی نظر میں دنیا بھر کے انسانوں کے درمیان کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔ آگے چل کر انھوں نے اس خیال کی نہایت عمدہ تشریح اس طرح کی کہ ہر ایک انسان پیدائش سے لے کر موت تک کئی طرح کے ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔ خاندان، شہر، ملک، جغرافیائی حدود اور آخر میں کل ملا کر تمام عالم تک شخصیت کا ارتقاء ہوتا ہے۔ اسی نظریے سے انھوں نے ''الہلال'' میں لکھا کہ قومیت ایک نہایت محدود اور تنگ دائرے سے شروع ہوتی ہے لیکن یہ پھیلتی اور بڑھتی رہتی ہے (۶۱)۔ شروع میں بچے کا دعویٰ ماں کی گود تک رہتا ہے پھر بالترتیب خاندان، قبیلہ، نسل، کوئی خاص حصہ جہاں وہ رہتا ہے مثلاً مکان پھر وطن اور پھر آگے رنگ، زبان، جغرافیائی دائرہ جیسے ایشیاء، براعظم یورپ وغیرہ

انسان کے دائرے میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اسلام اسی راستے سے انسان کو انسانیت کی منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے ...چھٹی صدی میں جب اسلام کا ظہور ہوا تو دنیا کے قدم قبیلے اور وطن کی منزل سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ اسلام نسل، رنگ، زبان اور تمام رشتوں کو تسلیم نہیں کر سکا۔ اس نے انسانیت کو صرف ایک ہی رشتے کی دعوت دی، انسانیت اور انسانی برادری کے فطری رشتے کی (۶۲)۔ انھوں نے اس کی تائید میں قرآن سے مثال پیش کی اور لکھا کہ قرآن کہتا ہے کہ اے مجمع انسانی ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔ پھر ایسا کیا کہ تمھیں مختلف شاخوں اور قبیلوں کی صورت دے دی تا کہ ایک گروہ سے دوسرا گروہ پہچانا جا سکے۔ باقی رہی یہ بات کہ انسان کے شرف وعزت کا معیار کیا ہے تو اس کی یہ طرح طرح کی گروہ بندیاں نہیں ہیں، بلکہ انسان کی عملی زندگی ہے (۶۳)۔

اپنے اسی نقطۂ نظر کی بنا پر وہ مسلمانوں کو ایک امن پسند فرقے کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو امن کا پیغام دیتے ہوئے کہا کہ مسلمان دنیا میں صلح و امن کا پیغام ہیں۔ انھوں نے تلوار بھی اٹھائی ہے تو صلح کی حمایت میں۔ دنیا میں جن لوگوں نے فتنہ وفساد اختیار کیا وہ قہر الٰہی سے مغضوب ومردود ہو گئے (۶۴)۔ وہ چاہتے تھے کہ سیاسی میدان میں بھی مسلمان منظم ہو کر آزادی کے لیے جدوجہد کریں اور پارلیمانی طرز حکومت کے حصول کی کوشش کریں (۶۵)۔

مولانا تعلیم کے میدان میں مسلمانوں کو خود مختار بنانا چاہتے تھے۔ انگریزی طریقۂ تعلیم کو بیکار مان کر وہ کہتے تھے کہ ''صد حیف ہے ہندوستان پر، کوئی اس طویل وعریض انگریزی عہد حکومت میں علم کے صحیح مفہوم تک سے آشنا نہ ہونے پایا (۶۶)۔ یعنی انگریزی تعلیم نے ہندوستان میں اتنا بھی فائدہ نہیں پہنچایا کہ پڑھ لکھ کر لوگ تعلیم کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لائق ہو سکیں۔ لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ تعلیم کا مطلب کیا ہے۔ اسی لیے ان کا کہنا تھا کہ سرکار مسلمانوں کے لیے جو ایک یونیورسٹی بنانا چاہتی ہے اس کا سارا اختیار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ اس میں انگریزوں کو کوئی مداخلت کا حق نہیں ہونا چاہیے (۶۷)۔ انگریز اسلامی معاشرے میں کسی بھی طرح کی مداخلت نہ کر سکیں اس کے لیے وہ چاہتے تھے کہ انھیں مسجدوں میں داخلے کی اجازت بھی نہ دی جائے۔ وہ مانتے تھے کہ مسجدیں

مسلمانوں کے لیے ایک سماجی مرکز ہیں اور وہاں سے سیاسی، مذہبی، سماجی سبھی طرح کی سرگرمیاں چلائی جا سکتی ہیں۔ جب لاہور کی ایک تنظیم ''انجمن اسلامیہ'' جو لاہور کی شاہی مسجد کی دیکھ بھال کرتی تھی، نے مسجدوں میں سیاسی تقریر کرنے پر پابندی لگائی تو مولانا نے اپنے اخبار میں لکھا تھا کہ ''کیا اسے مسجدوں کے متعلق ایسے اعلان کا حق ہے؟ کیا اسے حق ہے کہ جس کام کو چاہے کرنے دے یا روکے۔ اسلام نے یہ حق صرف قرآن کو دیا ہے'' (۶۸)۔ اسی میں انھوں نے آگے لکھا کہ ''دہلی و آگرہ کی جامع مسجد اور لاہور کی تاریخی مسجدیں ہمیشہ یورپین حکام اور سیاحوں کی تماشاگاہ نہیں ہیں۔ وہ اکثر عین نماز کے اوقات میں آتے ہیں اور بالکل اسی طرح جس طرح اہل عرب تعجب سے بطور تماشے کے مسلمانوں کو مصروفِ نماز دیکھتے، قریب جا کر ہماری صفوں کا تماشا کرتے ہیں اور کوئی نہیں ہوتا جو اس تضحیک شعائر اللہ سے انھیں باز رکھے اور انھیں روکے (۶۹)۔ مولانا کی یہ پالیسی کہ مسلمان اپنے مذہبی و سماجی معاملات میں آزاد رہیں اور انگریز اس میں مداخلت نہ کر سکیں، سرسید احمد کے زمانے میں مسلمانوں کو دبانے والی پالیسی کا ردِّعمل تھی۔ مولانا کی یہ پالیسی ان کے سیاسی نقطۂ نظر نیز افعال و اعمال میں نہایت شدت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

سیاسی سرگرمیاں اور ''الہلال''

سیاسی حلقے میں ''الہلال'' قومیت کا ترجمان بن کر سامنے آیا تھا۔ مولانا آزاد مصر کے مشہور مصنف اور صحافی رشید رضا سے بہت متاثر تھے۔ ان کے کاموں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے انگریزی حکومت کے مظالم کے خلاف حب الوطنی کا پیغام دینا شروع کیا۔ اخبار کے دوسرے شمارے میں وہ لکھتے ہیں کہ سید رشید رضا نے ہر موقع پر سلطانی حکام کے ظلم و ستم کے پردے چاک کیے اور ہمیشہ پیار کے ساتھ شخصی حکومت کو قرآن و اسلام کے عقیدے میں سب سے بڑا انسانی گناہ اور سخت سے سخت فسق اور معصیت ثابت کیا (۷۰)۔
''الہلال'' کو مولانا نے شروع سے ہی اداس و مایوس مسلم عوام میں سیاسی خود مختاری کے حصول کا جذبہ اُجاگر کرنے والا ایک ذریعہ بنا کر پیش کیا۔ مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں ان کا اخبار رام بان کا کام کرتا تھا۔ اسلامی تاریخ کے قابل رشک ماضی کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ''فرانس ۱۸ر جولائی ۱۷۸۹ء کو نہیں بھولتا کہ آزادی کی رحمت کا

اسی دن نزول ہوا تھا۔ انگلستان ۲ر جون ۱۶۴۹ء کو یاد رکھتا ہے کہ شاہی اقتدار پر آخری ضرب اسی دن لگی لیکن یہ یادگار دنیا کی زندہ قوموں کا حصہ ہے۔ ہم بدبختوں کے زبوں طالعوں کے پاس بھی بہت سی تاریخیں ایسی تھیں کہ جن کی عظمت کے آگے ہم نہیں تمام عالم سر جھکاتا تھا''۔ وہ مسلمانوں کی بدقسمتی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''لیکن یہ زندگی کے کاروبار تھے۔ اب کہ موت کی مردنی سے جسم ملت کا ہر عنصر افسردہ ہو رہا ہے ایسے نصیب کہاں کہ کامرانی و فتح مندی کی تاریخیں یاد رکھنے کے لیے میسر آ سکیں۔ قومی اقبال کا آفتاب جب چمکتا ہے تو شاید ایک ہی بار چمکتا ہے''۔ آگے وہ امید باندھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''لیکن جب دن پھرنے والے ہوں تو عجب نہیں کہ نوحۂ غم سے نغمۂ طرب کی لَے پیدا ہو جائے، بہار خزاں کے بعد آتی ہے اور خشک درختوں کو ہم نے سرسبز ہوتے دیکھا ہے'' (۷۱)۔ مولانا آزاد مذہب کی مدد سے سیاست کے چہرے کو تعصب سے پاک کر کے قومی چہرہ بنانا چاہتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں مولانا مذہب اور سیاست کو ایک ساتھ ملا جلا کر چلانا چاہتے تھے۔ وہ مذہب کو سیاست کے ساتھ پوری طرح جوڑ دینا چاہتے تھے۔
''الہلال'' کے ایک قاری کے ذریعہ ''الہلال'' کی سیاسی تعلیم کے بارے میں وضاحت کرنے کی مانگ کیے جانے پر کہ پولیٹیکل تعلیم کو مذہبی تعلیم سے الگ کر کے صاف صاف بتلائیں کہ آپ قوم کو کس راہ پر لے جانا چاہتے ہیں، مولانا آزاد نے لکھا کہ ''آپ کہیں بنیاد کا پتھر بدل دیجیے، معاف کیجیے ہم اس کی تعلیم سے مجبور ہیں۔ پولیٹیکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر کے ہمارے پاس کیا بچ گا'' (۷۲)۔ انگریزوں کی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے خلاف الہلال ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق، پیار و محبت اور بھائی چارے کا پیغام لے کر آیا تھا۔ تقسیم بنگال کے پُردرد انجام کی وجہ کر جو حالات پیدا ہوئے تھے اس سے مولانا بے خبر نہیں رہے تھے۔ وہ اتحاد کا مطلب اور اس کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ اسی اتحاد کا پیغام انھوں نے نہایت واضح الفاظ میں دیا۔ مسلمان چونکہ ملک کے قومی کاموں سے الگ رہتے تھے اور انھی کو صحیح راستہ دکھانے کے لیے انھوں نے اس اخبار کا آغاز کیا تھا تو وہ ان سے ہی کہتے ہیں کہ ''تم کو ہندوستان میں رہنا ہے تو اپنے ہمسایوں سے معانقہ کر لو۔ ان سے الگ رہنے کا نتیجہ بھی دیکھ چکے۔ زندہ رہنا ہے تو اب ان سے مل جاؤ۔ اگر ان کی طرف سے رکاوٹ ہے تو اس کی پَرواہ مت کرو۔

قومیں تمھارے ساتھ اگر اچھا سلوک نہیں کرسکتیں تو تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو (۷۳)۔

مسلمانوں کے لیے مذہب سب سے زیادہ محرک جذبات کا کام کرتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانوں میں جذبۂ حب الوطنی کی کمی تھی۔ اس کو دور کرنے کا طریقہ بتاتے ہوئے مولانا شبلی نعمانی نے ایک بار کہا تھا کہ پیغمبر کے پیروکار وطنیت کی پکار کا کوئی جواب نہیں دیتے، ان سے مذہب کے نام پر اپیل کیجیے، آپ دیکھیں گے کہ کتنا اچھا سدھار ہوا ہے (۷۴) اسی راہ پر مولانا آزاد نے اپنے قدم بڑھائے تھے۔ انھی کے لفظوں میں ''الہلال کوئی تجارتی دفتر نہ تھا جو عام کاروباری اصولوں پر قائم کیا گیا ہو، بلکہ ایمان و اللہ اور عمل و اسلام کی ایک دعوت دینی تھی جو چند مقاصد کو اپنے سامنے رکھتی تھی اور خدا کے حکموں اور پیغمبروں کے طریقے کے ماتحت قوم کو ان کی طرف بلاتی تھی (۷۵) ''الہلال'' کے ذریعہ انھوں نے اسلامی فلسفۂ دین کی وضاحت اور منطقی تنقید کی ایک نئی جہت قائم کی تھی۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو اپنی روزمرّہ کی زندگی کے بنیادی اور اہم مدّوں پر غور وفکر کی ترغیب دی تھی۔ جس طرح مہارشی دیانند نے ہندو سماج کو ویدوں کی طرف لوٹ جانے کی ترغیب دے کر ان میں نیا شعور بیدار کیا تھا ویسے ہی مولانا آزاد نے مسلمانوں کو یہ سوچنے کے لیے مجبور کیا کہ قرآن کی تعلیم ہی ان کا بنیادی مقصد ہے۔ دراصل وہ قرآن کی تعلیم سے سرسید کے علی گڑھ اسکول کا اثر ختم کرنا چاہتے تھے۔ مولانا کا کہنا تھا کہ ''ہماری تعلیم وہی ہے جو قرآن کی ہے۔ اسلام خدا کی بخشی ہوئی انسانی آزادی کو قائم رکھنے والا اور ہر شخصی استیلاء اور جبر کا مخالف ہے'' (۷۶)۔
وہ قرآن کی تعلیم کو مسلمانوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ قرآن کو آزادی کا پیامبر مانتے تھے۔ انگریزوں کی مخالفت اور قرآن کی تعلیم دونوں کو انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ یکجا کر دیا تھا۔ مولانا کے مطابق — ''ہم نے تو اپنے پالٹیکل خیالات بھی مذہب سے سیکھے ہیں''۔ قرآن ایک روشنی ہے اور روشنی جب نکلتی ہے تو ہر طرح کی تاریکی دور ہو جاتی ہے، خواہ وہ مذہبی گمراہیوں کی ہو خواہ سیاسی۔ ''الہلال'' کا مقصد اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے کہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال میں صرف کتاب اللہ و سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور خواہ تعلیمی مسائل ہوں خواہ تمدنی۔ سیاسی ہوں خواہ اور کچھ۔ وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے (۷۷)۔ اسی لیے مسلمانوں کو قرآن کی طرف

لے جانے کی دعوت دینے کے ساتھ ہی مولانا آزاد نے دین اسلام کے پیروکاروں کی توجہ اسلامی ملکوں کے سیاسی حالات کی جانب مبذول کرائی اور وہاں مسلمانوں پر ہو رہے سفیدفام قوم کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''طرابلس میں مقتولین ظلم وستم کی لاشیں تڑپ رہی ہیں تو یہ عیش پرستی ایک لعنت ہے جو آپ کو عید کی خوشیوں میں مصروف کر رہی ہے۔ اگر ایران میں اخوانِ ملت کو وطن پرستی میں پھانسیاں دی جا رہی ہیں تو وہ آنکھیں پھوٹ جائیں جو ہندوستان میں اشکبار نہیں۔ اگر مراکو میں اسلام کا آخری نقش حکومت مٹ رہا ہے تو کیوں نہیں ہندوستان کے عیش کدوں میں آگ لگ جاتی ہے'' (۷۸)۔

مسلمانوں پر دنیا کے دوسروں حصے میں ہونے والے مظالم کے ردّعمل کے طور پر انگریزی طاقتوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کے لیے سادے الفاظ میں نہ کہہ کر ہندوستانی مسلمانوں کی سردمہری و بے عملی پر حملہ کر کے وہ انھیں تیار کرنا چاہتے تھے، لیکن مذہب اور خدا کی دہائی ساتھ دیتے چلتے تھے تاکہ الہلال پر چڑھا ہوا مذہبیت کا پردہ ہلکا نہ پڑ جائے۔ ''الہلال'' کی سیاسی تعلیم کے حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ ''خدا کے سوا کوئی نہیں جس کا حکم انتہائی حکم ہو۔ اسلام کا پہلا اصول توحید ہے۔ وہ سکھاتا ہے کہ صرف خدا کے آگے جھکو، کوئی نہیں جو ڈرنے اور خوف کرنے کے لائق ہستی ہو'' (۷۹)۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ وہ دنیاوی طاقتوں کے ظلم وستم کے خلاف خدا کی طاقت کا سہارا لے کر مسلمانوں کو کھڑا کرنا چاہتے تھے۔

اس بلاوے میں وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہندوستان میں یہ کوشش تب تک ناکام رہے گی جب تک انگریزوں کے خلاف ساری قوم ایک ساتھ اُٹھ کر نہیں کھڑی ہو جائے گی۔ اس کے لیے انھوں نے مسلمانوں پر زیادہ بڑی ذمہ داری ڈالی کیوں کہ تقسیم بنگال کے خلاف کشمکش میں مسلمان قومی تحریک کے ساتھ نہیں تھے۔ اس کے لیے اب انھیں آگے لائے بغیر ایک طاقتور مورچہ بنانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ لہٰذا انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ ''وہ دنیا میں خدا کے پاس اس امر کے ذمہ دار ہیں کہ نیکی کی حفاظت کریں اور فساد کو روکیں اس لیے وہ اچھی بات کرنے والوں کے مددگار ہوں خواہ وہ گورنمنٹ ہو یا اور کوئی قوم'' (۸۰)۔ ساتھ ہی وہ سرکار کو ایک طرف مسلمانوں کے غدار نہ ہونے کا یقین دلاتے ہیں تو دوسری طرف آزادی کے مطالبے کا حق بھی جتاتے جاتے ہیں۔ وہ سرکار سے کہتے

ہیں کہ ''سرکار کو ہم سے مطمئن رہنا چاہیے۔ اس کو بھولنا نہیں چاہیے کہ اگر ہم سچے مسلمان ہوں تو ہمارے ہاتھ میں قرآن ہوگا اور جو ہاتھ قرآن سے ڈھکا ہوا ہو، بم کا گولہ یا ریوالور نہیں پکڑ سکتا۔ البتہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام نے ہم کو آزادی بخشنے اور آزادی حاصل کرنے، دونوں کی تعلیم دی ہے۔ ہم جب حاکم تھے تو ہم نے آزادی دی تھی اور جب محکوم ہیں تو وہی چیز طلب کرتے ہیں''(۸۱)۔

مولانا آزاد کسی بھی موقع پر جذبۂ حب الوطنی کی تشہیر، مسلمانوں پر ان کی انگریزی پرستی پر طنز کرنے اور انگریزوں کی پالیسی کا پردہ فاش کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ چاہے کوئی بھی مضمون ہوتا ان کے قلم سے آگ نکلتی رہتی تھی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام میں سرکار کے ذریعہ کچھ شرطیں رکھنے سے پیدا شدہ رُکاوٹ کے موقع کا انھوں نے خوب فائدہ اٹھایا(۸۲)۔ انھوں نے مسلمانوں کو لتاڑتے ہوئے ان کی برٹش سرکار سے متعلق اپنائی گئی پالیسیوں کا مذاق اُڑاتے ہوئے اور ان پر شدید طنز کرتے ہوئے لکھا کہ ''ہم نے بھی عرصے سے مسلمانوں کو اپنے سے غیر سمجھ لیا ہے اور جب کبھی گورنمنٹ کی طرف سے کوئی نئی مشکل پیش آتی ہے تو خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک اور جوتی لگی۔ جو قوم چالیس برسوں تک حکومت کی بھیک اور دریوزہ گری پر زندگی بسر کرتی رہی، جس نے ہمیشہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے سے انکار کر دیا، جس نے ہر موقع پر پالیٹکل جدوجہد کو ایک جرم اور بغاوت سمجھا اور جس نے خود کبھی کچھ نہیں کیا مگر ہمیشہ کام کرنے والوں کی تضحیک وتحقیر کی نیز طرح طرح کے باغیانہ خطابات سے انھیں یاد کیا، آج اسے کیا حق ہے کہ گورنمنٹ اس کی پرواہ کرے اور کیوں نہ ان کی اُمیدوں کو ذلت کے ساتھ ٹھکرا دیا جائے''(۸۳)۔ ''الہلال'' کی اس بے باکی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اسے بے حد پسند کرنے لگے۔ اس کی مانگ اتنی بڑھی کہ پہلے تین ماہ میں ہی اس کے کبھی پرانے شمارے چھاپنے پڑے کیوں کہ ہر خریدار اس کا سبھی شمارہ شروع سے ہی پڑھنا چاہتا تھا(۸۴)۔

جنوری ۱۹۱۳ء میں ''الہلال'' نے اپنے چھ مہینے پورے کیے اور اس کے بعد سے ہی ''الہلال'' کی آواز میں مزید تیزی، شدت اور طاقت آگئی۔ اس کا لہجہ اور زیادہ تیکھا ہوتا چلا گیا۔ مولانا آزاد عیسائیت مخالف مضامین چھاپنے لگے جو انگریز مخالف ماحول بنانے میں مدد دیتے تھے۔ اس ماہ کے ایک مضمون میں کہا گیا تھا کہ ''تم چاہو یا نہ چاہو مگر تمھیں ہمیشہ

عیسائیت سے معرکہ آراء رہنا پڑے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم عیسائیت پر دست درازی کرو، میں یہ بھی نہیں کہتا کہ تم خواہ مخواہ جنگ آرائی کرو، بلکہ میں کہتا ہوں کہ تم توحید کے امانتدار ہو اس لیے تمھیں ہر وقت ایک ناگزیر جنگ کے مقابلے کے لیے تیار رہنا ہے۔ یعنی میں تم سے کہتا ہوں کہ ہمیشہ جنگ دفاعی کے لیے تیار رہو''(۸۵)۔ ''الہلال'' کو اس دور کے مسلمانوں کا انگریز مخالف ادب کا آئینہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا(۸۶)۔

جنگ بلقان میں انگلینڈ اور ترکی سلطنت ایک دوسرے کے مخالف خیمے سے جڑے تھے۔ اس جنگ میں سلطنت ترکی کے ٹکڑے ہوگئے تھے اور یورپ کی سفید فام طاقتوں نے ترکی کی طاقت کم کرنے کے لیے اس وقت مشترکہ کوشش کی تھی۔ انگلینڈ کا ترکی مخالف رویہ مسلمانوں کو پسند نہیں آسکتا تھا لہٰذا مولانا نے اس کا فائدہ اٹھایا اور انگلینڈ کے متعلق نفرت اور غصہ پھیلانے والے مضامین شائع کیے۔ انھوں نے جنگ بلقان کے بعد سفید فاموں کے ذریعہ ترکی کے ساتھ کی گئی بدسلوکی کی تفصیل انگلستان اور اسلام کے عنوان سے شائع کی(۸۷)۔ ایک انگریزی اخبار سے ایک صحافی کی رپورٹ کو ''مظالم سربیا'' کے نام سے شائع کیا گیا، جس میں سربیائی افسروں کے ذریعہ اپنی فوجوں کو جنگ کے لیے برانگیختہ کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ہمارے جہاد مقدس کا مقصد صرف اس وقت پورا ہوگا جب کہ ہم البانیہ کی پاک زمین ناپاک مسلمانوں سے پاک کر دیں۔ اس لیے ہمارا یہ مقصد ہے کہ البانیہ میں آخری مسلمان کو بھی تہہ تیغ کر دیں(۸۸)۔ مولانا کا انگریز مخالف لہجہ تیز ہوتا جا رہا تھا۔ ۱۶/اپریل ۱۹۱۳ء کے شمارے میں انھوں نے صاف طور پر لکھا کہ جنھوں نے اسلامی ممالک پر حملہ کیا ہے، لاکھوں مسلمانوں کو بے گھر بنایا ہے، مسلمان عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم بنایا ہے اور اسلامی تہذیب کو مٹانے میں اپنی صلاحیت صرف کر رہے ہیں، ہمیں ان کے لیے ایک پل کو جذبۂ دوستی کا احساس نہیں کرنا چاہیے(۸۹)۔

مسلمانوں کے لیے تعلیم سے متعلق سرکاری انتظام پر نکتہ چینی کرتے ہوئے مولانا آزاد نے اسے ایسی تعلیم بتایا کہ جس کی بنیاد گورنمنٹ کی خاص ضرورتوں کے لیے پڑ رہی ہو۔ جس کی خواہش یہ ہو کہ تعلیمی ڈگریاں غلامی کی ذلیل زندگی بسر کرنے کا تحفہ ثابت ہوں(۹۰)۔

مولانا آزاد ''الہلال'' میں واضح طور پر حصول آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کا

پرچار کرنے لگے تھے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں ''استبداد، غلامی، حکومت اور فنائے حریت کے بھی جراثیم ہوتے ہیں، جس قوم یا ملک میں ان چیزوں کا دخل ہوا، وہاں دھیرے دھیرے یہ جراثیم پھیلے اور مجمع انسانی میں اس طرح سرایت کر گئے کہ ملک کا ملک ولولۂ آزادی، حب استقلال اور بغضِ محکومیت کے جذبات سے محروم ہوگیا۔ اس کا جب کسی کو احساس ہوتا ہے اور وہ چارہ گری کے لیے اٹھتا ہے تو ایک دنیا مخالف ہو جاتی ہے اور ایک زمانہ اس کی تذلیل کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے(۹۱)۔

کانپور حادثہ

مولانا آزاد کا قومی لہجہ شدت اختیار کرتا جا رہا تھا تبھی کانپور میں انتظامیہ کے ذریعہ سڑک سیدھی کرنے کے لیے مچھلی بازار کی مسجد کی ایک دیوار گرانے پر فساد ہوگیا۔ اس میں ۳؍ اگست ۱۹۱۳ء کو پولس کی گولیوں سے کچھ لوگ مارے گئے اور کچھ گرفتار کیے گئے۔ مولانا نے اس حادثے کو لے کر انگریزی حکومت کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ ۱۳؍ اگست ۱۹۱۳ء کے پورے شمارے میں سرکار کے خلاف آگ اُگلنے والے مضامین و تصاویر چھاپے گئے۔ اداریے میں ''ادرنا کا دردناک نظارہ کانپور میں'' کے عنوان سے انھوں نے لکھا کہ ''زمین پیاسی ہے اسے خون چاہیے، کس کا؟ مسلمانوں کا۔ طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے۔ مغربی ایشیا کس کے خون سے رنگا ہے؟ مسلمانوں کے۔ خاکِ ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی۔ سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا۔ ہندوستان کی زمین بھی پیاسی ہے — خون چاہتی ہے۔ کس کا؟ مسلمانوں کا۔ آخر سرزمین کانپور پر مسلمانوں کا خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔

ہندوستان کی دیوی جوش و خروش میں ہے۔ اپنی قربان گاہ کے لیے نذر مانگتی ہے۔ کون ہے ہمت ور جوان جو اس کی خواہش پوری کرے۔ صوبۂ متحدہ کا بادشاہ گورنر سر جیمس میسٹن آگے بڑھا اور اس نے اپنی وفادار رعایا کا خون پیش کیا جو اپنی جان کے بعد اس کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب تھا''(۹۲)۔ انتظامیہ کی جانب سے عوام پر گولی باری کی مخالفت میں اپنا غصہ ظاہر کرتے ہوئے انھوں نے گولی برسانے والوں کے لیے لکھا کہ — ''انھیں کیا خبر تھی کہ یہ گولیاں ان ناتواں انسانوں کے سینوں کو توڑ توڑ کر برطانوی عدل و

انصاف کو زخمی کر رہی تھیں۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ اس گولی کا نشانہ اس ستون کو کمزور کر رہا تھا جس پر حکومت برطانیہ کی عمارت قائم ہے''(۹۳)۔ اس حادثے کے بارے میں آگرہ میں صوبۂ متحدہ کے گورنر جیمس میسٹن کے ایک بیان پر ردِّعمل ظاہر کرتے ہوئے مولانا نے اس میں لکھا تھا کہ ''ہم نے اس ہمدردی کو دیکھا جو تیغوں سے ہماری مسجد کے ساتھ و گولیوں، سنگینوں اور نیزوں سے ہمارے سینوں کے ساتھ کی گئی''(۹۴)۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ سارے ہندوستان کے مسلمان اس مسئلے کو لے کر انگریزی سرکار کے خلاف متحد ہو جائیں۔ اسی لیے انھوں نے لکھا کہ ''کانپور کا واقعہ اب کانپور کا ہی واقعہ نہیں رہا، تمام ہندوستان کا واقعہ ہوگیا۔ اس لیے ہندوستان کے سارے مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنی اپنی جگہ پُرزور جلسے کر کے گورنمنٹ کو مظالم حکومت متحدہ کی طرف متوجہ کریں۔ کلکتہ، بمبئی، لاہور، پٹنہ وغیرہ تمام شہروں سے ایک قانونی صلاح کار مقدمہ چلانے کے لیے کانپور پہنچنا چاہیے۔ معتبر لوگوں کی معرفت کانپور چندہ بھیجنا چاہیے''(۹۵)۔ انھوں نے بذات خود پہل کرتے ہوئے اس کام کے لیے ''الہلال'' کی طرف سے مبلغ ایک سو روپے کی رقم پیش کی(۹۶)۔

کانپور کی مسجد کی دیوار گرانے کا یہ واقعہ مولانا آزاد کے لیے مسلم سماج کو متحرک کرنے کا ایک سنہرا موقع ثابت ہوا۔ انھوں نے مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف تیار کرنے کے لیے کانپور واقعہ کو ابھارنے کی کوشش کی۔ کانپور کے حادثے پر علماء کو لتاڑتے ہوئے نیز ان کی بے عملی و بزدلی پر طنز کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ ''ہماری بدبختی نے خود ہماری بربادیوں کے سامان کر دیے ہیں۔ قوم کے قدرتی پیشوا علمائے مذہب تھے۔ اگر قرآن مسلمانوں کی دینی و دنیاوی فلاح کا ضامن ہے تو جس جماعت کے پاس قرآن کا علم ہوگا وہی ملت مرحومہ کی دینی و دنیاوی پیشوائی کی اہل ہوگی۔ لیکن ہمارا مرض پاؤں میں نہیں دماغ میں ہے۔ ہمارے پاؤں میں لنگ نہیں ہے بلکہ دماغوں میں قوتِ ارادہ باقی نہ رہی۔ علماء نے اپنے فرائض کو سب سے پہلے خیرباد کہا اور پھر انھیں کی ضلالت سے قوم کی تمام گمراہیوں کی تولید ہوئی''(۹۷)۔ ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو کلکتہ کی ہالی ڈے ۱۳اسٹریٹ میں انھوں نے ایک جلسے میں اپنی ایک تقریر میں کہا کہ ''ہمارے مذہب نے ہم کو سکھایا ہے کہ حکم کسی طاقت کے لیے نہیں اور کوئی انسان انسانوں پر محض اپنے تخت و تسلط کے زور سے حکومت کرنے کا حق نہیں رکھتا''(۹۸)۔ اسی جلسے میں کچھ تجاویز بھی پاس کی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک تجویز

میں انگریزی حکومت کے احکام کو نہ ماننے کی بات منظور کی گئی تھی۔ تجویز میں کہا گیا تھا کہ مسلمان اپنے دینی معاملات میں کسی والیِ ریاست کو اپنا رہنما تسلیم کرنے سے مجبور ہیں اور کانپور مسجد جیسے معاملات میں اپنے علمائے دین کے احکام کو قابل قبول سمجھتے ہیں'' (۹۹)۔ مسلمانوں کو اس جانب سے خبردار کرنے کے لیے انھوں نے اپنے اخبار میں لکھا کہ ''مسجدیں خدا کے لیے بنائی گئی ہیں تاکہ صبح و شام اس کے نام کی صدا بلند ہو، پس اسے خدا کے لیے چھوڑ دو۔ اس کے دشمنوں کو دعوت نہ دو کہ وہ تمھارے گھروں کی طرح خدا کے گھر پر بھی قبضہ کر لے اور اس کو اپنی پرستش و معبود کا مندر بنائے۔ تم جو اپنے تاج و تخت کی حفاظت نہ کر سکے ایسا نہ کرو کہ خدا کے تخت معبودیت کی تقدیس کو بھی غیروں کی بدولت بٹہ لگا دو۔ اس نے تم کو اپنی عبادت کے لیے ایک مقدس عمارت دی ہے، پس اسی کے آگے جھکو اور اسی کو پیار کرو، وہاں اس کے دشمنوں کے لیے دعائیں نہ مانگو اور نہ بادشاہوں (حکمرانِ انگلستان کی طرف اشارہ ہے) کی پوجا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ'' (۱۰۰)۔ مولانا آزاد کا کہنا تھا کہ اللہ کے علاوہ کسی اور سے ڈرنا غلط ہے، جو لوگ ڈرتے ہیں انھیں مسجد وغیرہ کے انتظامات کا حق نہیں ہونا چاہیے۔ ''الہلال'' میں انھوں نے لکھا تھا کہ ''ان لوگوں، انجمنوں و منتظموں کو جو اپنے اندر ان خصائصِ ایمانی کا کوئی ثبوت نہیں رکھتے، کیا حق حاصل ہے کہ اللہ کی مسجد کے متولی اور اس کے گھر کے پاسبان ہوں'' (۱۰۱)۔ ایسے لوگوں کے لیے انھوں نے لکھا تھا کہ ''ان کی حالت محتاج نظر ہے، جنھوں نے مسجد کے انتظام وغیرہ میں دخل حاصل کر کے انھیں غیروں کے احکام کفریہ اور حکومتوں کے فرمان رایگاں کے ماتحت کر دیا اور ہر وقت دنیا کی شیطانی قوتوں کے خوف سے لرزتے اور دنیاوی حکام کے ڈر سے روتے رہتے ہیں'' (۱۰۲)۔ ایسے لوگوں کو ان کے عہدوں سے ہٹانے اور مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف منظم اور خبردار رہنے کے لیے انھیں ہدایت بھرے الفاظ میں کہا ''اگر تمھارے پاس دل ایک ہے تو تمھارا سر چوکھٹوں پر جھک نہیں سکتا اور تمھاری غلامی کے لیے دو آقا بھی نہیں ہو سکتے، یا تو تم خدا کے لیے ہو یا اس کے سوا دوسروں کے لیے۔ اگر تم اس کے لیے ہو تو پھر غیروں سے کیوں ڈرتے ہو اور ان کے حکموں کے آگے کیوں جھکتے ہو''؟

ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے جہاد فی سبیل اللہ اور امر بالمعروف میں اسے بھی داخل کر لیں اور جہاں جہاں ایسے لوگ مسجد پر قابض ہوں، ان کے ہاتھ سے مسجد کا

انتظام لے لیا جائے۔ جب تک مسلمان احتساب کے لیے آمادہ نہ ہوں گے اور اپنی اجتماعی قوت سے کام لینا نہ سیکھیں گے۔ اس حالت کا انسداد محال ہے'' (۱۰۳)۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کو سرکار کے خلاف منظم کر رہے تھے تو دوسری طرف سرکار پر زور ڈال رہے تھے کہ سرکار کانپور کی مسجد کے معاملے میں انصاف کرے۔ انھوں نے ٹاؤن ہال کلکتہ میں کی گئی ایک تقریر میں سرکار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''انگلستان کی سرزمین انصاف و حقوق کی ضامن سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بسنے والوں نے صدیوں کی جد و جہد سے اپنے حقوق حاصل کیے ہیں اور حکومتوں کو شکستیں دی ہیں۔ پس ہم بھی آج انگلستان سے وہی چاہتے ہیں جو خود اس نے چاہا'' (۱۰۴)۔

''الہلال'' کی سرگرمیوں پر سرکار شروع ہی سے نگاہ رکھ رہی تھی۔ ۲۵ر فروری ۱۹۱۳ء کو حکومت ہند کے محکمۂ داخلہ کے سکریٹری مسٹر ایچ. وھیلر نے بنگال سرکار کو ایک خط میں لکھا تھا کہ حکومت ہند کی رائے میں یہ مناسب نہیں ہے کہ ایسے اخبار بغیر کسی رُکاوٹ کے لوگوں کو بھڑکاتے رہیں۔ مجھے آپ سے گزارش کرنی ہے کہ گورنر کی اجازت سے ایسے اخبارات پر خاص نظر رکھی جاسکتی ہے۔ ان پر فوری کارروائی کی جاسکتی ہے اور گورنر صاحب کو بتایا جائے کہ ان سے ۱۹۱۰ء کے پریس قانون کی خلاف ورزی ہوئی ہے (۱۰۵)۔ اس کے نتیجے میں بنگال سرکار مزید متحرک ہو اٹھی اور کانپور واقعے کی تشہیر کرنے والے ۱۳ر اگست کے شمارے کو قابل اعتراض ٹھہرا کر اس کی ساری کاپیاں ضبط کر لی گئیں (۱۰۶)۔ اس سے مولانا آزاد کا حوصلہ کم ہونے کے بجائے بڑھ گیا۔ مسز اینی بیسنٹ وغیرہ کے ذریعہ بھارت میں ہوم رول آندولن چلانے سے بھی پہلے انھوں نے اس سلسلے میں بیداری پھیلانی شروع کر دی تھی۔ انھوں نے انگلینڈ کے آئرلینڈ ہوم رول آندولن کی تفصیل ''الہلال'' میں چھاپنا شروع کر دیا اور اسے ہندوستان کے مسائل کے ساتھ جوڑ دیا۔ انھوں نے لکھا کہ ''برطانیہ کی کنزرویٹو حکومت کو آئرلینڈ کے لیے اندرونی آزادی کا حق تسلیم کرنے سے انکار تھا۔ بنائے انکار یہ بتائی جاتی تھی کہ آئرش قوم اپنے ملک پر حکومت کرنے کا تجربہ کھو چکی ہے۔ انھیں خود حکومت کرنے دینے کے معنی ہوں گے کہ طوائف الملوکی پھیل جائے اور کوئی نظام قائم نہ رہے۔ بعینہٖ یہی صورت حال ہندوستان کے لیے بھی درپیش ہے''۔ آگے وہ جارج واشنگٹن سے پوچھے گئے اسی طرح کے ایک سوال کا جواب لکھتے ہیں کہ ہر ایک قوم میں اپنے

ملک پر حکومت کرنے کے فطری مواہب ہوتے ہیں، ضرورت صرف ان سے کام لینے اور انھیں نمایاں کرنے کی ہے (۱۰۷)۔

مولانا آزاد کا یہ رویہ دیکھ کر بنگال سرکار نے ۱۸ر ستمبر ۱۹۱۳ء کو ''الہلال'' سے دو ہزار روپے کی ضمانت مانگی اور ۲۷ر تاریخ تک جمع کرنے کا وقت دیا (۱۰۸)۔ ضمانت مانگے جانے پر مولانا نے لکھا کہ ''الہلال'' پریس کا ابتدائی سامان خریدتے وقت ہی ہم نے ضمانت کا روپیہ نکال کر رکھ دیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ ہم اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے اُکتا گئے تھے اور اگر کوئی مانگنے نہ آتا تو ہم خود ہی پیش کرنے کے لیے آگے بڑھتے (۱۰۹)۔ یہ روپیہ ۲۳ر ستمبر کو ہی جمع کرا دیا گیا (۱۱۰)۔

''الہلال'' سے پہلے ہی دلی کے اخبار ''کامریڈ'' سے ضمانت مانگی جا چکی تھی۔ ضمانتیں مانگے جانے کو وہ پریس کی آزادی کا خاتمہ مانتے تھے۔ انھوں نے ضمانتوں پر اپنا ردِّعمل ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''اگر پریس کی آزادی کا خاتمہ ہوگیا، جیسا کہ ہو رہا ہے تو نہ اصلاح نہ طلبِ حقوق کو قیام ہے، نہ اظہارِ صداقت اور دعوتِ حق وحریت کی راہ باز۔ ملک کی تمام مصیبتوں کا علاج اور ملکی فلاح وترقی کے لیے حصول امن و آزادی خواب و خیال بن کر رہ جائے گی'' (۱۱۱)۔ پریس کی آزادی کو مشکل میں دیکھ کر مولانا آزاد نے پریس کے حقوق کی حفاظت کے لیے ایک ادارہ بنانے کی تجویز رکھی (۱۱۲)۔ اسے صحافیوں کی بھرپور تائید حاصل ہوئی۔ آخرکار مسٹر سریندر ناتھ بنرجی کی صدارت میں ایک نشست کلکتہ کے انڈین ایسوسی ایشن کے جلسہ گاہ میں ہوئی۔ اس میں سریندر ناتھ بنرجی ایڈیٹر، بنگالی، موتی لال گھوش ایڈیٹر امرت بازار پتریکا، کیشٹوکمار متر ایڈیٹر، سنجیونی، مولوی محمد اکرم ایڈیٹر ''محمدی''، ''بھارت متر'' نامی اخبار کے ایڈیٹر اور مولانا آزاد، ان سات اشخاص کی ایک کمیٹی مستقبل کا پروگرام طے کرنے کے لیے بنائی گئی (۱۱۳)۔

دوسری طرف مولانا نے ضمانت کا سوال مذہب سے جوڑ دیا۔ ان کے مطابق ''الہلال سیاسی اخبار نہیں بلکہ ایک دینی دعوتِ اصلاح کی تحریک ہے۔ ''الہلال'' اور پریس کا سوال بالکل پریس ایکٹ و اسلام کا سوال ہے۔ اگر ''الہلال'' پریس ایکٹ میں آسکتا ہے تو پھر ایک دن پریس ایکٹ دفعہ ۱۲ کے بموجب قرآن کریم کا بھی سوال پیدا ہو جائے گا (۱۴۴)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان مشتعل ہوگئے۔ ضمانت مانگے جانے اور کانپور مسجد کے حادثے

کو لے کر ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۳ء کو کلکتہ میں مسلمانوں کے ایک جلسے میں درج ذیل تجاویز پاس کی گئیں:

(۱) ''الہلال'' کو مسلمانوں کا دینی آرگن تسلیم کر کے شمارہ ضبط کرنے و ضمانت مانگے جانے کو مذہبی کاموں میں دخل اندازی مانتے ہوئے ''الہلال'' سے ضمانت لینے کو تمام پیروانِ اسلام سے ضمانت مانگنا مانا گیا۔

(۲) مچھلی بازار کی ''مسجد حادثہ'' کے لیے مسلمانوں سے تحریک جاری رکھنے کی اپیل کی گئی۔

یہ اعلان کیا گیا کہ مسلمانوں کے کسی دینی و معاشرتی معاملے میں حکومت کے کسی افسر کو مسلمان اپنا رہنما قبول نہیں کریں گے اور صرف اپنے مذہبی علماء کو اپنا لیڈر قبول کریں گے۔ ساتھ ہی ہندوؤں کے ذریعہ اس معاملے میں ہمدردی ظاہر کرنے پر ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ ملکی حادثات سے سبق لے کر نیز متحد ہو کر اپنے حقوق کی حفاظت کریں (۱۱۵)۔ رقم ضمانت جمع ہونے کے بعد ''الہلال'' ہوم رول بل کی خبروں اور دیگر سرکار مخالف خبروں سے بھرا رہنے لگا۔ مولانا آزاد ہندوستانی عوام کو بھی آزادی کی لڑائی میں آئرش لوگوں جیسا نیم فوجی طریقہ اپنانے کی طرف اُبھارنے لگے۔ انھوں نے یہ جانکاری دیتے ہوئے کہ تحریک السٹر نیم فوجی شکل اختیار کر رہی ہے یہ بھی کہا کہ السٹر کی تمام پبلک نے اپنے مطالبے کے اظہار و اعلان کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ ہندوستان کے ان سیاسی حقوق طلبوں کے لیے ایک عجیب عبرت اور اچھے انجام کا صفحہ ہے جن کی زبانوں پر جرم بغاوت کا تالا چڑھا دیا گیا ہے (۱۱۶)۔

ضمانت جمع کرنے پر بھی مولانا کے تیز وتند مخالف لہجے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ کلکتہ میں لشکرپور کی مسجد کی چار میناریں گرائے جانے کے سوال کو لے کر مولانا نے سرکار سے پُرزور بحث و تکرار کیا۔ مولانا آزاد کی صدارت میں ''انجمن دفاع مسجد و عمارت دینیہ'' کی بنیاد ڈالی گئی اور اس سلسلے میں ایک نمائندہ وفد سے ملنے کے لیے مولانا نے ۲۸ر اپریل ۱۹۱۴ء کو بنگال کے گورنر کو ایک خط لکھا۔ لیکن ۴ر مئی ۱۹۱۴ء کو بنگال کے گورنر لارڈ کرمائیکل کے چیف سکریٹری مسٹر جے. جی. کیومنگ نے اس کے جواب میں ملنے سے انکار کرنے کی اطلاع دی۔ مولانا آزاد نے اس پر اپنا ردِّعمل دھمکی آمیز لفظوں میں یوں ظاہر کیا کہ ''صرف

اطلاعات کامل اور معلومات موثقہ کے وجود کا علم اس زخم کا مرہم نہیں ہے جو مسجد لشکر پور کے میناروں کے انہدام سے تمام مسلمانوں کے دل پر لگا ہے اور جسے پوری بے پرواہی سے چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ اچھی طرح گہرا ہو کر ناقابل اندمال ناسور بن جائے'' (۱۱۷)۔

کناڈا میں ہندوستانیوں کے داخلے پر پابندی لگائے جانے کی مخالفت میں جب چھ سو مسافروں سے بھرا جہاز لے کر کناڈا جانے والے سردار گورودت سنگھ کو روکنے اور کناڈا میں داخل نہ ہونے دینے کا واقعہ پیش آیا تو اس پر مولانا آزاد نے ''الہلال'' میں برٹش سرکار کی پُرزور مذمت کرتے ہوئے لکھا کہ ''کیسی عجیب بات ہے، غلامی، محکومی اور ذلت ونکبت کا کیسا متاثر کن منظر ہے کہ ہندوستان میں دنیا کے ہر حصے کے باشندے آسکتے ہیں، اس کی زرخیز زمین سے اس کے بدبخت فرزندوں کو محروم کر کے اپنے اپنے ملکوں کی دولت بڑھا سکتے ہیں، ایک آزاد شہری کی طرح رہتے ہیں اور ان کے آرام و آسائش کے آگے خود اس ملک کی آبادی بھی کوئی چیز نہیں سمجھی جاتی، لیکن اگر ہندوستان کے باشندے جنوبی افریقہ میں جائیں تو ان کے لیے دروازے بند ہیں، کناڈا جائیں تو کنارے پر ہی روک دیا جاتا ہے۔ لٹنے اور برباد ہونے کے لیے صرف ہندوستان ہی ہے۔ مگر اپنی سرزمین کے فائدوں کو صرف اپنے لیے ہی مخصوص کرنے کے لیے تمام دنیا۔ جو انگلستان اس کے سب کچھ کا مالک ہے وہ صرف اس سے مانگ ہی سکتا ہے، دینے کو اس کے پاس کچھ نہیں ہے'' (۱۱۸)۔

مولانا آزاد چاہتے تھے کہ قومی تحریک کی سرگرمیاں برابر چلتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک مانڈلے جیل سے رہا ہو کر آئے اور ان کے بارے میں ایسا کہا گیا کہ اب وہ صرف تصنیف و تالیف کا کام کریں گے یعنی سیاست سے سنیاس لے لیں گے، تو اس بات پر دُکھ ظاہر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے ''تلک کی رہائی'' کے عنوان سے لکھے ایک مضمون میں کہا کہ ''ایڈوکیٹ آف انڈیا کو معلوم ہوا ہے کہ وہ جرمن میں چند سال قیام کریں گے اور وہاں سے آکر اپنی بقیہ زندگی تصنیف و تالیف میں صرف کر دیں گے لیکن اگر مسٹر تلک ہیں جیسا کہ انھوں نے دنیا کو یقین دلایا تھا تو ہمیں اس توقع کو ماننے میں تامل ہے اور اگر سچ نکلے تو افسوس'' (۱۱۹)۔

''الہلال'' کا باغیانہ لہجہ اب کھلے الفاظ میں مسلمانوں سے بغاوت کا مطالبہ کر رہا تھا کہ ''مسلمان ان حکمرانوں کے وہی حکم مانیں جو اُن کے حاکم حقیقی کے حکموں کے خلاف

نہ ہوں۔ اگر کبھی ایسی صورت پیش آجائے کہ اللہ اور اس کے بندوں کے احکام میں مقابلہ آپڑے تو پھر اس وقت نہ تو حاکم حاکم ہے نہ بادشاہ بادشاہ ... سب کے سامنے سرکشی، سب کے سامنے بغاوت''۔ مولانا آزاد مسلمانوں کو ان کافروں (انگریزوں) کے ساتھ نہایت مغرور وسخت ہونے کی صلاح دینا اپنا فرض سمجھتے تھے (۱۲۱)۔

پہلی جنگ عظیم سے قبل یورپ کے سیاسی حالات کی تبدیلیوں پر مولانا آزاد کا تیکھا تبصرہ انگلینڈ پر سیدھا چوٹ کرتا تھا۔ انگلینڈ اور جرمنی کی آپسی دشمنی اور فرانس و انگلینڈ کی دوستی کے پیچھے انگلینڈ کا ہاتھ بتاتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ ''انگلستان نے جو ساحل باسفورس پر اپنے اثر کی کمی اور جرمن نفوذ کی روز افزوں ترقی دیکھ کر خار کھا رہا تھا اور ترکی کو زک دینے کے لیے چالاک ولی کی طرح استیصال و مصروفیت کا منتظر تھا، اس نے روس کی بلقان جنگ کی پیشکش کی نہایت شد و مد سے تائید کی اور بالآخر فرانس کو بھی راضی کر لیا گیا'' (۱۲۲)۔

مولانا آزاد نے انگلینڈ کے جنگ سے متعلق فیصلوں کو اسلام مخالف ثابت کرنے والے مضامین چھاپنا شروع کر دیا کہ انگلستان کی یہی پالیسی رہی ہے کہ اس نے اپنے تمام حریفوں میں سے صرف جرمنی کو مقابلے کے لیے انتخاب کیا ہے۔ اس نے اپنے حریفوں کا منہ عالم اسلامی کے لقموں سے بند کر دیا ہے۔ مراقش، فرانس کو دے دیا ہے اور اس کے مقابلے میں مصر کا میدان اپنے لیے صاف کر لیا۔ ایران کو روس کے پیروں تلے ڈال دیا تاکہ وہ اسے روندے اور اس کے خون سے اپنی فتح کی پیاس بجھائے۔ اٹلی سے جرمنی کا ساتھ چھوڑنے اور اپنے ساتھ ملنے کے لیے اس نے اٹلی کو چھوٹ دی۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب اطالویوں نے طرابلس کے ملانے کا اعلان کیا تو انگلستان نے ہی سب سے پہلے تائید کی اور اسے باقاعدہ تسلیم کر لیا۔ اگر انگلستان ایسا نہ کرتا تو اٹلی کبھی بھی کامیاب نہ ہوتا (۱۲۳)۔

پہلی جنگ عظیم میں جرمنی و انگلینڈ خاص حریف تھے۔ ترکی جرمنی کی حمایت میں تھا۔ مولانا نے اپنے اخبار میں انگلینڈ کے حریفوں کی قوت و طاقت کا تذکرہ کرنا شروع کر دیا۔ ۱۴ر و ۲۱ر اکتوبر ۱۹۱۴ء کا مشترکہ شمارہ جرمن افواج کی فتح مندی، جرمن فوجی طاقت کے خواص نیز جرمن کی گوناگوں ترقیوں کے اسرار و رموز کی خبروں سے پُر تھا۔ جرمنی کی فوجی قوت کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ ''اب یہ حقیقت روز بروز کئی طرح سے عالم

آشکار ہو چکی ہے کہ جرمنی کی تعجب خیز قوت اور سامانوں کے متعلق جو معلومات دنیا برسوں
سے رکھتی آئی ہے وہ اسی طرح اب تک صحیح ہے جو جنگ سے پہلے تھی۔ جرمنی کی فتوحات کا
ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ جرمنی نے تمام بلجیم پر قبضہ کر لیا، فرانس میں پیرس تک چلا گیا۔
روس کے اندر روسی فوجوں سے لڑ رہا ہے اور میلوں اس کے حدود کے اندر ہے۔ اس کے
مقابلے میں جرمنی حدود کا ایک چپہ بھی اس کے حریفوں کے تصرف میں نہیں آیا ہے اور بقول
''اسٹیٹس مین'' کے، بہر حال اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جس قدر لڑائیاں ہو رہی ہیں
وہ سب کی سب جرمنی کے دشمنوں کے ہی ملک میں ہو رہی ہیں، جرمنی کے کسی حصے میں
نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جرمنی کے حریفوں کے ملک جنگ کی وجہ سے تہ و بالا ہو رہے
ہیں۔ جرمنی کا اندرونی امن و سکون اور داخلی تجارت و اقتصادیات بالکل اصلی حالت میں
برقرار ہیں۔ وہ سامانِ جنگ کے کارخانوں میں کام لے رہا ہے۔ توپیں ڈھل رہی ہیں اور
ایک ایک سو سب میرین تیار کی جا رہی ہیں۔ صرف اس اختلاف مناظر ہی سے جنگ کے
موجودہ نتائج واضح ہو جا سکتے ہیں'' (۱۲۴)۔

اس طرح انگلینڈ کی بدحالی و کمزوری کو بالواسطہ طور سے سمجھاتے ہوئے ہندستان
کے دوسرے دانشوروں کی طرح ہی وہ جرمنی کی تعریف کرنے لگے تھے (۱۲۵)۔ ساتھ ہی
اسلام کا نام لے کر بھارت کے عوام کے دل میں بھی انگلینڈ کے لیے دشمنی کے احساس کو
جگانے کا کام چل رہا تھا۔ انھوں نے صاف لکھا کہ ''اگر بار بار کے تجربے سے یہ ثابت ہو
جائے کہ ایک قوم یا ایک سلطنت ظالم ہے تو جماعت کو آسانی سے بھڑکایا جا سکتا ہے۔ اسلام
کی تہذیب نے جنگ کے موقع پر اکثر اس کو نمایاں کیا ہے'' (۱۲۶)۔ جرمنی کی تعریف میں
انھوں نے واضح طور پر لکھا کہ ''جرمنی کی سیاست، جرمنی کا تمدن، جرمنی کی تجارت، جرمنی کا
ہر ذرہ دنیا میں اونچا ہی ہو کر رہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس بلند حوصلے کی نمائش نے میدان
جنگ میں جرمنی کے علم و جنگی جہازوں کے مستول کو تمام سے بلند کر دیا ہے (۱۲۷)۔

ایمسٹرڈم میں انگلینڈ کی شکست پر طنز کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ ''ایمسٹرڈم
کی حوالگی کے جلسے شریف شہر (میئر) کی رہنمائی میں ہوئے۔ قیدیوں کے شمار کا تخمینہ نہیں کیا
جا سکتا۔ جرمنی نے بے شمار رسد و سامان جنگ پر قبضہ کر لیا۔ بہر حال انگریزی فوج کا جس
قدر بھی نقصان بیان کیا جاتا ہے وہ محض توپوں وغیرہ کی اتفاقی بدنظمی کا نتیجہ ہوگا ورنہ ایک

ایسی ہوشیار اور عقلمند فوج جو مقابلے کی جگہ ٹوٹ جانے کو ہمیشہ ترجیح دیا کرتی ہے، لازمی طور
پر ہمیشہ محفوظ ہی رہے گی'' (۱۲۸)۔

یوں تو اکتوبر ۱۹۱۲ء میں بھی بمبئی سرکار نے ایسے اخباروں کی برٹش مخالف پالیسی
کی وجہ کر مرکزی حکومت کو صلاح دی تھی کہ کلکتہ کے ''الہلال''، امرت سر کے ''وکیل''،
لاہور کے ''وطن''، ''پیسہ اخبار'' نیز ''زمیندار'' نامی اخباروں کا برٹش مخالف اثر عوام پر پڑ رہا
ہے۔ لہٰذا ان پر ریاستی حکومتوں کو خاص نظر رکھنے کے احکام دیے جائیں (۱۲۹)۔ ۲۵ر فروری
۱۹۱۳ء کو بھارت سرکار کے داخلہ سکریٹری مسٹر ایچ۔ وھیلر نے ایک خط لکھ کر اس سلسلے میں
بنگال سرکار کی توجہ مبذول کرائی تھی (۱۳۰)۔ مرکزی خفیہ محکمے کی ہدایت کے مطابق بنگال
سرکار نے ۱۹۱۴ء میں ''الہلال'' کے مضامین کی جانچ کا حکم جاری کر دیا تھا اور ''الہلال'' پر
غیر رسمی طور پر سنسر شپ جاری کر دی تھی (۱۳۱)۔ لیکن نومبر ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ کے انگریزی اخبار
''پائینیر'' کے ذریعہ الہلال کو جرمن حامی کہہ کر اس کے رویے کے تعلق سے سرکار کی توجہ
مبذول کرانے پر حکومت مزید چوکس ہو اٹھی اور ''الہلال'' کے خلاف اس کی طرف سے سخت
قدم اٹھایا گیا (۱۳۲)۔ ۱۴ر نومبر ۱۹۱۴ء کو بنگال سرکار کے چیف سکریٹری مسٹر جے۔ جی۔
کیومنگ نے نوٹس نمبر 10823-1/2P مورخہ ۱۴-۱۱-۱۹۱۴ء کے ذریعہ مولانا آزاد کو مطلع
کیا کہ ۱۹۱۰ء کے پریس کے قانون کی دفعہ ۴ کی ذیلی دفعہ ایک کے تحت ''الہلال'' کی ۱۴ر و
۲۱ر اکتوبر ۱۹۱۴ء کی سبھی کاپیاں و دو ہزار روپے کی ضمانت ضبط کر لی گئی ہیں (۱۳۳)۔ اس
کے بعد ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کا شمارہ ''الہلال'' کا آخری شمارہ ثابت ہوا۔ اس وقت قاعدہ تھا کہ
دو ہزار کی ضمانت ضبط ہونے پر دس ہزار کی ضمانت مانگی جاتی تھی، وہ اس سے بھی مانگی گئی پر
اس وقت اخبار بند کر دیا گیا (۱۳۴)۔

''الہلال'' کی اشاعت کا استقبال سارے ہندوستان کی عوام کے ذریعہ نہایت
خوشدلی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ مولانا کے اخبار میں ادبی مضامین و مذہبی عنوانات پر ہونے
والے تنقید و تبصرے سبھی میں ایک ایسا دل کش لہجہ اور منفرد اسلوب ہوتا تھا کہ اس کی کوئی
مثال لوگوں کے سامنے نہیں تھی۔ عوام سے لے کر خواص، نیز چوٹی کے علمائے کرام تک
اسے پڑھنا چاہتے تھے۔ عوامی مقبولیت کی وجہ کر اس کی اشاعت ۲۶ ہزار کاپی تک پہنچ گئی
تھی (۱۳۵)۔ جب ''الہلال'' اپنے ابتدائی دور میں ہی تھا تو مولانا الطاف حسین حالی اس

سے بڑے متاثر تھے۔ وہ اس کے مداحوں میں سے تھے نیز اس کی روز افزوں ترقی کے خواہاں تھے۔ انھوں نے اپنے لڑکے کے ہاتھ ایک خط بھیج کر ''الہلال'' کی تعریف کرتے ہوئے مولانا آزاد کو لکھا تھا کہ ''الہلال'' آتا ہے تو چار چار پانچ پانچ دن تک اس کے سوا کوئی مشغولیت نہیں رہتی (۱۳۶)۔ اس زمانے کے سب سے بڑے عالم مولانا محمود الحسن نے ''الہلال'' کو راہنما بتاتے ہوئے اس کی تعریف میں کہا تھا کہ ہم سب اپنے کام کو بھول گئے تھے، ''الہلال'' نے یاد دلا دیا (۱۳۷)۔ ''الہلال'' کے مذہبی پس منظر اور طریقۂ تعلیم نے مذہب پسند لوگوں کے اندر ایک نئی اُمید و اعتماد کی کرن پیدا کی تھی اور ایک نیا جوش و ولولہ بھر دیا تھا۔ ایسے لوگوں کے ذریعہ ان الفاظ میں ''الہلال'' کی مدح سرائی کی گئی تھی کہ ''ایسے جہل و ضلالت کے تاریک زمانے میں اور ایسے پُر آشوب وقت میں جب کہ راستی و کبر، اخلاقی جرأت و بدلگامی، حق و باطل اور ترقی و تنزلی میں تمیز کرنا مشکل اور بہت مشکل ہو گیا ہے، زبانیں دراز اور دستِ عمل کوتاہ ہو گئے ہیں، قحط الرجال نے بھی ترقی کے لہلہاتے ہوئے ہرے بھرے کھیتوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے، ''الہلال'' جیسے سراپا اسلامی میگزین کا قومی اُفق پر ابرِ رحمت بن کر نمودار ہونا عجائب قدرت کا ایک عظیم کرشمہ نہیں تو اور کیا ہے'' (۱۳۸)۔ ہر جگہ لوگ اس کے لیے پاگل رہتے تھے۔ لاہور میں لوگ ڈاک کا انتظار کرتے تھے اور غروب آفتاب کے بعد اخبار پہنچنے پر چراغوں کی روشنی میں اسے پڑھتے تھے اور پڑھے بغیر رہ نہیں سکتے تھے (۱۳۹)۔ اُتر پردیش میں لوگ اس اخبار کو پڑھنے کے لیے بے چین رہتے تھے اور اخبار آنے پر وہ گول دائرہ بنا کر اسے سننے کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے (۱۴۰)۔ ''الہلال'' کے سرکار مخالف رویے کی اشاعت نہ ہونے دینے کے لیے حکومت نے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ یہاں تک کہ سرحدی ریاستوں میں ''الہلال'' کے خریداروں کا نام خفیہ محکمے نے بلیک لسٹ میں لکھ لیا تھا (۴۱)۔ ''الہلال'' شروع سے ہی عوام کا پسندیدہ تھا۔ اس وجہ کر پہلے تین ماہ کے اندر ہی اس کے کبھی پرانے شمارے پھر سے چھاپے گئے (۱۴۲)۔ ''الہلال'' کی اس مقبولیت کا ہی نتیجہ تھا کہ جب اس سے ضمانت مانگی گئی تھی تو پورے ملک سے اس کے قارئین نے چندہ بھیجا تھا تا کہ ضمانت چکائی جا سکے (۱۴۳)۔ ''الہلال'' کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ کر ہی اس کے اثرات کا اندازہ لگانے کے لیے سرکار نے ایک آئی۔ بی۔ ایس۔ آفیسر مسٹر فلبی کو تعینات کیا تھا (۱۴۴)۔

البلاغ

سرکاری پالیسی کی وجہ کر ''الہلال'' بند ہو گیا تھا۔ دسمبر ۱۹۱۴ء میں مولانا آزاد نے ''الہلال'' پریس بھی کلکتہ کے اخبار محمدی کے مالک سے بیچ دیا (۱۴۵)۔ باوجود اس کے یہ مشکلات مولانا کا راستہ نہیں روک سکیں۔ وہ ضمانت مانگے جانے یا سرکاری سختی سے ہمت ہارنے والے نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسے واقعات اور بھی ہوں گے جیسا کہ لاہور کے اخبار ''زمیندار'' سے ضمانت مانگے جانے پر انھوں نے لکھا تھا کہ ''یہ ایک آزمائش کا مرحلہ ہے جہاں سکون ایک دم کے لیے بھی میسر نہیں ہے۔ ایک آزمائش ختم نہ ہو گی کہ دوسری شروع ہو جائے گی۔ یہ جاں نثاری اور قربانی کی بستی ہے۔ یہاں زندگی اسی کے لیے ہے جس کا دل قربانی کے ہر سوال کا جواب ہے'' (۱۴۶)۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس راستے پر چل کر رُکنے یا لوٹنے کا مطلب ہی شکست کو دعوت دینا ہے۔ انھوں نے صاف لکھا تھا کہ ''آزادی اسی کو ملتی ہے جو ہمت نہ ہارے اور دوڑتا رہے، کیوں کہ اگر تھک کر بیٹھے گا تو پھر شکاری کے پنجے سے رہا نہ ہو سکے گا۔ اسے قدم قدم پر جال و کمند ملیں گے۔ اگر کہیں بھی اس کا پاؤں الجھا اور ایک لمحے کے لیے بھی اس کی رفتار رُکی تو کبھی بھی آزادی نصیب نہ ہو گی کیوں کہ قاعدہ ہے کہ جو شکار ایک مرتبہ چھوٹ کر پھر پھنستا ہے اس کے ہاتھ پاؤں زیادہ مضبوط رسیوں سے باندھے جاتے ہیں۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے، قومی زندگی اور حیات سیاسی کی تعمیر ہے۔ یہاں کام مسلسل اور محنت لگاتار ہونی چاہیے'' (۱۴۷)۔ اسی لیے مولانا ''الہلال'' کے بند ہونے کے بعد رُکے نہیں بلکہ ان کا حوصلہ مضبوط اور ارادہ مزید پکا ہو گیا اور انھوں نے نئے سرے سے اشاعت کا نظم کر کے ایک سال بعد ہی اسے ''البلاغ'' کے نام سے دوبارہ شائع کیا۔ جمعہ ۱۲؍ نومبر ۱۹۱۵ء کو ''البلاغ'' کا پہلا شمارہ شائع کیا گیا۔ اس وقت مولانا مدرسہ دار الارشاد کے انتظامات اور ''ترجمان القرآن'' کی اشاعت کے کاموں میں مشغول تھے نیز دار الارشاد کے نظریات کو ظاہر کرنے، ان کی تشہیر کرنے اور ان کے لیے عوام کی حمایت حاصل کرنے کے مقصد سے ''البلاغ'' کی طرح کا ایک اخبار نکالنے کے پروگرام پر غور کر رہے تھے۔ اسی وجہ کر شروع میں وہ ''البلاغ'' پر زیادہ دھیان نہ دے سکے۔ ''البلاغ'' کچھ دنوں تک پندرہ روزہ کی شکل میں چھپا (۱۴۸)۔ مورخہ ۲۸؍ جنوری ۱۹۱۶ء سے اس کی شکل بھی ''الہلال'' کی طرح ہفت روزہ ہو گئی (۱۴۹)۔ ''البلاغ'' اور ''الہلال'' میں صرف نام کا فرق تھا۔ اخبار کی پالیسی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ''البلاغ''

نے عوام کے ذہن و دماغ پر جنگ کے بُرے نتائج کی ہولناکی و خوفناکی کا اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ یہ جنگ کے ذریعہ سماج پر پڑنے والے بُرے اثرات کو عوام کے سامنے رکھنے لگا۔ ''جنگ اور صلح'' کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں مولانا آزاد نے لکھا کہ ''اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جنگ کی وجہ سے دفعتہً افزائش نسلِ انسانی میں ایک نمایاں تزلزل پیدا ہو جاتا ہے۔ لاکھوں نوجوان مارے جاتے ہیں۔ ہزاروں عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں۔ قبیلے کے قبیلے، خاندان کے خاندان جلاوطنی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح ایک ملک کی گود اچانک ہی اپنے فرزندوں سے خالی ہو جاتی ہے'' (۱۵۰)۔

''البلاغ'' کے صفحات پر مولانا نے ترکی خلیفہ کی خلافت کی حمایت میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے شیرکوٹ ضلع بجنور کے مولانا مظہر الدین کا ایک مضمون جو عربی کتاب ''الخواطر فی الاسلام'' کا ترجمہ تھا، چھاپ دیا، جو خلافت کی حمایت کرتا تھا، تو اس کی وجہ کر مولانا کو قابل تعزیر مجرم ٹھہرایا گیا (۱۵۱)۔ مولانا آزاد کے تئیں سرکار کا نظریہ اچھا نہیں تھا۔ بنگال سرکار انھیں ایک باغی کی شکل میں دیکھتی تھی۔ لہٰذا یہ اخبار بھی زیادہ دنوں نہیں چل سکا اور جب مولانا کو بنگال سرکار نے ریاست بدر کرنے کا حکم دیا تو مارچ ۱۹۱۶ء میں اس اخبار کی اشاعت بھی سدا کے لیے بند ہو گئی (۱۵۲)۔

مسلم لیگ کے مقاصد میں تبدیلی کی کوشش

مولانا آزاد مسلمانوں کی مذہبی نشاۃ ثانیہ کے لیے کوشاں تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ملک کی سیاسی تبدیلیوں کی طرف سے ان کا دھیان ہٹ گیا تھا۔ سیاسی رہنماؤں کے کاموں کو بھی وہ مسلم کی ترقی یا تنزلی کے لیے اتنی ہی اہمیت دیتے تھے جتنا کہ مذہبی میدان میں علماء کے کاموں کو۔ انھوں نے مسلم لیگ کو کبھی عوام کی آواز یا ان کی خواہش کا بدل نہیں مانا (۱۵۳)۔ اس نظریے سے ان کا کہنا تھا کہ ''ہمارے لیڈروں نے ہمارے سامنے کوئی نہ کوئی کھلونا ایسا ڈال دیا جس کے مشغلے میں اُلجھ کر ہم کو اصلی کاموں کے اختیار کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ پہلے اعلیٰ تعلیم میں چالیس سال بسر کر دیے۔ پھر جب اس سے اُکتا گئے اور دیکھا کہ (مسلمان) قابو سے نکل رہے ہیں تو مسلم لیگ کا طلسم کھڑا کر دیا'' (۱۵۴)۔ ۱۹۰۶ء میں جب آغا خاں نمائندہ وفد شملہ میں لارڈ منٹو سے ملا تھا تو مولانا آزاد نے شملہ

میں اس طرح سے ہوئی گفتگو اور وہاں بنے منصوبوں کی مذمت کی تھی (۱۵۵)۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے حوالے سے انھوں نے خواجہ حسن نظامی کے ایک کاغذ پر لکھا کہ ''سب باتیں منظور ہیں باستثنائے شرکتِ مسلم لیگ'' (۱۵۶) یعنی مسلم لیگ میں شامل ہونے کے علاوہ باقی سب باتیں منظور ہیں۔ لیکن آگے چل کر جب لیگ میں قومی نظریے کو فوقیت حاصل ہوئی اور ڈاکٹر ایم۔ اے۔ انصاری اور حکیم اجمل خاں جیسے قوم پرست لوگ لیگ میں شامل ہوئے تو مولانا آزاد بھی لیگ میں شامل ہو گئے (۱۵۷)۔ ان قوم پرستوں میں صوبہ متحدہ سے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، وزیر حسن (بعد میں جسٹس سر سید وزیر حسن) بنگال سے مولانا فضل الحق، مولانا ابوالکلام آزاد، پنجاب سے محمد اقبال اور بہار سے مولانا مظہر الحق وغیرہ قابل ذکر تھے۔ ان کا شمار نوجوان طبقے میں ہوتا تھا۔ وزیر حسن کے مسلم لیگ کے سکریٹری بننے کے ساتھ ہی اس گروپ کا اثر بڑھنے لگا (۱۵۸)۔ اس سے متفکر ہو کر وسطی صوبہ کے چیف کمشنر مسٹر آر. ایچ. کریڈاک نے وائسرائے کے پرسنل سکریٹری کو ایک خط میں لکھا کہ اگرچہ لیگ پوری طرح حکومت پرستی کے جذبوں سے سرشار رہی ہے لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ جیوں ہی یہ تنظیم (نوجوان گروپ) طاقتور ہو جائے گی، بلاشبہ حکومت پرستی کے جذبات میں ایک قابل غور کمی آئے گی (۱۵۹) ایسا ہی ہوا بھی تھا۔ اس میں مرزا سلیم اللہ بیگ نے مسٹر گوکھلے کی تعلیم سے متعلق قرارداد کو منظور کرنے کے سلسلے میں ایک تجویز رکھی۔ کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت کی تو مولانا آزاد نے کہا تھا کہ صرف سرکاری خطابات پانے والے اور کونسل کے ممبران ہی اس کی مخالفت کر رہے ہیں (۱۶۰)۔

مولانا آزاد ''الہلال'' میں لیگ کے اُس دور کی قدیم لیڈرشپ کی نکتہ چینی کرتے رہتے تھے ''ہم میں جو گروہ آج لیڈری کی موٹر پر سوار ہے اس نے اپنی عزت و شوکت کی نمائش کا جوا کھیلنے کے لیے اپنی ملت مظلوم کو ایک بازیچہ بنا لیا ہے'' (۱۶۱)۔ اس وقت مسلم لیگ کے کاموں کو وہ سماجی و تہذیبی سبھی نقطۂ نظر سے نقصان دہ مانتے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا ''جن چیزوں میں وہ (لیگی رہنما) تقلید کرنا چاہتے ہیں انھیں میں اوّلین شے اجتہاد تھی اور ضرور تھا کہ اس تقلید کا سفر اس منزل سے شروع ہوتا۔ قینچی ہاتھ میں ہو تو خواہ مخواہ جی چاہنے لگتا ہے کہ کسی چیز کو تراشیں ... یورپ کے علم و عمل کے سرشتوں پر تو کیا چلتی کیوں کہ وہیں

کے کارخانوں کی بنی ہوئی تھی۔ بس اپنے یہاں کی چیز سامنے آگئی وہی بلا تامل تختۂ مشق بنی اور اس کی کاٹ بے روک ٹوک تھی۔ سب سے پہلے مشرقی علوم وفنون، تہذیب وتمدن اور اخلاق و عادات قومی سے اس کی آزمائش شروع ہوئی اور تھوڑی ہی دیر میں سیکڑوں برسوں کے صفحات و اوراقِ قدیمیہ پُرزے پُرزے تھے۔ پھر غریب مذہب کی باری آئی۔ یہ کپڑا دبیز تھا اس لیے مقراض اجتہاد کی روانی بھی زیادہ تیز و شدید تھی۔ پھر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلی آزمائش کا ہو چکا تھا اور جو کچھ باقی رہ گیا ہے نہیں معلوم اور کتنی گھڑیوں کا مہمان ہے'' (۱۶۲)۔

مسلم لیگ میں نوجوان طبقے کا اثر بڑھتا جارہا تھا۔ مولانا آزاد نے ''الہلال'' میں اس کا واضح اشارہ ان الفاظ میں دیا تھا کہ ''گزشتہ نصف صدی کے اندر بیسیوں تغیرات ہوئے۔ ضرور تھا غافل دلوں میں اُمنگ اور حرکت کی گدگدی پیدا ہوتی اور ساتھیوں کو دیکھ کر بلا قصد بھی پاؤں حرکت کرنے لگتے۔ مگر بدبختی یہ تھی کہ لگام ان ہاتھوں میں تھی جو لگام سے لگام کا نہیں زنجیر کا کام لیتے تھے اور بیداری کے قدرتی ولولوں اور اُمنگوں کو ہمیشہ اپنے مصنوعی خواب مقناطیسی کے عمل سے دبا دینا چاہتے تھے۔ دلوں میں جوش اٹھتا تھا اور آنکھیں مقصود کو ڈھونڈتی بھی تھیں لیکن جوش یا تو دبا دیا جاتا تھا یا اس کے لیے ایک غلط مصرف پیدا کر دیا جاتا تھا'' (۱۶۳)۔ وہ لیگ کی لیڈر شپ کو پوری طرح بدل دیے جانے کی حمایت میں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ''جب تک لیگ پر استبداد پرست اربابِ زر کا عنصر غالب ہے تب تک اس کی صلاح سے قوم کو مایوس رہنا چاہیے'' (۱۶۴)۔ اسی لیے وہ یہ مانتے تھے کہ لیگ مسلمانوں میں سیاسی بیداری نہیں پیدا کرسکتی۔ وہ اپنی اہمیت کھو چکی ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ''مسلمانوں کی یہ سیاسی تحریک عمر کے چوتھے سال ہی بستر پر پائی گئی'' (۱۶۵)۔

لیگ کے لیڈروں، لندن کی مسلم لیگ کے صدر سید امیر علی اور ہندستانی مسلم لیگ کے سکریٹری سید وزیر حسن کے اختلافات کا فائدہ اٹھا کر انھوں نے سید وزیر حسن کی حمایت کرتے ہوئے سید امیر علی کے تئیں مخالفت اور لیگ کی انگریز پرست پالیسیوں کے پیش نظر عوامی جذبات بھڑکانے والے لفظوں میں لکھا کہ ''بہتر ہے کہ مسلمان اب انھیں (امیر علی کو) پالیٹکس سے الگ ہی رہنے دیں۔ آخر کب تک بدبخت مسلمانوں کی پالیٹکس سر آغا خاں یا سید امیر کے بنگلے کا نام ہوگا'' (۱۶۶)۔ عام لوگوں کے ذہن میں لیگ کی تبدیل شدہ صورت کو قبول کرنے کے سلسلے میں گنجائش پیدا کرنے میں اس طرح کی تنقید نے کافی اثر

ڈالا۔ سر ویلنٹائن شیرول نے ''الہلال'' کے ان اثرات کے بارے میں لکھا تھا کہ مسلمانوں میں ایک نیا طبقہ آرہا ہے جو وطنیت کی سوچ میں ہندوؤں سے حصہ بٹانے کو تیار ہے۔ مسلمان بھارت سرکار میں ہی نہیں بلکہ برٹش سرکار میں بھی اعتماد چھوڑتے جا رہے ہیں (۱۶۷)۔ تریپولی پر اٹلی کے قبضے اور جنگ بلقان کا لیگ کی پالیسیاں بدلنے میں بڑا ہاتھ رہا (۱۶۸)۔ مشرق وسطیٰ کے ان واقعات سے مسلمانوں کو قومی تحریک میں شامل ہونے کی ترغیب ملی۔

مولانا آزاد نے ''الہلال'' نکالا تھا تو سید وزیر حسن نے ان کی مخالفت کی تھی، لیکن آہستہ آہستہ ''الہلال'' کے ذریعہ کی جانے والی لیگ کی نکتہ چینی سے وہ متفق ہو گئے اور انھوں نے نئی بیداری کے ساتھ چلنے کے لیے لیگ کے سیاسی نظریے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی۔ وہ بذات خود مولانا سے اس سلسلے میں بات چیت کرنے گئے اور دونوں کے درمیان نہایت ہی سنجیدہ طور پر تبادلۂ خیال ہوا۔ اس گفتگو کے بعد سید وزیر حسن نے ایک خط کی اشاعت کے ذریعہ لیگ کے نظریے میں تبدیلی سے متعلق لوگوں کا ردِ عمل جاننا چاہا اور متعلقہ اشخاص سے مشورہ بھی کیا (۱۶۹)۔ جنوری ۱۹۱۳ء میں لیگ کی مجلس عاملہ نے لیگ کے لیے ایک آئین منظور کرنے کے سلسلے میں مشورہ دینے کا فیصلہ کیا (۱۷۰)۔

لیگ کی فرقہ وارانہ شبیہ کو بدلنے کے لیے سبھی بیدار مغز لیڈران متفکر تھے۔ کلکتہ کے مشہور مسلم رہنما مسٹر سہروردی نے انجمن اسلام بمبئی نے لیگ کو ختم کرنے اور کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرنے کا مشورہ دیا تھا (۱۷۱)۔ لیگ و کانگریس کے بیچ تعاون کی شروعات بھی لیگ کی فرقہ وارانہ شبیہ کو بدلنے کے خیال کو لے کر ہوئی۔ محمد علی جناح دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو میں کانگریس کی نمائندگی کرتے تھے۔ بھائی چارے کے ماحول میں ۲۲؍مارچ ۱۹۱۳ء کو لکھنؤ میں سر محمد شفیع کی صدارت میں ایک اجلاس ہوا۔ اس میں لیگ کے پرانے آئین پر غور کیا گیا اور اس میں کچھ نئی تبدیلیاں کی گئیں۔ لیگ کے اسی اجلاس میں پہلی بار سروجنی نائیڈو وغیرہ کچھ ہندوؤں نے بھی حصہ لیا تھا (۱۷۲)۔ لیگ کے قیام کے وقت جو مقاصد طے کیے گئے تھے وہ اس طرح تھے:

(۱) ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں برٹش سرکار کے تئیں جذبۂ وفاداری پیدا کرنا اور حکومت کے کسی عمل کے تعلق سے مسلم فرقے میں داخل ہو جانے والی کسی بھی طرح کی غلط فہمی اور بدگمانی کو دور کرنا۔

(۲) ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا نیز باعزت طریقے سے ان کی مانگوں اور ضرورتوں کو سرکار کے سامنے پیش کرنا۔

(۳) لیگ کے درج بالا مقاصد کے تئیں غیر متعصب ہو کر ہندوستانی مسلمانوں میں پیدا شدہ ایسے کسی بھی خیال کی تشہیر کو روکنا جو ملک کے کسی دوسرے فرقے کے سلسلے میں متعصبانہ ہو(۱۷۳)۔

مسلمانوں کو کانگریس کے ساتھ جانے سے روکنے کے لیے سرکاری کوششوں سے مسلم لیگ وجود میں آئی تھی (۱۷۴)۔ لیکن سرکاری کوششوں کے ذریعہ لیگ کے قیام کے بعد بھی مسلمانوں کے وطن پرست ہونے کا خطرہ سرکار کے سامنے بنا ہوا تھا جو ۱۹۱۳ء میں واضح ہو گیا اور لیگ میں قوم پرستانہ لہجے کی فوقیت ظاہر کرنے والے نئے مقاصد طے کیے گئے، جو اس طرح تھے:

(۱) اس ملک کے عوام میں برٹش تاج کے تعلق سے حاکم پرستی کے جذبات کو بنائے رکھنا اور بڑھاوا دینا۔

(۲) ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی اور دیگر حقوق ومفاد کی حفاظت اور اس کی توسیع کرنا۔

(۳) ہندوستانی مسلمانوں اور دوسرے فرقوں کے مابین دوستی واتحاد کو بڑھاوا دینا۔

(۴) درج بالا مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر برٹش تاج کے تعاون اور محافظت میں رہ کر ہندوستان کے لیے مناسب خود مختار طرز حکومت اور قومی ایکتا کو بڑھاوا دینا، ہندوستانی عوام کے درمیان آپسی اتحاد و میل ملاپ کے جذبات کو ترقی دینا اور دوسرے فرقوں سے مذکورہ مقاصد کے حصول کے لیے تعاون کر آئینی ذرائع سے موجودہ طرز حکومت میں لگاتار اصلاح کا حصول (۱۷۵)۔

مولانا آزاد اس کے چوتھے مقصد میں خود مختار طرز حکومت کے ساتھ لفظ ''مناسب'' جوڑے جانے کے حامی نہیں تھے۔ انھوں نے اس کے پاس ہو جانے کے بعد بھی اس کو منظور نہیں کیا۔ ''الہلال'' میں اس اجلاس کا تذکرہ کرتے وقت انھوں نے طنز کرتے ہوئے لکھا کہ ''سیلف گورنمنٹ کے ساتھ سوٹیبل کی قید پاس ہوگئی اور کیوں نہ ہوتی'' (۱۷۶)۔ مولانا محمد علی ان کے اس اختلاف سے متفق نہیں ہو سکے تھے اور یہ اسی طرح منظور کر لیا گیا تھا(۱۷۷)۔ دسمبر ۱۹۱۳ء میں لیگ کے سالانہ اجلاس میں ان تبدیلیوں کو منظور کر لیا گیا(۱۷۸)۔ نئے

مقاصد کی بحالی سے لیگ کی انگریزی حکومت پرستی کے جذبات میں کمی نہیں آئی تھی پھر بھی ان تبدیلیوں سے ہی یہ واضح ہو گیا تھا کہ اب لیگ پہلے کی بہ نسبت قوم پرستی کے جذبے سے زیادہ نزدیک آگئی ہے۔ پہلے لیگ کا مقصد مسلمانوں میں برٹش سرکار کے تئیں شاہ پرستی کو منظور کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے ساتھ ان کی توسیع کو بھی جگہ دی گئی تھی لیکن سب سے خاص فرق یہ تھا کہ لیگ بھی کانگریس کی طرح بھارت کے لیے خود مختار طرز حکومت کی ضرورت کو ماننے لگی تھی۔ برٹش سرکار کے لیے یہ بات بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جس لیگ کی تعریف میں انگلینڈ میں لندن ٹائمز جیسے اخبار اس طرح کی باتیں چھاپتے تھے کہ ''مسلم لیگ مثل سوراج کوئی ناقابل عمل دوائی نہیں پیش کرتی۔ وہ اصلاحات کو بہ نسبت کانگریس کے بہت زیادہ شکر آمیز ہمدردی کے ساتھ قبول کرتی ہے'' (۱۷۹)۔ اسی لیگ کے مقاصد میں ان تبدیلیوں کے وقوع پذیر ہونے کے ساتھ ہی حکومت کے اعلیٰ دماغ حلقوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری نے مرکزی خفیہ پولس کے سربراہ سر چارلس کلیولینڈ کو ایک خط لکھ کر جدید مقاصد کے شمار نمبر۲ کی طرف ان کا ذہن مبذول کرایا(۱۸۰)۔ سر چارلس کلیو لینڈ نے اس پر اپنی تشویش ان الفاظ میں ظاہر کی ـــ ''مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہے کہ میری رائے میں ہمارے پرانے دوست مسلم لیگ کا نیا آئین ایک غلط و پُرخطر پالیسی کی تشکیل کرتا ہے۔ اگر میں اس وقت ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہوتا تو اپنے ہندوستانی مسلم دوستوں کو لیگ میں شامل ہونے کے خلاف مشورہ دینے کو اپنا فرض سمجھتا'' (۱۸۱)۔ تبدیل شدہ مقاصد کی چوتھی دفعہ، جسے سر سید وزیر حسن نے قوم پرستی کی طرف اہم قدم بتایا تھا(۱۸۲)، پر تبصرہ کرتے ہوئے محکمۂ داخلہ کے آر۔ ایچ۔ کریڈاک نے لکھا کہ ''خود مختار حکومت کے مقاصد کے حصول کے لیے اب لیگ نے کانگریس سے حتمی طور پر معاہدہ کر لیا ہے اور اس طرح ایک غیر متعین آدرش کو واضح طور پر ایک ایسا مقصد سمجھنے کی بھول کی ہے، جس کے لیے ہندوستانی ترقی کے موجودہ حالات میں عملی قدم اٹھانے کا مطلب آفیسروں سے تصادم اور پُرتشدد سیاسی ایجی ٹیشن ہی ہو سکتا ہے'' (۱۸۳)۔

اس طرح ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، محمد علی جناح، سید وزیر حسن اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے لیڈروں کی مشترکہ کوششوں سے لیگ کے پرانے مقاصد میں تبدیلی کر

حصولِ آزادی کو بھی اس کے مقاصد میں شامل کر لیا گیا۔

مولانا آزاد نے ''الہلال'' کے توسط سے عوام میں اور ذاتی اثرات و نظریات سے مسلم لیگ میں ایسا ماحول تیار کرنے میں غیر معمولی تعاون دیا کہ لیگ اور کانگریس جو مختلف لہروں کی طرح الگ الگ بہہ رہی تھیں ان میں لیگ کے بہاؤ پر ایک باندھ بنا کر اسے کانگریس کی طرف موڑنے میں بھاری کامیابی ملی۔ تنہا اسی عمل سے مولانا آزاد نے جدوجہد آزادی میں ایک ایسی اہم تبدیلی لانے میں تعاون دیا جو آگے چل کر حصولِ آزادی کے راستے میں سنگ میل ثابت ہوا۔ اس تبدیلی سے لیگ اور کانگریس کے بیچ نزدیکیاں بڑھنا شروع ہوئیں۔ ۱۹۱۵ء میں لیگ کے بمبئی اجلاس میں محمد علی جناح نے یہ تجویز رکھی کہ ایک ایسی کمیٹی بنائی جائے جسے دوسری پارٹیوں سے گفتگو کرنے کا حق حاصل ہو۔ جناب فضل الحق اور مولانا آزاد نے اس تجویز کی توثیق کی اور یہ باتفاق رائے منظور کر لیا گیا(۱۸۴)۔ فروری ۱۹۱۶ء میں لیگ کے بمبئی اجلاس میں کچھ لیگی مسلمانوں نے لیگ و کانگریس کے اس میل جول پر اعتراض ظاہر کیا تھا جسے سید علی امام نے خاموش کر دیا تھا۔ مولانا نے اس پر اپنا ردِّعمل ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا ''موجودہ حالات میں کانگریس اور لیگ کا یکجا ہونا اور مل جل کر ایک کمیٹی بنانا ان کے (مخالفین کے) مقاصد کے لیے کس درجہ ہولناک ہے''۔ لیگ و کانگریس اتحاد کی تائید کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ ''کانگریس و مسلمانوں کی تفریق کو ایک بت بنا کر مسلمانوں نے پوجا ہے اس لیے اسکا پاش پاش ہونا اہم واقعہ ہے'' (۱۸۵)۔ نومبر ۱۹۱۶ء میں مسٹر سریندر ناتھ بنرجی کی صدارت میں کانگریس اور لیگ کے نمائندوں کی ایک مشترکہ نشست میں آپسی تعاون سے متعلق کچھ تجاویز پاس کی گئیں(۱۸۶)۔ لیگ اور کانگریس کی قربت اس حد تک بڑھی کہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۱۶ء کو دونوں نے انگریزوں کے خلاف قومی مقاصد کی کامیابی کے لیے لکھنؤ میں ایک ساتھ اپنے اجلاس کیے اور وہاں باہمی تعاون کرنے کے لیے ایک سمجھوتہ کیا۔ حکیم اجمل خاں نے اس کو سارے ملک کے لیے یکساں مفید اور قابل فخر بتایا تھا(۱۸۷)۔

خفیہ انقلابی سرگرمیاں

بنگ بھنگ مخالف تحریک کے زمانے میں مولانا کے دل میں جو انقلاب کا بیج انکور

پھوٹ رہا تھا اب اس نے ایک درخت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس کی جڑیں گہری ہو چکی تھیں۔ بظاہر اس کی شاخیں ''الہلال'' و ''البلاغ'' کی شکل میں پھل پھول رہی تھیں لیکن ان کو غذا انقلابی سرگرمیوں سے حاصل ہوتی تھی۔ جہاں ایک طرف مولانا آزاد اپنے اخبارات کے توسط سے حکومت کی مخالفت کر رہے تھے وہیں دوسری طرف وہ خفیہ انقلابی سرگرمیوں میں بھی مشغول تھے۔ مسلمانوں میں برٹش مخالف بیداری لانے کے لیے بنائے گئے مراکز نے آگے چل کر اس میں بڑا تعاون دیا تھا۔ ایسے مراکز لکھنؤ، دیوبند اور کلکتہ میں قائم کیے گئے تھے، جن کے انتظامی امور کو چلانے کا ذمہ بالترتیب مولوی عبدالباری، مولانا محمود حسن، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مشتاق احمد انصاری و مولانا آزاد کے سر تھا(۱۸۸)۔ اس وقت کابل میں قائم راجہ مہندر پرتاپ کی غیر مستقل آزاد ہند سرکار نے مولانا محمود الحسن کی مدد سے انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں ترکی کی مدد حاصل کرنے کے لیے کوشش کی تھی(۱۸۹)۔ ہندوستان اور کابل کے درمیان تعلق بنائے رکھنے کے لیے عبید اللہ سندھی اور محمد میاں نامی دو اشخاص بہت زیادہ سرگرم تھے۔ مولانا محمود الحسن نے اپنے شاگرد عبید اللہ سندھی سے دلی کے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا تعارف کرایا تھا اور ڈاکٹر انصاری نے عبید اللہ سندھی کی ملاقات مولانا آزاد سے کرائی تھی(۱۹۰)۔ مولانا آزاد نے عبدالرحیم اور فضل الٰہی نامی دو اشخاص کو بھی کابل بھیجا تھا۔ انھوں نے جولائی سے ستمبر ۱۹۱۴ء کے دوران عبید اللہ سندھی کو ہندوستان میں اپنی کارروائیاں چلانے کے لیے مبلغ تین سو روپے کا چیک بھی دیا تھا(۱۹۱)۔ ریشمی رومال تحریک سے متعلق بیٹھک حکیم اجمل خاں کے مکان پر ہوا کرتی تھی(۱۹۲)۔ مولانا آزاد، حکیم اجمل خاں اور عبید اللہ اپنے کاموں کے سلسلے میں آپسی رائے مشورے کرتے رہتے تھے۔ مولانا آزاد انگریزوں کے خلاف انقلابیوں کی ایک جماعت تیار کرنا چاہتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء میں انھوں نے نوجوانوں کو سیاسی تعلیم دینے کے مقصد سے حاجی مصلح الدین کے ذریعہ دی گئی پانچ بیگھہ زمین میں کلکتہ کے چنگری گھاٹ روڈ پر ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد ڈالی تھی، لیکن پیسے کی کمی کی وجہ کر یہ کام صحیح طور پر شروع ہونے سے پہلے ہی ٹھپ ہو گیا(۱۸۳)۔ ماہ نومبر کی ۱۴ر تاریخ کو مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، حکیم اجمل خاں اور دو ہندو لیڈروں کی ایک بیٹھک اجمل خاں کے مکان پر ہوئی تھی۔ اس میں انگریز مخالف کارروائیوں کے بارے میں رائے مشورہ کیا گیا تھا۔ ۴ر دسمبر کو دوبارہ مولوی عبید اللہ

اور مولانا آزاد نے آپس میں مشورے کیے (۱۹۴)۔ اس کے بعد مولانا محمود الحسن اور عبید اللہ
سندھی کے ساتھ مل کر جنوری ۱۹۱۵ء میں بنائے گئے ایک پروگرام کے مطابق مولانا آزاد
نے مولوی عبید اللہ کے ساتھ دتی میں کچھ طلبا سے ملاقات کی اور فروری میں انھیں کابل بھیج
دیا (۱۹۵)۔ ان کے بھیجے جانے کے سلسلے میں مولوی برکت اللہ، مولانا آزاد اور ڈاکٹر
انصاری کے درمیان خط وکتابت ہوئی تھی (۱۹۶)۔ بعد میں انھوں نے سرحدی علاقوں کے
انقلابیوں کی خواہش کے مطابق ایک بنگالی عبدالکریم برلاسی کو ڈاکٹر صدرالدین کے نام سے
اور ایک بم بنانے کا کام جاننے والے آدمی کو کابل بھیجا (۱۹۷)۔ مولانا آزاد اس طرف سے
سدا بیدار تھے کہ ملک میں انقلابی تنظیم کو مضبوط بنانے کے لیے تربیت یافتہ نوجوانوں کی کمی
پوری ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں ان کی کلکتے کی کوشش ناکام ہو چکی تھی، لیکن چنگری گھاٹ
کے تعلیمی ادارے کے منصوبے کی ناکامی کے بعد بھی مولانا چین سے نہیں بیٹھ سکے اور
انگریزوں کے خلاف بغاوت کے مقصد سے نوجوانوں کو تیار کرنے کے لیے انھوں نے اگست
۱۹۱۵ء میں ۴۵۔ رپن اسٹریٹ کلکتہ میں دارالارشاد نام سے ایک درسگاہ قائم کی (۱۹۸)۔
مولانا آزاد بذاتِ خود جانچ پڑتال کرنے کے بعد ہی اس میں کسی طالب علم کو داخلے کی
اجازت دیتے تھے۔ داخلہ پانے سے پہلے طالب علم کو اپنی گزشتہ زندگی کی تاریخ بتانی پڑتی
تھی اور مولانا آزاد کے مختلف سوالوں کے تشفی بخش جواب دینے ہوتے تھے۔ دارالارشاد میں
تعلیم پانے والے طلبا صرف اپنے ہم جماعت طالب علموں اور مولانا آزاد سے ہی مل سکتے
تھے نیز گفتگو کر سکتے تھے۔ مولانا ان طلبا کو خود زبانی طور سے تعلیم دیا کرتے تھے۔ ادارے کے
باہر کے لوگ یہ نہیں جان سکتے تھے کہ ادارے میں کیا پڑھایا جاتا ہے۔ بنگال سرکار کے ذریعہ
مولانا آزاد کو بنگال بدر کر دینے کے احکام سے یہ منصوبہ بھی درمیان میں ہی ختم ہو گیا (۱۹۹)۔

حکیم اجمل خاں، جو ایک لمبے عرصے تک مولانا آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری
رہے تھے، کے مطابق مولانا آزاد نے انقلابی کاموں کے سلسلے میں ہی اقبال شیدائی نامی
ایک شخص کو کابل بھیجا تھا، جسے بعد میں راجہ مہندر پرتاپ کی سرکار میں جنگ اور اطلاعات و
نشریات کے محکمے کا نائب وزیر بنایا گیا تھا (۲۰۰)۔

۱۹۱۵ء میں مولانا آزاد دیوبند مدرسے میں صوبۂ متحدہ کے موجودہ گورنر لارڈ میسٹن
کے اعزاز میں ہونے والی تقریب میں شامل ہوئے تھے۔ وہاں انھوں نے مدرسے کے صدر

مدرس مولانا محمود الحسن کو سرحدی صوبوں کے انقلابیوں کی معاونت کے پیش نظر وہاں بھیجنے
کے لیے سات ہزار روپے دیے تھے (۲۰۱)۔ مولانا آزاد کی خواہش کے مطابق مولانا محمود
الحسن بھی ۱۸ر ستمبر ۱۹۱۵ء کو حجاز کے سفر پر چلے گئے (۲۰۲)۔ اس کے بعد مولانا آزاد کے
کہنے سے مولوی عبید اللہ بھی کابل چلے گئے اور وہاں جا کر ان طلبا سے مل گئے، جنھیں فروری
میں مولانا آزاد نے بھیجا تھا (۲۰۳)۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ انقلابی کاموں کو سارے
ملک میں پھیلایا جائے۔ وہ ملک کے دوسرے حصوں میں انقلابی سرگرمیوں کے مراکز قائم
کرنا چاہتے تھے۔ ان کی ہدایت کے مطابق پشاور کے حاجی شمس الدین نے نوری منزل میں
ان سرگرمیوں کے لیے ایک ادارہ قائم کیا تھا (۲۰۴)۔ مولوی عبید اللہ نے انگریز مخالف
کاموں کو طاقت بہم پہنچانے کے لیے ایک فوج بھی منظم کی تھی جسے "آرمی آف گاڈ" کا نام
دیا گیا تھا۔ مولانا آزاد کو اس میں "لفٹننٹ جنرل" کا عہدہ تفویض کیا گیا تھا (۲۰۵)۔ اپریل
۱۹۱۶ء میں مولانا آزاد خود بھی یہ منصوبہ بنا رہے تھے کہ مولوی عبید اللہ کے پاس کابل چلے
جائیں لیکن اسی وقت یہ سازش افشا ہو گئی تھی (۲۰۶)۔ سازش کی جانکاری سے حکومت مزید
ہوشیار ہو گئی۔ اسی دران مولانا آزاد کے دتی داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی (۲۰۷) لیکن
مولانا کے خفیہ انقلابی کاموں میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی۔ آگے چل کر جب وہ رانچی کی
نظربندی سے رہا ہوئے تب بھی اس طرح کے کاموں میں لگے رہے تھے نیز انقلابیوں کی
مدد کرنا نہیں چھوڑا تھا۔ رہائی کے بعد انھوں نے عبدالرزاق ملیح آبادی سے کسی جگہ سے
چوبیس پستول منگوا کر کسی انجان شخص کے توسط سے کسی نامعلوم مقام پر بھجوایا تھا (۲۰۸)۔
اس طرح ۱۹۰۵ء میں انقلابیوں سے تعلقات کے بعد وہ ۱۹۲۰ء تک کئی طرح کی متعلقہ
سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ ۱۹۲۰ء میں کانگریس سے تعلق قائم ہونے کے بعد وہ ان کاموں
سے الگ ہو گئے تھے اور بعد میں انھیں ناپسند کرنے لگے تھے (۲۰۹)۔

قیامِ رانچی

انقلابی سرگرمیوں اور جذبۂ قومیت کے محرکات اُجاگر کرنے والے مضامین کے
ساتھ ہی مولانا آزاد کے وطن پرستانہ جذبات بھی عوامی جلسوں میں کی جانے والی ان کی
تقاریر کے ذریعہ لوگوں کے دلوں تک پہنچ رہے تھے۔ جہاں وہ اپنے مضامین میں یہ لکھ کر

سرکاری پالیسی پر طنز کر رہے تھے کہ ''ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے اگر انگلستان میں انگریزوں کو سول سروس کی تعلیم دلانیکی غرض سے ہر سال دو لاکھ چالیس ہزار روپیہ خزانہ ہندی سے ادا کرنے پڑتے ہیں اور پھر ان سویلینوں سے ہندوستانیوں کی قسمت وابستہ ہوتی ہے تو ان کو رعایا کی عبادت گاہ ڈھانے اور خانقاہیں گرانے کے احکام نافذ کرانے میں بھی باک نہیں ہوتا، جب بھی کچھ نہ کہو۔ ... اگر بدراس سدرن ریلوے میں ایک انگریز تین ہندوستانیوں کو اس لیے گولی مار دے کہ وہ اس کی میم کو گالی دے رہے تھے تو اس قسم کے غیر معمولی حوادث کو معمولی مان لیا کرو'' (۲۱۰)۔ ایسے طنز آمیز مضامین کے ساتھ ہی وہ سرکار کی مخالفت کرنے کے لیے عوامی جلسوں کے ذریعہ لوگوں کو تیار بھی کر رہے تھے۔ ۲ر فروری ۱۹۱۳ء کو کلکتہ کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے مذہب کے نام پر ہو رہے مظالم روکنے کے لیے مسلمانوں کو کھل کر آگے آنے کی دعوت دی۔ اس کا اتنا اثر ہوا کہ جلسے میں تقریباً ہزار روپیہ بطور چندہ ترکی کی مدد کے لیے جمع ہو گیا نیز عورتوں نے اپنے زیورات دے کر اس تعاون میں حصہ لیا (۲۱۱)۔ جولائی ۱۹۱۳ء کو ایک تقریر میں انھوں نے کانپور مسجد سانحے پر سرکار کی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ یو پی سرکار نے جو کچھ کیا وہ مذہبی آزادی میں مداخلت ہے۔ اسی وقت ''الہلال'' میں انھوں نے سرکار پر الزام لگاتے ہوئے لکھا کہ کانپور کا بلوہ پولس کے تشدد سے ہوا (۲۱۲)۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۳ء کو کلکتے میں کی گئی تقریر میں انھوں نے کہا کہ ''ہمارے مذہب نے ہم کو سکھایا ہے کہ حکم کسی طاقت کے لیے نہیں ہے اور کوئی انسان انسانوں پر محض اپنے تخت و تسلط کے زور سے حکومت کرنے کا حق نہیں رکھتا'' (۲۱۳)۔ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۱۳ء کو انھوں نے برٹش سرکار سے انصاف کی مانگ کرتے ہوئے اپنی ایک تقریر میں کلکتہ میں کہا کہ ''انگلستان کی سرزمین انصاف و حقوق کی ضامن سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بسنے والوں نے صدیوں کی جدو جہد سے اپنے حقوق حاصل کیے ہیں اور حکومتوں کو شکستیں دی ہیں۔ پس ہم بھی آج انگلستان سے وہی چاہتے ہیں جو اس نے چاہا'' (۲۱۴)۔ مولانا آزاد اسلام کو آزادی کا قائم کرنے والا اور جبر کا مخالف مانتے تھے (۲۱۱۵)۔ اسلام کے مطابق وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اسلام کو ماننے والے انگریز پرست بنیں۔ لہٰذا ۲۷ر ستمبر ۱۹۱۴ء کو راولپنڈی میں ''آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کانفرنس کی انگریز پرست پالیسیوں کی مخالفت کی اور تعلیمی

نظام کو مسلمانوں کے لیے مکمل طور سے اسلامی بنیادوں پر ڈھالنے کی زوردار سفارش کی (۲۱۶)۔ ملک کا دورہ کرتے ہوئے انھوں نے ۶ر جنوری کو لاہور میں انٹر کالج مسلم ایسوی ایشن میں ایک ہزار طالب علموں کے سامنے تقریر کی۔ ۸ر جنوری ۱۹۱۵ء کو لاہور میں موچی گیٹ پر ۶ ہزار لوگوں کے مجمع میں تقریر کے دوران انھوں نے مسلمانوں کو برٹش سرکار کی ،اقت پر اعتماد کرنے کے سلسلے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان صرف خدا کے حضور جوابدہ ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اگر ان پر شاہ پرستی کا دعویٰ کرے تو ان کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ تعاون کریں (۲۱۷)۔

مولانا آزاد کے حکومت مخالف رویے سے سرکار اتنی پریشان ہو اٹھی تھی کہ ۱۹۱۵ء میں ہی دارالعلوم دیوبند میں منعقدہ ایک تقریب میں جب حکیم اجمل خاں و مولانا محمد علی کے ساتھ انھیں بھی بلایا گیا تو سرکاری آفیسروں نے باقی لوگوں کو تو جلسے میں حصہ لینے سے نہیں روکا لیکن مولانا آزاد کی شمولیت پر اعتراض جتایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا آزاد کو اسٹیج پر نہیں آنے دیا گیا۔ وہ مجبور ہو کر جلسہ گاہ سے دور مدرسے کی لائبریری میں ٹہلتے رہے (۲۱۸)۔ مولانا آزاد کی سرگرمیاں دیکھتے ہوئے نومبر ۱۹۱۵ء میں صوبۂ متحدہ کی سرکار نے ڈی. آئی. آر. کی دفعہ ۳ کے مطابق مولانا کو ریاست کی سرحد سے باہر رہنے کا حکم صادر کر دیا (۲۱۹)۔

مولانا آزاد نے اپنے ذریعہ قائم کردہ تعلیمی ادارہ ''دارالارشاد'' میں مارچ ۱۹۱۶ء میں ایک تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو انگریزی شہنشاہیت و حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے کھلے طور پر دعوت دی اور کہا کہ قرآن مسلمانوں کے غلام بنے رہنے کے خلاف ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں، جو ایک مرتبہ مسلمانوں کے زیر حکومت رہ چکا ہے، یہ مسلمانوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے آئینی اقتدار کو پھر سے حاصل کرنے کے لیے کوشش کریں (۲۲۰)۔

کلکتہ کی سرکار اس بات پر بوکھلا اُٹھی۔ ''الہلال'' بند ہو جانے کے بعد مولانا آزاد تب ''البلاغ'' شائع کر رہے تھے۔ سرکار نے اسے بھی ملکی حفاظتی قوانین کے تحت ضبط کر لیا اور اسی کے تحت ۲۸ر مارچ ۱۹۱۶ء کو ایک حکم نامہ جاری کر کے مولانا آزاد کے کلکتہ میں رہنے یا بسنے پر پابندی عائد کر دی (۲۲۱)۔ حکم نامے میں چار دنوں کے اندر بنگال چھوڑ کر کسی اور جگہ چلے جانے کا حکم صادر کیا گیا تھا بعد میں یہ مدت چار دنوں کی جگہ پر ایک ہفتہ بڑھا دی گئی لیکن مولانا آزاد اس سے گھبرائے نہیں۔ انھیں خدا پر بھروسہ تھا اس لیے وہ سرکار کے

سامنے جھکے نہیں بلکہ استحکام کے ساتھ سامنا کرتے رہے اپنے استحکام کا ثبوت انھوں نے قرآن کی اس آیت کے ذریعہ دیا ''اے میرے بندو کہ مجھ پر ایمان رکھتے ہو، یقین کرو کہ میری زمین بہت وسیع ہے اور کسی ایک ٹکڑے میں محدود نہیں۔ پس میرے ہی آگے جھکو اور میری ہی بندگی کرو''۔ انھوں نے صاف طور سے لکھا تھا کہ خدا کا حکم مل چکا ہے، یہ احکام (سرکاری حکم) بالکل بے اثر ہیں (۲۲۲)۔ بنگال میں ساٹھ ہزار مسلمانوں نے ایک میمورنڈم دے کر سرکار سے حکم اخراج رد کرنے کی مانگ کی جو منظور نہیں کی گئی۔ بنگال سرکار کے فرمان خروج کی نقل میں بمبئی اور پنجاب کی سرکاروں نے بھی اپنے علاقوں میں مولانا کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا (۲۲۳)۔ یوپی پہلے ہی اس کا اعلان کر چکا تھا لہٰذا ۷/اپریل ۱۹۱۶ کو انھیں رانچی میں پناہ لینی پڑی (۲۲۴)۔ رانچی میں بھی مولانا خاموش نہیں بیٹھ سکے۔ ریشمی رومال سازش کی کارروائیوں کے لیے وہ اس وقت مولانا حسرت موہانی سے رابطہ بنائے ہوئے تھے (۲۲۵)۔ عبدالرزاق ملیح آبادی کے مطابق رانچی میں نظر بند رہتے ہوئے انھوں نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا (۲۲۶)۔ میرے خیال میں یہ کام نظر بندی سے پہلے کیا گیا کیوں کہ نظر بندی میں کسی سے ملنا جلنا بآسانی ممکن نہیں تھا۔ مدرسہ وغیرہ قائم کرنے کی وجہ سے ہی انھیں نظر بند کیا گیا ہوگا۔ ان کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے ۸/جولائی ۱۹۱۶ء سے انھیں نظر بند کر دیا گیا (۲۲۷)۔ نظر بندی کے دوران مولانا آزاد پر بہار اور اُڑیسہ کی سرکار نے سخت پابندی لگا دی تھی۔ ۱۹۱۵ء کے ترمیم شدہ فوجداری قانون کی دفعہ ۲ کے تحت انھیں درج ذیل احکام دیے گئے:

(۱) نظر بندی کی نوٹس دیے جانے کے ۲۴ گھنٹے کے اندر رانچی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولس کے سامنے حاضر ہو۔

(۲) رانچی کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولس کی ہدایت کے مطابق اپنی تصویر اور انگلیوں کے نشان دو۔

(۳) پولس آفیسر کی خواہش کے مطابق اپنے دستخط اور تحریر کے نمونے دینے ہوں گے۔

(۴) اس کے بعد ڈی. ایس. پی. کے بتائے ہوئے وقت اور مقام پر رانچی کے تھانہ انچارج کے سامنے حاضر ہو۔

(۵) اگلا حکم ملنے تک ایس. پی. کے بتائے مقام پر رہو۔

(۶) تمھیں شام ۶ بجے سے صبح ۶ بجے تک یہ جگہ چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔

(۷) رانچی پولس تھانے کے حدود کے اندر مستقل طور سے رہنے والوں کے علاوہ دیگر لوگوں سے ملنے جانے یا اپنے مکان پر ان سے ملنے سے قبل ایس. پی. کی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے۔

(۸) تمھارے پاس آنے والی ہر طرح کی ڈاک چاہے وہ خط ہو، پارسل ہو یا دیگر چیزیں یا تار، وہ چاہے تمھارے پتے پر آئیں یا کسی کی معرفت، انھیں بغیر کھولے ہی فوراً رانچی کے تھانہ انچارج کے پاس جمع کرنا ہوگا۔

(۹) رانچی کے تھانہ انچارج کے ذریعہ رانچی کے ایس. پی. کو پہلے سے دکھا کر جانچ کرائے بغیر تم کسی کے ساتھ خط و کتابت نہیں کرو گے۔ کسی بھی اخبار یا دوسرے پرچوں کے لیے سیدھے یا کسی توسط سے تم کوئی مضمون نہیں لکھو گے، چاہے وہ برٹش بھارت کے اندر چھپتے ہوں یا اس کے باہر۔

(۱۰) ایس. پی. کے ذریعہ بتائے گئے وقت پر دن میں ایک بار تھانہ انچارج رانچی کے سامنے حاضر ہونا ضروری ہے۔

(۱۱) تھانہ انچارج سے بڑا کوئی آفیسر یا مجسٹریٹ ہر وقت تمھارے پاس جانے کا مجاز ہوگا۔

(۱۲) اگر بیماری کی وجہ کر شرط نمبر ۱۰ کے مطابق حاضر نہ ہو سکو تو اپنی بیماری کی اطلاع دو اور آفیسر کو اپنا معائنہ کرنے دو تاکہ وہ جانچ کر کے مطمئن ہو سکے۔

(۱۳) احکام نمبر ۲ اور ۳ کی خلاف ورزی کرنے پر تین سال کی سزا یا دو ہزار روپیہ جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکتی ہیں (۲۲۸)۔

مولانا کی نظر بندی کے خلاف شدید ردعمل ہوا۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں لیگ کے لکھنؤ اجلاس میں جناب اے. کے. فضل الحق نے مانگ کی کہ مولانا آزاد پر جو الزام لگائے گئے ہیں ان کے لیے مولانا کو عدالت کے سامنے حاضر کیا جانا چاہیے۔ اس اجلاس میں کہا گیا کہ خفیہ محکمہ سرکار کو گمراہ کر رہا ہے۔ یہ بات ناقابل اعتبار ہے کہ مولانا آزاد برٹش سرکار کو ہندوستان سے باہر نکالنے کے خواب دیکھیں (۲۲۹)۔ خود مولانا آزاد نے بھی اپنی نظر بندی کے خلاف سرکار کو چیلنج کیا لیکن سرکار نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا (۲۳۰)۔ ان کی نظر بندی کے دوران مولوی فضل الحق وغیرہ لوگوں نے ۶/فروری ۱۹۱۷ء کو سرکار سے یہ درخواست کی

کہ نظر بندی کے دوران اچھے کردار کی وجہ کر مولانا آزاد کو کلکتہ واپس لوٹنے کی اجازت دی جائے۔ بنگال سرکار کے ایک آفیسر مسٹر ایچ. ایل. اسٹیونس نے ۱۳؍ مارچ ۱۹۱۷ء کو ایک خط لکھ کر مرکزی وزارت داخلہ کے محکمۂ خفیہ کے ڈائرکٹر مسٹر چارلس کلیولینڈ سے اس بابت رائے مانگی۔ جواب میں انھوں نے ۲۳؍ مارچ کو ایک خط میں لکھا کہ حکومت ہند ریشمی رومال سازش کے فیصل ہونے تک اسے روکے رکھنا چاہتی ہے اس لیے مولانا کی رہائی نہیں ہوسکتی (۲۳۱)۔ ۲۱؍ فروری ۱۹۱۷ء کو مولانا مظہر الحق اور پنڈت مدن موہن مالویہ کے ذریعہ اسمبلی میں سرکار سے مولانا آزاد کی رہائی کے سلسلے میں پوچھے گئے سوالوں کے جواب میں سرکار نے بنگال کے سازشیوں کے ساتھ گہرے تعلقات ہونے کی وجہ کر ان کی رہائی سے اپنی معذوری ظاہر کی (۲۳۲)۔ لیکن بہار و اڑیسہ کی سرکار زیادہ دنوں تک مولانا آزاد کو اپنے یہاں بند رکھنے کے لیے تیار نہیں تھی اور جلد از جلد انھیں اپنے یہاں سے ہٹا دینا چاہتی تھی (۲۳۳)۔ آگے چل کر ۲۴؍ جنوری ۱۹۱۹ء کو حکومت ہند نے اڑیسہ سرکار کو ہدایت دی کہ مولانا آزاد پر لگی پابندی کے بند ڈھیلے کر دیے جائیں (۲۳۴) لیکن بہار سرکار انھیں اپنی ریاست سے باہر بھیجنا چاہتی تھی لہٰذا بہار کے ہوم ڈپٹی سکریٹری مسٹر جی رینی نے حکومت ہند سے اس کی اجازت مانگی۔ اس پر حکومت ہند نے مولانا آزاد پر سے رانچی چھوڑنے کے علاوہ دیگر ساری پابندیاں ہٹالیں۔ حکومت ہند کے داخلہ سکریٹری مسٹر ی. ڈبلیو. گائین کی ہدایت کے مطابق رانچی میں بنے رہنے کی پابندی لگی رہی (۲۳۵)۔ پہلی جنگ عظیم کے ختم ہونے پر ۳؍ دسمبر ۱۹۱۹ء کو سرکار کے ذریعہ دی گئی عام معافی کے اعلان سے یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو مولانا آزاد بھی رہا کر دیے گئے (۲۳۶)۔ نظر بندی کے دوران یہیں پر انھوں نے محض قوت حافظہ کی بنیاد پر ''تذکرہ'' نامی کتاب کی تصنیف کی۔ جب مولانا کو نظر بند کیا گیا تھا تو ان کے کلکتہ کے مکان ''البلاغ پریس'' اور رانچی کے قیام گاہ کی ایک ساتھ تلاشی لی گئی تھی۔ کلکتہ کی تلاشی میں ان کے جو کاغذات ملے تھے وہ بعد میں پولس کمشنر کے دفتر میں آگ لگنے سے جل گئے۔ ان میں کئی کتابیں جیسے ''تاریخ معتزلہ، سیرت شاہ ولی اللہ، دیوان غالب پر تبصرہ، مقدمۂ تفسیر (نامکمل)، ترجمان القرآن کا سورۃ ہود تک کا مسودہ، سورۃ النساء کے پہلے حصے تک تفسیر البیان، اس کے علاوہ ''وحدتِ قوانینِ کائنات'' و ''قانونِ انتخاب طبیع اور قانونِ کائنات'' جیسے رانچی میں لکھے گئے مضامین بھی شامل تھے (۲۳۷)۔ سرکاری خانہ

تلاشیوں میں ترجمان القرآن کا مسودہ نیز چھپی ہوئی جلدیں برباد ہونے کی وجہ کر اسے بھی قوتِ حافظہ کے زور پر ہی پھر سے لکھنے کا کام یہیں پورا کیا (۲۳۸)۔

خلاصہ

درج بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کا وقت مولانا کے افکار و خیالات کے پختہ ہوکر سرگرم عمل ہونے کا وقت ہے۔ ''الہلال'' کے ذریعہ سے مولانا نے مسلمانوں کی ضرورتوں کو سمجھ کر جس بین الاسلامی نظریات کی حمایت کی تھی اس نے جہاں ایک طرف انگریزی پڑھے لکھے مسلمانوں میں مذہب کے تئیں دلچسپی پیدا کر کے مذہبی عروج ثانیہ کی طرف آمادہ کیا اور مولانا محمد علی، شوکت علی اور ڈاکٹر اقبال جیسے لوگوں کو اس کے لیے کام کرنے کی ترغیب دی وہاں دوسری طرف مذہب کو ہی سب کچھ جان کر دنیاوی ضرورتوں کی اہمیت کو نہ سمجھنے کی بھول کرنے والے شیوخ اور علماء کو بھی ملک وقوم کی ضرورتیں سمجھ کر قوم کے لیے جدوجہد کے میدان میں لاکھڑا کیا۔

مولانا محمود الحسن دیوبندی کا نام اس فہرست میں لکھا جا سکتا ہے۔ خود مولانا شوکت علی نے اس بات کو یہ کہہ کر قبول کیا کہ ابوالکلام نے ہم کو ایمان کا راستہ بتلا دیا (۲۳۹) مولانا محمود الحسن دیوبندی نے تو آگے چل کر ملک کے سیاسی میدان میں قابل ذکر کارنامے انجام دیے۔

بین الاسلامیت کی تشہیر سے انھوں نے اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کی۔ حزب اللہ، خدام کعبہ اور دارالارشاد جیسے اداروں اور جماعتوں کے انتظام و انصرام میں انھوں نے پوری قوت صرف کر دی تھی۔ مولانا کا اسلامی قوم پرستی کے تئیں یہ جذبۂ محبت ترکی و انگلینڈ کے خراب تعلقات کی وجہ کر تیزی سے بڑھتا چلاگیا لیکن آگے چل کر اس نے ملکی ضرورت کے مطابق ہندوستانی قوم پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ ملک کی آزادی کے لیے عوامی جذبات کی تعمیر میں ''الہلال'' نے زبردست کردار نبھایا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام، کانپور مسجد سانحہ، لیگ کی پالیسیاں، آئرلینڈ ہوم رول آندولن، کناڈا میں ہندوستانیوں کے داخلے پر پابندی، پریس ایکٹ وغیرہ جیسے مسائل کو لے کر انھوں نے قومیت کے نظریے سے سرکار کی نکتہ چینی کی۔ وہ خود بھی آئینی نقطۂ نظر سے اس کے لیے کام کرتے رہے، اور نہ

صرف پُرامن طریقے سے بلکہ پُرتشدد باغیانہ رویے کے ذریعہ بھی انگریزی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کی کوششوں میں انھوں نے تعاون کیا۔ ان کی تقریروں، مضامین اور کاموں سبھی میں فرقہ وارانہ اخوت کے جذبات کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو سرکار پرستی کا جو راستہ دکھایا تھا، مسلمانوں کو اس راستے سے ہٹا کر ہندوؤں کے ساتھ مل کر حکومت کی مخالفت کرنے کی راہ پر چلانے کا شرف مولانا آزاد کو جاتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی، مولانا حسرت موہانی وغیرہ بڑے بڑے علماء اور حکیم اجمل خاں و ڈاکٹر ایم. اے. انصاری جیسے بڑے لیڈر یہ سب جانتے ہوئے بھی کھل کر عوام کو اس راہ پر چلنے کی دعوت نہیں دے سکے تھے لیکن مولانا آزاد نے بے خوف ہو کر مسلمانوں کو قوم پرستی کی جانب لے کر چلنے کی ہمت کی اور انگریزی حکومت کے ان خوابوں پر پانی پھیر دیا جنھیں کچھ لیڈروں کے ساتھ مل کر بُنا گیا تھا۔ اس کے لیے مولانا کو اپنے سارے عیش و آرام کو قربان کرنا پڑا۔ کئی تکلیف دہ برسوں کے تجربات و محنت سے انھوں نے الہلال اور اسے کھو کر ''البلاغ'' کی اشاعت شروع کی تھی، لیکن وہ سب چھوڑ کر انھیں اپنے گھر سے دور جانا پڑا۔ بات یہیں تک رُکی نہیں رہی، ان کی کافی کتابیں اور دیگر تحریری سرمائے اس بھاگ دوڑ میں برباد ہوگئے، جنھیں وہ پھر زندگی بھر کبھی لکھ نہیں سکے۔ اپنی جائیداد، تحریری سرمایے میں مکمل اور ادھوری کتابوں کی بربادی اور مزید برآں خاندان سے دوری کا جو اقتصادی و نفسیاتی بحران مولانا آزاد نے جھیلا، وہ سب الفاظ میں نہیں باندھا جاسکتا۔ انھوں نے اپنے آپ کو ملک و قوم کے حوالے کر دیا تھا اور ہندو مسلم بھائی چارے کے لیے اپنی قوت و طاقت لگا کر اس سے ملک پر چھائے ہوئے غیر ملکی حکمرانوں کے ہر چال کی کاٹ کر رہے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں میں بھی وطن دوستی و قوم پرستی کے غیر معمولی جذبات پیدا کیے تھے۔ اتنا ہی نہیں مولانا آزاد نے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے انھیں قوم پرستی کے اس کنارے تک پہنچا دیا، جہاں سے آگے مہاتما گاندھی کے افکار و نظریات میں داخل ہونے کا راستہ صاف دکھائی دے رہا تھا یعنی انگریزوں کی حمایت سے ہٹا کر مسلمانوں کو انگریزوں کی مخالفت نیز انگریز مخالف قومی تحریک میں شامل ہونے کا راستہ دکھایا۔

---

(۴)

خلافت تحریک

(۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۳ء)

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اوائل میں ہندوستان میں برٹش حکومت کے خلاف عوامی تحریک شروع ہوگئی تھی۔ ان میں خلافت تحریک اور تحریک عدم تعاون نے سرکار کے خلاف عوام کی قوت اور تنظیم کی مضبوطی ثابت کر دی تھی۔ مولانا آزاد نے ان تحریکوں کے ذریعہ انگریزی حکومت کے تئیں اپنی مخالفت ظاہر کی تھی۔ تحریک عدم تعاون گاندھی جی نے برٹش سرکار کے خلاف غیر متشدد مزاحمت کی شکل میں شروع کیا تھا اور خلافت تحریک دنیا کے سبھی مسلمانوں کے مذہبی فرماں روا خلیفہ جو ترکی کا حکمراں تھا، کے تئیں انگلینڈ کی حکومت کے رویے کے خلاف ہندوستانی مسلمانوں کے ذریعہ شروع کیا گیا تھا۔ ان تحریکوں میں مولانا آزاد کی خدمات کا ذکر کرنے سے پہلے مولانا کے اسلام اور خلافت سے متعلق نظریات پر ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے نائب خلیفہ کہلاتے تھے(۱)۔ سارے عالم کے مسلمان خلیفہ کو دنیا میں مسلمانوں کا مذہبی رہنما اور فرماں روا مانتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد مذہب اسلام کے ایک بڑے عالم تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مذہب ایک ایسی طاقت ہے جس کا اندازہ لگانا ناممکن ہے(۲)۔ مولانا کی نظر میں مذہب کا مطلب فرض، اصول اور قانون تھا(۳)۔ ان کے خیال میں دنیا کے سارے مذاہب میں یکسانیت ہے۔ سبھی مذہب بنیادی طور پر ایک ہیں۔ ترجمان القرآن میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''ابتدا میں تمام انسانوں کا ایک گروہ تھا، پس اللہ نے ایک کے بعد ایک نبی مبعوث کیا۔ وہ نیک عملی کے نتیجوں کی خوشخبری

دیتے تھے، بدعملی کے نتیجوں سے متنبہ کرتے تھے''(۴)۔ وہ مانتے تھے کہ اسلام میں ساری اچھائیاں شامل ہیں۔ انھی کے لفظوں میں ''اگر فی الحقیقت دنیا کی کسی قوم کے پاس کوئی عمدہ خیال، کوئی واقعی سچائی پائی جاتی ہے تو اس کے معنی ہیں کہ وہ بدرجۂ اوّلین اسلام میں موجود ہیں اور اگر نہیں ہیں تو اس کی اچھائی بھی قابل تسلیم نہیں۔ اسلام کے معنی کی اصلی وسعت سے دنیا بے خبر ہے۔ اسلام تو اعتقاد وعمل کی ہر صداقت وکائنات کے ہر حسن و جمال کا نام ہے، جہاں کہیں بھی صداقت و جمال موجود ہے یقین کرنا چاہیے کہ وہ اسلام ہے''(۵)۔

مولانا آزاد کا نظریۂ خلافت

مولانا آزاد مانتے تھے کہ اللہ کی جانب سے برائیاں روکنے اور نیکی کرنے کے کام کو خلافت کا نام دیا گیا ہے(۶)۔ وہ مانتے تھے کہ خلیفہ ساری دنیا کے مسلمانوں کا حاکم ہے۔ اس کا دائرۂ اختیار صرف مذہب تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کے سبھی حلقوں میں پھیلا ہوا ہے۔ انھی کے لفظوں میں ''قرآن کے نزدیک جو چیز خلافت ہے وہ خلافت فی الارض ہے یعنی زمین کی حکومت وسلطنت۔ پس اسلام کا خلیفہ ہو نہیں سکتا جب تک زمین پر کامل حکومت واختیار اسے حاصل نہ ہو۔ اور مسیحیت کے پوپ کی طرح محض ایک آسمانی ودینی اقتدار نہیں جس کے لیے دلوں کو اعتقاد اور پیشانیوں کا سجدہ کافی ہو، وہ کامل معنوں میں سلطنت وفرمانروائی ہے''۔ اس میں انھوں نے یہ بھی واضح کردیا ہے کہ ''اسلام کے قوانین میں دینی وروحانی اقتدار خدا و رسول کے سوا کوئی انسانی وجود نہیں رکھتا۔ حضرت (پیغمبر محمدؐ) نے اپنے بعد کے جانشینوں کو خود لفظِ خلیفہ سے تعبیر فرما کر واضح کردیا تھا کہ وہ آپؐ کے نائب وقائم مقام ہوں گے''(۷)۔ اس طرح وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک مانتے تھے۔ انھوں نے خود کہا تھا کہ ''وہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ ہر انسان جس نے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیا اس برادری میں شامل ہوگیا۔ خواہ مصری ہو، خواہ نائجیریا کا حبشی ہو، خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک، لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندان توحید کا عضو ہے جس کا گھرانہ کسی خاص وطن یا مقام سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں''(۸)۔ اسلام کی بنیاد پر سماجی انتظام وانصرام کرنے کے لیے وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ:

(۱) سبھی کو خلیفہ میں اعتقاد رکھنا چاہیے۔
(۲) خلیفہ کی پکار پر یکجا ہونا چاہیے۔
(۳) خلیفہ کا حکم ماننا چاہیے۔
(۴) دارالاسلام کے لیے ہجرت کرنی چاہیے جس کی کئی شکلیں ہوسکتی ہیں۔
(۵) جہاد میں یقین کرنا چاہیے(۹)۔

مولانا آزاد ہندوستان میں مذہبی سربراہ یا امام شریعت مقرر کیے جانے کے حامی تھے۔ ان کا منصوبہ تھا کہ مسلم معاشرے کی تنظیم کے لیے منتخب مذہبی رہنماؤں کی ایک کمیٹی بنائی جائے اور وہ امام شریعت کے کنٹرول میں رہے(۱۰)۔ ان کی کوششوں سے جون ۱۹۲۱ء میں پٹنہ میں علمائے دین کے ایک جلسے میں شاہ بدرالدین پھلواروی کو امیر شریعت چنا گیا تھا(۱۱)۔ وہ چاہتے تھے کہ کمیٹی کے ذریعہ ہی خلافت کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھایا جانا چاہیے۔ وہی مذہب سے متعلق امور کی دیکھ بھال کرے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ''نظام شرعی یہ نہیں ہے کہ ہر شخص فرداً فرداً سوچتا رہے کہ مسئلہ خلافت کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ یہ کام صرف ایک صاحبِ نظر واجتہاد کا ہے جس کو قوم نے باتفاق تسلیم کرلیا ہو''(۱۲)۔

کانگریس سے تعلق

مولانا آزاد بہت چھوٹی عمر سے ہی ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ خود اپنی سیاسی زندگی انھوں نے بنگال کی انقلابی جماعت سے شروع کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ قانونی تدابیر کو بھی صحیح مانتے تھے۔ اسی لیے وہ لیگ میں بھی شامل ہوئے تھے لیکن جب لیگ میں فرقہ وارانہ رُجحان بڑھ گیا تو ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو وغیرہ جیسے قوم پرستوں نے لیگ سے ناطہ توڑ لیا(۱۳)۔ اس وقت کانگریس اور مسلم لیگ ہی ملک کی سب سے بڑی سیاسی تنظیمیں تھیں۔ کانگریس سے مولانا آزاد کا تعارف بیسویں صدی کے اوائل میں ہی ہو چکا تھا۔ ۲۰ر جنوری ۱۹۰۴ء کے ''لسان الصدق'' میں انھوں نے ''ہندوؤں کی نیشنل کانگریس'' کے عنوان سے کانگریس کے بارے میں ایک مضمون بھی لکھا تھا(۱۴)۔ ۱۹۱۳ء تک وہ مسلمانوں کے لیے بھی کانگریس کی ضرورت کو محسوس کرنے لگے تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار ''الہلال'' میں لکھا تھا کہ وہ زمانہ

گیا جب انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے مسلمان کانپ اٹھتے تھے(۱۵)۔ ۱۹۱۳ء میں کانگریس کے کراچی اجلاس میں مسلمانوں کی شمولیت پر اپنا ردِّعمل ظاہر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ ''مجھے پورا یقین ہے کہ اس سال کانگریس کا جلسہ کراچی کی جگہ شمالی ہند کے کسی شہر میں ہوا ہوتا تو نہایت کثرت سے مسلمان شریک ہوتے'' (۱۶)۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ ابھی مسلمان کانگریس سے پوری طرح نہیں جُڑ پائے ہیں۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ''ابھی ملکی سیاست سے پوری طرح دلچسپی لینے کے لیے مسلمانوں کا مذاق ایک دو سال اور طلب کرتا ہے'' (۱۷)۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر جب مولانا آزاد رانچی سے رہا ہوکر آئے تو ۱۹۲۰ء میں کانگریس میں شامل ہو گئے (۱۸)۔ انھوں نے دلّی کے اسٹیج پر کانگریس کے تئیں پہلی محبت کا اظہار کیا تھا (۱۹)۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں ہوئے کانگریس کی خصوصی اجلاس میں وہ شامل ہوئے اور اس طرح کانگریس کے کسی جلسے میں ان کی یہ پہلی شمولیت تھی (۲۰)۔ ''الہلال'' کی اشاعت کے زمانے سے ہی ان کی پالیسی انگریزوں میں عدم اعتماد اور غیر مسلموں سے تعاون حاصل ہونے کی جگہ ان کے ساتھ تعاون کرنے کی رہی تھی۔ ''الہلال'' کے ذریعہ وہ اس کی تشہیر کرتے رہے تھے (۲۱)۔ اپنے دینی علوم و مذہبی تقاریر کی وجہ کر مسلمانوں کے درمیان وہ ایک بڑے عالم دین میں شمار کیے جانے لگے تھے۔ کانگریس میں بھی ان کا داخلہ ایک ماہر مقرر کی شکل میں ہوا تھا (۲۲)۔ اس وقت مسلمانوں میں انگریزوں کے تئیں نفرت کے جذبات کافی بڑھے ہوئے تھے اور وہ پہلی جنگ عظیم میں شکست خوردہ ترکی کی مدد کرنے کے لیے انگریزوں کو ہرانا چاہتے تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے بقول اسی لیے ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں وغیرہ نے کانگریس میں شمولیت اختیار کی تھی (۲۳)۔

گاندھی جی سے ملاقات

جس وقت مولانا آزاد کانگریس میں آئے تھے اس وقت خلافت کا سوال ایک سنگین مسئلے کی صورت میں ملک کے سامنے موجود تھا۔ مہاتما گاندھی اس وقت ہندوستان آچکے تھے اور وہ ملک کے حالات کو گہرائی سے سمجھنے میں لگے ہوئے تھے۔ مولانا آزاد بھی اس جانب سے غافل نہیں تھے۔ تقسیم بنگال، کانپور مسجد سانحہ، جلیان والہ باغ قتل عام اور

ترکی کی شکست کے تعلق سے سامنے آئی انگریزوں کی مسلم مخالف پالیسی سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے اخبار ''الہلال'' کے تئیں انگریزوں نے جس طرح کی سختی کا رویہ اپنایا تھا اور جس طرح انھیں رانچی میں نظر بند رکھا گیا تھا اس سے بھی مولانا کے ذاتی جذبات کچھ زیادہ ہی انگریز مخالف ہو گئے تھے۔ اسی لیے وہ ملک کی سیاسی طاقت کو انگریزوں کے خلاف استعمال کیے جانے کے حامی تھے۔ وہ خلافت کے لیے کانگریس کی طاقت کو اس طرح استعمال کرنا چاہتے تھے کہ ملک کے مفاد کو ایک جُٹ ہو کر حاصل کیا جاسکے۔ وہ مولانا تھے، اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سیاست اور مذہب کو ایک کر دینا مولانا کے لیے دشوار نہیں تھا۔ مہاتما گاندھی اور ان کی پالیسیوں سے وہ کافی پہلے سے واقف تھے۔ ۳؍ دسمبر ۱۹۱۳ء کے ''الہلال'' میں پہلے صفحے پر انھوں نے گاندھی جی کی تصویر چھاپی تھی اور جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کے ذریعہ کیے گئے کاموں کی تعریف کرتے ہوئے انھیں ''رئیس الاحرار'' کے نام سے مخاطب کیا تھا (۲۴)۔ ہندوستان آنے کے بعد جلیاں والہ باغ کے مظالم سے رنجیدہ ہو کر گاندھی جی انگریزوں کی مخالفت کرنے لگے تھے اور خلافت تحریک کا ساتھ دینے کے لیے عوام کے سامنے آچکے تھے۔ نومبر ۱۹۱۹ء میں انھوں نے کل ہند خلافت کمیٹی کی بیٹھک میں پہلی بار سرکار کے ساتھ عدم تعاون کی تجویز پیش کی تھی (۲۵)۔ ۲۰؍ جنوری ۱۹۲۰ء کو دلّی میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مکان پر ہوئی خلافت کے رہنماؤں کی نشست میں اس تجویز پر غور کیا گیا تھا، جہاں صرف مولانا آزاد ہی ایک ایسے شخص تھے، جنھوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کی تائید کی تھی کہ انگریزوں کے ساتھ عدم تعاون کیا جائے، جب کہ حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولوی عبدالباری جیسے لوگ پس و پیش میں تھے۔ حکیم صاحب نے اس سلسلے میں سوچنے کا وقت مانگا تھا اور مولوی عبدالباری و ڈاکٹر انصاری دوسرے لوگوں سے اس پر مشورہ کرنے کے بعد کچھ فیصلہ لینے کی بات کہہ کر فی الوقت اس سے بچ رہے تھے (۲۶)۔ اس نشست میں خلافت تحریک چلانے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی اس میں حکیم اجمل خاں، مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد کو شامل کیا گیا (۲۷)۔ مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد کی ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا اس سے قبل دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں تھا (۲۰)۔

عدم تعاون اور خلافت تحریک

پہلی جنگ عظیم کے اختتام کے بعد پنجاب میں جلیانوالہ باغ میں ہوئے مظالم سے ملک میں انگریز مخالف لہر پھیل رہی تھی۔ جنگ عظیم میں ترکی کے ساتھ ہوئی بدسلوکی کی وجہ کر مسلمان انگریزوں سے ناراض تھے۔ دونوں فرقوں میں انگریزوں کی مخالفت ملک کے اندر جاری خلافت تحریک اور عدم تعاون کی تحریک کی شکل میں اُجاگر ہوئی تھی۔ مہاتما گاندھی نے وقت اور حالات کی نزاکت کو دیکھ کر مسلمانوں کی تحریک کو مدد بہم پہنچانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ کھڑے ہو کر انگریزوں کی مخالفت کرنے کے ارادے سے ہی انھوں نے انگریزوں کے ساتھ عدم تعاون کی تجویز رکھی تھی۔ مولانا آزاد نے عدم تعاون کی تجویز کو اپنی مکمل حمایت دینے کا اعلان کیا تھا۔

خلافت تحریک خالصتاً ایک مذہبی تحریک تھی لیکن مولانا آزاد اس کا سیاسی استعمال کر رہے تھے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں انگریزوں نے ترکی سلطنت کے خلاف جنگ کی تھی اور ترکی کی ہمدردی میں ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان ترکی سلطنت کو تعاون دینے کی مہم شروع ہو گئی تھی۔ یوروپی ملکوں کے ترکی مخالف رویے کو دیکھتے ہوئے مولانا آزاد نے بہت پہلے اپنے اخبار ''الہلال'' میں مسلمانوں کو ہدایت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''اگر طرابلس میں قتیلان ظلم وستم کی لاشیں تڑپ رہی ہیں تو یہ عیش پرستی ایک لعنت ہے جو آپ کو عید کی خوشیوں میں مصروف کر رہی ہے۔ مراقش میں اسلام کا آخری نقش حکومت مٹ رہا ہے تو کیوں نہیں ہندوستان کے عیش کدوں میں آگ لگ جاتی ہے'' (۲۹)۔ اسلام کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کو خبردار کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ ''تم چاہو یا نہ چاہو مگر تمھیں ہمیشہ عیسائیت سے معرکہ آرا رہنا پڑے گا۔ یعنی میں تم سے کہتا ہوں کہ ہمیشہ جنگ دفاعی کے لیے تیار رہو'' (۳۰)۔ وہ چاہتے تھے کہ خلافت کی محافظت کے لیے مسلمان اٹھ کھڑے ہوں اور ترکی کی تکلیفیں محسوس کرتے ہوئے پوری قوت و طاقت سے اس کی مدد کے لیے تیار ہوں۔ انھوں نے ۲۷/ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو کلکتہ میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا تھا ''اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروان اسلام کے سروں پر کوئی تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے اگر اس کا زخم ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک

مسلم پیروِ توحید کی لاش تڑپ رہی ہے تو لعنت ہے ان سات کروڑ (ہندوستانی مسلمان) زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر مراقش میں ایک حامیٔ وطن کے حلق بریدہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے جو ہمارے منہ سے دل وجگر کے ٹکڑے نہیں گرتے۔ اگر میدان جنگ میں کسی ترکی کے تلوے میں کوئی کانٹا چبھ جائے تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ کوئی ہندوستان کا مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں نہ محسوس کرے'' (۳۱)۔ اس تقریر میں انھوں نے صاف کہا تھا کہ ''کوئی آدھی صدی سے یورپ کی تمام مسیحی طاقتوں نے ایک خاص مقصد سے حکمت عملی وضع کی ہے اور اس کا نام مشرقی مسئلہ رکھا ہے۔ اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلام کے بقیہ قوائے سیاسیہ کا خاتمہ کر دیا جائے اور بالفاظ صاف تر یہ کہ دنیا کے جس قدر حصے اسلام کے زیر اثر باقی رہ گئے ہیں ان کو بھی یورپ کی مسیحی حکومتیں آپس میں بانٹ لیں'' (۳۲)۔ جب برٹش سرکار نے مولانا حسرت موہانی کو ترکی کی حمایت کرنے کی وجہ کر گرفتار کر لیا تھا اور کچھ شرائط کے ساتھ چھوڑنے کی پیشکش کی تھی، اس وقت مولانا آزاد رانچی میں نظربندی کے دن گزار رہے تھے۔ وہیں سے انھوں نے مولانا حسرت موہانی کے ذریعہ سرکاری شرطوں پر رہائی کو نامنظور کرنے اور بیگم موہانی کے ذریعہ اس بات پر خوشی ظاہر کیے جانے پر، بیگم موہانی کو ایک خط لکھ کر مولانا حسرت موہانی و بیگم موہانی کی تعریف کی تھی اور انھیں مبارکباد دیتے ہوئے مولانا کے اقدام کو حضرت یوسف کی بے خوفی و ایثار سے تعبیر کیا تھا (۳۳)۔ وہ خلافت کی حفاظت کے لیے انگلینڈ کی حکومت کے سامنے جھکنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انگلینڈ کی سرکار سے اس موضوع پر ایک بار بات چیت کی جا سکتی ہے، جس کے وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج نے ۱۹۱۸ء میں کہا تھا کہ مشہور زمانہ زرخیز ریاست تھریس (سائی پرس) اور ایشیا مائینر ترکی سے چھیننے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اسی وقت انھوں نے ہاؤس آف کامن میں کہا تھا کہ یہ اقرار ترکی سلطان کے لیے نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ اس وقت جنگ کے حالات نازک ہیں اور ہندوستانی افواج کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو خوش کیے بغیر یہ فوج نہیں آئے گی۔ اسی لیے یہ وعدہ کیا جا رہا ہے (۳۴)۔ خلافت کے سلسلے میں گفتگو کے لیے ایک نمائندہ وفد کو انگلینڈ بھیجنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں

کی ایک نمائندہ جماعت ۱۹؍جنوری ۱۹۲۰ء کو ہندوستان کے وائسرائے سے ملی بھی تھی۔ اس میں حکیم اجمل خاں، علی برادران، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حسرت موہانی، مہاتما گاندھی اور سوامی شردھانند سمیت ۳۵ لوگ شامل تھے(۳۵)۔ مولانا آزاد نے وائسرائے کو دی جانے والی عرضداشت پر اپنے دستخط کیے تھے لیکن انھوں نے بذاتِ خود نمائندہ جماعت میں شامل ہو کر جانے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ ''اس طرح بھیک مانگنے اور درخواست گزارنے سے کوئی مقصد حل نہیں ہوگا'' (۳۶)۔ وہ گوری سرکار کے سامنے جھکنا نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی کوئی سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے کیوں کہ خلافت کا سوال مولانا آزاد کے لیے صرف مذہبی سوال نہیں تھا بلکہ ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندو مسلمانوں کو متحدہ طور پر انگریزوں کے خلاف میدان میں اُتارنے کا ایک ذریعہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں خلافت تحریک مولانا آزاد کے لیے ملکی آزادی کی تحریک تھی۔ مہاتما گاندھی کی طرح انھوں نے بھی خلافت اور عدم تعاون کی تحریک کو ایک ساتھ جوڑ دیا تھا۔

خلافت تحریک کے ابتدائی مراحل میں مسلمانوں میں جو برٹش مخالف ردّعمل ہوا تھا اسی کے جوش میں بمبئی کے ایک مالدار تاجر سیٹھ چھوٹانی نے بمبئی خلافت کمیٹی کی تشکیل کی تھی اور اسی نے آگے چل کر مرکزی خلافت کمیٹی کی شکل اختیار کر لی تھی (۳۷)۔ ۱۹۲۰ء میں ہی مولانا کو خلافت تحریک چلانے کے لیے خلافت اجلاس کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ امرت سر میں کانگریس و دیگر پارٹیوں نے مل کر طے کیا تھا کہ پہلی خلافت کانفرنس مولانا آزاد کی صدارت میں کلکتہ میں منعقد کی جائے (۳۸)۔ مولانا کی خلافت میں اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی کہ آزادی حاصل کرنے میں تھی (۳۹)۔ اسی لیے ۲۶؍فروری ۱۹۲۰ء کو جب گاندھی جی نے میرٹھ میں عوام کے سامنے عدم تعاون کی تجویز پیش کی تو اس کے تین دن بعد ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کو کلکتہ میں منعقد بنگال ریاستی خلافت کانفرنس سے بحیثیت صدر خطاب کرتے ہوئے مولانا آزاد نے عوام سے اپیل کی تھی کہ وہ گاندھی جی کی میرٹھ والی تجویز کی تائید کریں (۴۰)۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت تک کانگریس نے عدم تعاون کی تجویز قبول نہیں کی تھی لیکن مولانا آزاد کا حوصلہ اتنا بڑھا ہوا تھا کہ انھوں نے کلکتہ کے اس اجلاس کے دوران خلافت کمیٹی کی ایک بیٹھک میں کہا تھا کہ اگر انگریز سرکار ہماری خلافت کی مانگوں کو نہیں سنتی ہے تو مسلمانوں کو اپنے مذہبی کتابوں کی تعلیمات کے مطابق حکومت

سے شاہ پرستی کے سارے تعلقات توڑ لینے ہوں گے(۴۱)۔ اس طرح مولانا آزاد نے مہاتما گاندھی کے بعد سب سے پہلے انگریزوں کے خلاف عدم تعاون کی تحریک چھیڑنے کا اعلان کیا تھا۔ مسلمانوں کا جو ڈیلی گیشن خلافت کے مسئلے کو لے کر وائسرائے سے ملا تھا اسے وائسرائے نے کوئی اُمید افزا جواب نہیں دیا تھا۔ صرف ایک نمائندہ وفد کو انگلینڈ جانے کی اجازت حاصل ہو گئی تھی۔ مارچ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں مولانا محمد علی کی نمائندگی میں مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد انگلینڈ کے وزیر اعظم لائڈ جارج سے ملا لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ لائڈ جارج کے جواب میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ترکی صرف ترکی کی زمین پر ہی اپنے حقوق رکھ سکے گا (۴۲)۔ اس کا مطلب تھا کہ ترکی سلطنت کی سرحدیں گھٹ جائیں گی۔ اس سے مسلمانوں کا غصہ بڑھ گیا اور ۱۹؍مارچ ۱۹۲۰ء کو مولانا آزاد، مولانا عبدالباری اور شوکت علی نے ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے (Dismemberment of Turkey) کیے جانے کے خلاف عوام سے ہڑتال کرنے کا اعلانیہ جاری کر دیا (۴۳)۔ اس دن کو یوم خلافت کے طور پر منایا گیا تھا۔ عوام کے جوش و خروش نیز اشتعال سے گھبرا کر حکومت نے ایک حکم نامہ جاری کر کے سرکاری ملازمین کو ہڑتال میں حصہ لینے سے منع کر دیا (۴۴)۔ مولانا آزاد نے اس طرح کی پابندیوں کو غیر مؤثر بنانے کے لیے ۲۱؍مارچ کو عوام سے سرکار کے ساتھ تعاون نہ کرنے کی اپیل کی۔ انھوں نے عدم تعاون کو خدائی راستہ بتاتے ہوئے کہا کہ صرف دو راستے کھلے ہیں، ایک خدا کا راستہ اور دوسرا ان لوگوں کا ہے جو اپنی طاقت کے غرور میں راہِ حق سے منہ موڑنا چاہتے ہیں (۴۵)۔

۱۲؍مئی ۱۹۲۰ء کو مرکزی خلافت کمیٹی کی بمبئی بیٹھک میں عدم تعاون کی کامیابی کے لیے ایک منصوبہ تیار کرنے کے مقصد سے مولانا آزاد، حاجی چھوٹانی اور شوکت علی وغیرہ کی ایک کمیٹی بنائی گئی (۴۶)۔ اس کمیٹی نے ایک تین نکاتی پروگرام عوام کے سامنے پیش کیا:

(۱) یکم اگست سے ہڑتال کی جائے۔
(۲) قانون کی نافرمانی نہیں کرنی ہے۔
(۳) خطابات چھوڑ دیے جائیں (۴۷)۔

یکم اگست کی ہڑتال کے پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے مقررہ تاریخ سے پانچ دن قبل ہی ۲۶؍جولائی کو مولانا آزاد، گاندھی جی، سیف الدین کچلو اور حسرت موہانی وغیرہ

کے دستخط سے ایک اشتہار جاری کیا گیا، جس میں اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے تئیں احترام بنائے رکھنے اور جس سے اپنی کمزوری ظاہر ہو یا اسلام کے دشمنوں یعنی انگریزوں کو کوئی فائدہ پہنچے، ایسا کوئی کام نہ کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے لوگوں سے اپیل کی گئی تھی کہ جو اسلام کے دشمنوں کا دوست ہو جاتا ہے، اسے بھی اسلام کا دشمن سمجھا جائے گا۔ عدم تعاون کا پروگرام شروع ہو چکا ہے اور یہ ہمارے امتحان کی پہلی منزل ہے لہٰذا وہ پہلی اگست کو دعائیں کریں، روزہ رکھیں، اپواس رکھیں، کاروبار وغیرہ بند رکھیں، جلسے کر کے خدا اور سچائی کے نام پر تکلیف سہنے کا عہد کریں اور اعزازی عہدوں نیز خطابات کو ترک کر دیں۔ لوگوں کو کسی بھی طرح کے حالات سے باخبر کرتے ہوئے اس سے دور رہنے نیز مشکل ترین رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے بھی سچائی کے راستے پر جمے رہنے کی اپیل کی گئی تھی (۴۸)۔

یکم اگست سے ملک میں سرکار کے خلاف عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی گئی (۴۹)۔ خلافت کے تئیں انگریزوں کی پالیسی سے متفق نہ ہونے کی وجہ کر مولانا آزاد اور کچھ دوسرے لیڈروں نے مسلمانوں کو صلاح دی کہ وہ انگریزوں کے زیر حکومت اس ملک سے ہجرت کر جائیں۔ اگست سے یہ منصوبہ سندھ سے شروع ہوا اور شمال مغرب کی سرحدی ریاستوں سے تقریباً اٹھارہ ہزار لوگ ہندوستان سے افغانستان کی طرف چل پڑے (۵۰)۔ مولانا آزاد اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے جی جان سے جٹ گئے۔ ۲۶ر اگست ۱۹۲۰ء کو دہلی میں پٹودی ہاؤس کے سامنے مسلمانوں کا ایک جلسہ ہوا تھا۔ اس میں مسلمانوں کے سماجی مسائل پر غور وخوض کیا جانا تھا لیکن مولانا آزاد نے اس جلسے کے مقصد کو ہی بدل دیا۔ انھوں نے ملک کے موجودہ مسائل کو اٹھاتے ہوئے دہلی کے مسلمانوں کے ذریعہ غیر ملکی کپڑے نہ چھوڑنے اور کھادی نہ پہننے پر انھیں تنقید کا نشانہ بنایا نیز لعنت و ملامت کی (۵۱)۔ ۶ر ستمبر کو کلکتہ میں جمعیۃ العلماء ہند کے ایک خاص نشست میں مولانا آزاد نے انگریزوں سے عدم تعاون کرنے کے لیے تجویز پیش کی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے کیے گئے وعدوں کو وفا نہ کر کے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ انگلستان کے وزراء نے عوامی طور پر کیے گئے اپنے وعدوں کو نہیں نبھایا ہے اور اس طرح خلیفہ کے حقوق کی پائمالی کر کے اسلام کے خلاف اپنی دیرینہ دشمنی کا ثبوت دے دیا ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ اسلام کے دشمنوں سے ترک موالات کرے۔

مولانا عبدالقیوم، مولانا مظہر الدین، بدایوں کے عبدالصمد اور دیگر کئی علماء نے مولانا آزاد کی اس تجویز کی تائید کی اور یہ پاس کر دی گئی (۵۲)۔ ۵ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو کلکتہ کی ناخدا مسجد میں ایک ہزار لوگوں کے مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے مولانا نے مسلمانوں سے خلافت کے حق میں تحریک عدم تعاون کی حمایت کرنے کی اپیل کی اور کہا کہ مسلمان تحفظ خلافت کے لیے مذہبی طور پر جوابدہ ہے اور اس کا سب سے اچھا طریقہ عدم تعاون کی تائید میں آگے آنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو برباد کر دینے کی ایک سازش ہے۔ انگلینڈ ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ جن مسلمان سپاہیوں نے مذہبی مقامات پر جا کر اپنے بھائیوں کا قتل کیا ہے وہ معافی کی کوئی اُمید نہیں کر سکتے۔ ان کے جرم کا کفارہ نہیں ہو سکتا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اصلی کام کیا جائے۔ اگر مسلمان خلافت کی حفاظت نہیں کریں گے تو ان کی موت ایک کافر کی طرح ہوگی (۵۳)۔ حکومت سے عدم تعاون میں وہ کوئی کسر باقی نہیں رکھنا چاہتے تھے نیز اس کے تحت وہ ناممکنات کے بھی حدود توڑ کر نکل جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے حکومت سے بغاوت کر کے فوجیوں کو سرکاری فوجی نوکری چھوڑنے کی ترغیب دینے والا پروگرام تیار کیا تھا۔ ان کا نظریہ تھا کہ انگریزی افواج کے مسلمان سپاہیوں نے ترکی کو شکست دینے میں برٹش سرکار کی جو مدد کی ہے اسے دیکھتے ہوئے پنجاب کے مسلمانوں کو اس معاملے میں خاص طور سے آگے آنا چاہیے۔ وہ چاہتے تھے کہ عدم تعاون کا پروگرام کامیاب کرنے کے لیے ایسی ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی جانی چاہئیں جو اس پروگرام کی ہر شرط کو پورا کرنے کے لیے ریاستوں میں کام کریں (۵۴)۔ وہ خود بھی لوگوں کو اس کے لیے ترغیب دے رہے تھے۔ ۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو انھوں نے لاہور میں ۴۰ ہزار کے عوامی جلسے میں عدم تعاون کی حمایت میں پنجاب کے لوگوں سے کہا کہ ’’پنجاب کے مردے کب زندہ ہوں گے؟ جب لمحے لمحے میں دنیا کے لوگوں کی قسمتیں بدلی جا رہی ہیں تب دلیلوں کا وقت ہی کہاں رہ گیا ہے‘‘؟ لوگوں میں انگریزی حکومت کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے لیے انھوں نے صاف لفظوں میں کہا کہ جو قوم تمام انسانوں کی آزادی کو سلب کرنے والی ہے، جس قوم میں بہت سی باتیں ہیں لیکن انصاف نہیں ہے اس قوم سے تم تعلیم پاؤ گے؟ اس کی عدالتوں میں انصاف ڈھونڈنے جاؤ گے؟ (۵۵) ان سب باتوں کے ذریعہ وہ اسکول، کالج اور عدالتوں کے بائیکاٹ کا اعلان کر رہے تھے جب کہ ملک کے کئی میدان ابھی اس حد تک

جانے کے لیے تیار نہیں تھے (۵۶) لیکن مولانا آزاد اس کے توسط سے ملکی عوام کے ہر طبقے
میں انگریزوں کے خلاف ان کے جذبات کو اُبھارنا نیز اس کی تشہیر کرنا چاہتے تھے۔ وہ
صرف کہنے میں ہی یقین نہیں رکھتے تھے بلکہ کرنے کے لیے بھی ہمیشہ تیار رہتے تھے اور آگے
بڑھ کر خود مثال پیش کرنا بھی جانتے تھے (۵۷)۔ بہت دنوں سے ان کی خواہش ایک ملی
درسگاہ قائم کرنے کی بھی تھی جس کا موقع انھیں دسمبر ۱۹۲۰ء میں مل سکا جب ان کی تقریر سے
متاثر ہو کر کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کے طلبا مدرسے کو چھوڑ کر چلے آئے۔ انھوں نے ان لوگوں
کی تعلیم کے لیے کلکتہ کی ناخدا مسجد میں ایک قومی درسگاہ قائم کی اور ۱۳/ دسمبر ۱۹۲۰ء کو مہاتما
گاندھی سے اس کا افتتاح کرایا۔ افتتاحی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے اس
بائیکاٹ کو خدائی احکام کی تعمیل بتایا تھا۔ انھوں نے اسکولوں کے بائیکاٹ کے حق میں کہا تھا
کہ یہ بڑی تعلیمی عمارتیں جو انگریزی تعلیم کی نو آبادیاں ہیں، کس مخلوق سے بھری ہوئی ہیں؟
مشتاقانِ علم اور شیفتگانِ حقیقت سے؟ نہیں۔ ایک مٹھی گیہوں اور ایک پیالہ چاول کے
پرستاروں سے، جن کو یقین دلایا گیا ہے کہ بلا حصول تعلیم وہ اپنی غذا حاصل نہیں کر
سکتے (۵۸)۔ اس طرح انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انگریزوں کے ذریعہ دی گئی
تعلیم صرف روزی روٹی دلاتی ہے اور وہ بیکار ہے۔ اس کی بہ نسبت ان کی مخالفت اور
بائیکاٹ خدائی حکم کا درجہ رکھتا ہے یعنی روٹی کے مقابلے میں آزادی دلانے والا قدم زیادہ صحیح
ہے۔ آزادی روٹی سے بڑی چیز ہے۔ اس طرح وہ شروع سے ہی عدم تعاون کی تحریک کی
حمایت کرتے چلے آرہے تھے، جب کہ دیش بندھو چترنجن داس اور لالہ لاجپت رائے جیسے
بڑے لیڈر عدم تعاون کی مخالفت کرتے تھے۔ کلکتہ کانگریس میں ان دونوں نے ہی گاندھی
جی کے عدم تعاون کی تجویز کی مخالفت کی تھی (۵۹)۔ اسی کانفرنس میں مولانا آزاد نے عدم
تعاون کی تائید میں ایک پُر اثر تقریر کے ذریعہ اس کی حمایت کی تھی (۶۰)۔

مولانا آزاد حصول آزادی کو مسلمانوں کا مذہبی فریضہ تصور کرتے تھے۔ مسلمانوں
سے ان کا کہنا تھا کہ ''یاد رکھیے کہ ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جد و جہد کرنا
داخل حب الوطنی ہے۔ مگر آپ کے لیے ایک فرض دینی ہے اور داخل جہاد فی سبیل اللہ۔ ...
جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش شامل ہے جو حق اور صداقت کے واسطے اور انسانی بند، استبداد
و غلامی کو توڑنے کے لیے کی جائے۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمان اپنے فرض کو بھول گئے ہیں کہ

انھیں بھی آزادی حاصل کرنی ہے لہٰذا انھوں نے اس تحریک کو خدا کے ذریعہ عطا کردہ موقع
مان کر انھیں اٹھنے کی ترغیب دی اور کہا کہ ''پس اٹھ کھڑے ہو کہ خدا تم کو اٹھانا چاہتا ہے اور
اس کی مرضی یہی ہے کہ مسلمان جہاں ہو بیدار ہو اور اپنے فراموش کردہ فرض جہاد کو زندہ
کرے''۔ مولانا نے یہاں بھی واضح کر دیا کہ اس میں سبھی خطرے آسکتے ہیں، جیل بھی جانا
پڑ سکتا ہے، پر اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ''اس جنگ کی فتح و شکست کا
فیصلہ میدانوں میں نہ ہوگا، قید خانوں کی کوٹھریوں میں ہوگا'' (۶۱)۔ ملک میں جیل جانے
کے لیے لوگوں کو آمادہ کرنے کی غرض سے وہ جہاں بھی جاتے تھے وہیں لوگ ملکی مفاد کے
لیے تیار ہو جاتے تھے۔ خلافت اور عدم تعاون کے پروگرام کی کامیابی کے لیے ۱۹۲۰ء میں
انھوں نے مہاتما گاندھی کے ساتھ ملک گیر دورہ کیا تھا (۶۲)۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں پٹنہ میں مولانا
مظہر الحق کی کوٹھی پہ منعقد ایک عوامی جلسے میں انھوں نے نہایت پُر جوش اور بااثر تقریر کی تھی،
جس سے متاثر ہو کر پٹنہ کالج کے ممتاز طالب علموں کی ایک جماعت نے ملکی کاموں میں
حصہ لینے کے لیے تعلیم کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان طلبا میں جے پرکاش نرائن، کرشن ولبھ
سہائے، سدھیشور پرشاد، پھولن ورما، پشکر ٹھاکر اور ویشیشور دیال شامل تھے (۶۳)۔

مولانا آزاد نے خلافت کے ساتھ برٹش حکومت کے رویے کو دیکھ کر غصے کا اظہار
کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''مسلمان ہندوستان کی مسجدوں اور ان کے اندر کی نمازوں کو لے کر
کیا کریں گے، جن کی اجازت دے دینے پر برٹش گورنمنٹ کی آزادی کو ناز ہے، جب کہ
شریعت و احکام ان کے سامنے آجائیں گے، جن کی تعمیل ہزاروں نمازوں سے بھی اثردار و
اہم ہے اور جن کی نافرمانی کے بعد نہ تو ان کی نمازیں ہی سودمند ہوں گی اور نہ ان کے
روزے ہی ان کو نجات دلا سکیں گے''۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کے ہندوؤں کے ساتھ
احسان اور نیکی کرنے نیز ہمدردی کرنے سے شریعت ہرگز ہرگز نہیں روکتی۔ ہندوؤں کے
ساتھ تعاون اور حکومت کے ساتھ عدم تعاون کو جوڑتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جو مسلمان
مسئلہ امت کے خلاف روش اختیار کریں اور دشمنان ملت سے دفاع میں باوجود استطاعت
حصہ نہ لیں ان سے مسلمانوں کو ترک موالات کر دینا چاہیے (۶۴)۔ مہاتما گاندھی، مولانا
آزاد اور دیگر قومی لیڈروں کی کوششوں سے جو ہندو مسلمان متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف
منظم ہو رہے تھے، سرکار اس اتحاد میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ وائسرائے نے

اپنے ایک بیان میں ہندوستانی مسلمانوں سے اپیل کرتے ہوئے کہا تھا کہ حکومت ہند پھر اپنے اس ارادے کو ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ مسئلۂ خلافت کے فیصلے کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے(۶۵)۔ لیکن مولانا آزاد ہمیشہ ہی خلافت اور عدم تعاون کو طبقاتی و فرقہ وارانہ سطح سے اوپر اٹھا کر چلتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مرکزی خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء کی ایک بیٹھک میں انھوں نے کہا تھا کہ سول نافرمانی کا معاملہ سارے ملک کا ہے۔ کوئی ایک کمیونیٹی اس پر فیصلہ نہیں کر سکتی(۶۶)۔ انھوں نے فروری ۱۹۲۱ء میں پنجاب (اب ہریانہ) کے بھیوانی نگر میں ایک جلسے میں لوگوں کو صلاح دی تھی کہ وہ سرکاری نوکریاں چھوڑ دیں۔ اس جلسے میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ اگر وہ مسلمانوں کے خلاف سرکار کا ساتھ دیں گے تو لاکھوں نمازوں اور روزوں کے رہتے ہوئے بھی انھیں جہنم واصل ہونا پڑے گا(۶۷)۔ ۱۳، ۱۴/ مارچ ۱۹۲۱ء کو اجمیر میں عرس کے موقع پر ہوئی خلافت کانفرنس نے عدم تعاون کے تجاویز کی توثیق کر دی۔ اس میں ملکی ریاستوں سے یہ گزارش کرنے کی تجویز بھی پاس کی گئی کہ وہ خلافت کے تعلق سے انگریزوں کے ساتھ کوئی تعاون نہ کریں۔ افغانستان کے امیر سے بھی یہ اپیل کی گئی کہ وہ ہندوستانیوں کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے انگریزوں کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ کریں(۶۸)۔ حکمرانوں کی سطح پر انگریزوں کے خلاف کی گئی اس مورچہ بندی کو مولانا آزاد کافی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عوام اور حکمرانوں کے ساتھ فوج کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے لیکن ایسا کر لینا کوئی بہت آسان بات نہیں تھی۔ مولانا آزاد کی سرکار سے عدم تعاون اور خلافت تحریک کو کئی مولوی غلط ٹھہراتے تھے۔ ان میں بریلی کے مولوی احمد رضا خاں ان کے لڑکے مولوی حامد رضا خاں اور مولانا سید سلیمان اشرف اہم تھے۔ مولانا آزاد نے ۲۴/ مارچ ۱۹۲۱ء کو مولوی احمد رضا خاں کو ایک خط میں اس مخالفت کے لیے چیلنج کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''چونکہ (۲۴-۲۶/ مارچ ۱۹۲۱ء کو) جمعیۃ العلماء کا جلسہ یہاں منعقد ہو رہا ہے اور یہی مسائل (عدم تعاون وغیرہ) اس میں زیر نظر و بیان ہیں اس لیے میں جناب کو توجہ دلاتا ہوں کہ رفع اختلافات اور مذاکرہ و نظر کا یہ مناسب و بہتر موقع پیدا ہو گیا ہے۔ جناب جلسے میں تشریف لائیں اور ان مسائل کی نسبت طریق احساب علم و فن گفتگو کریں۔ میں ہر طرح عرض و گزارش کے لیے آمادہ و مستعد ہوں''(۶۹)۔ مولوی احمد رضا خاں، سید سلیمان اشرف وغیرہ نے اس چیلنج کو قبول

کر لیا اور ۲۴-۲۶/ مارچ ۱۹۲۱ء کو جمعیۃ العلماء کے جلسے میں سید سلیمان اشرف اور مولانا آزاد کے درمیان اس مسئلے پر سخت بحث و تکرار ہوئی جس میں مولانا آزاد نے بریلی کے ان مولویوں کو یہ یقین کرنے اور ماننے پر مجبور کر دیا کہ آزاد کا نقطۂ نظر صحیح ہے۔ مذکورہ دونوں مولویوں نے مولانا آزاد کو یہ یقین دلایا کہ وہ اسے منظور کرتے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے مولانا آزاد کو ان کاموں میں مکمل تعاون دینے کا وعدہ بھی کیا(۷۰)۔ اس طرح مولانا آزاد نے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو حکومت کے خلاف عدم تعاون کرنے کے لیے تیار کر لیا اور تحریک عدم تعاون کی حمایت میں ایک نئی طاقت منظم کر لی۔ اس قابل ذکر فتح کے بعد ہی انھوں نے ۲۴-۲۶/ مارچ کو جمعیۃ العلماء کی بیٹھک میں مسند صدارت سے اعلان فرمایا کہ فوج میں بھرتی ہونا شریعت کے حساب سے غلط ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ جمعیۃ نے اس بارے میں ایک فتویٰ دیا ہے کہ جو لوگ عدم تعاون کی مخالفت کریں گے، علماء ان پر جرمانہ کریں گے(۷۱)۔ وہ بے خوف ہو کر حکومت کے خلاف ورزی کرتے تھے۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں ہی جب پنجاب میں ''سیڈیشن میٹنگ ایکٹ'' لاگو تھا تب بھی مولانا آزاد نے لاہور اور امرتسر کی مسجدوں میں جمعہ کی نماز کے بعد عدم تعاون کی حمایت میں حکومت مخالف تقریر کی تھی(۷۲)۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے پر حکومت انھیں گرفتار کرنے کی ہمت نہ کر سکی۔

جون ۱۹۲۱ء میں عید کے موقع کو انھوں نے حکومت کے خلاف پوری طرح استعمال کیا۔ عید کے پہلے انھوں نے کلکتہ میں لوگوں سے اپیل کی تھی کہ وہ ترکی کی مدد کے لیے اپنا خرچ کم کر کے سمرنا فنڈ میں تعاون کریں۔ اس کے لیے انھوں نے صلاح دی کہ لوگ سودیشی چیزوں کا استعمال کریں۔ ان کی اس اپیل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑی تعداد میں لوگوں نے عمدہ کپڑے پہننے چھوڑ دیے اور ۱۹/ جون کو عید کی نماز میں بہت سے خوشحال لوگ بھی سادے نیز ہاتھ سے بنے سودیشی کپڑے پہن کر شامل ہوئے(۷۳)۔ خود مولانا آزاد بھی ۱۹۲۰ء سے ہی کھادی پہننے لگے تھے کیوں کہ کھادی پہننا سرکار کے تئیں غیر متشدد مخالفت کے اظہار کا ایک پرانا طریقہ تھا(۷۴)۔ مولانا آزاد کی اپیل کا ایسا اثر دیکھ کر بہار سرکار گھبرا اٹھی اور اس نے قانون فوجداری کی دفعہ ۱۴۴ کے مطابق بہار کے اندر مولانا آزاد کی تقریر پر پابندی لگا دی(۷۵)۔ برٹش سرکار کی مخالفت میں وہ تحریک عدم تعاون کو اس حد تک آگے بڑھا لے گئے کہ انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ اگر کوئی مسلمان طاقت ہندوستان کی

انگریزی حکومت پر حملہ کرے تو انگریزوں کا ساتھ دینا مسلمانوں کے لیے گناہ ہوگا(۷۶)۔
مولانا آزاد چاہتے تھے کہ مسلمان صرف خلافت تحریک تک ہی محدود نہ رہیں بلکہ عدم تعاون
کے سبھی پہلوؤں کو اپنے کردار و عمل میں جگہ دیں۔ انھوں نے چرخہ کاتنے کو مسلمانوں کے
لیے فرض بتایا اور گاندھی جی کے عدم تعاون اور سودیشی تحریک کی حمایت کرتے ہوئے
مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ کسی مسلمان کو اپنی زندگی بیکار نہیں گزارنی چاہیے لہٰذا جو مسلمان
مرد اور عورت بیکار ہوں انھیں چرخہ کاتنے اور کپڑا بُننے پر لگا دیا جائے(۷۷)۔ وہ مہاتما
گاندھی کے پروگرام کو عدم تعاون کا حصہ مان کر اسی طرح قبول کرتے تھے جیسے خود گاندھی
جی اسے قبول کرتے تھے۔ انھوں نے چرخہ کاتنے کی تشہیر پر پورا دھیان دیا تھا اور اپنے
ذریعہ قائم کردہ ملّی درسگاہ مدرسہ اسلامیہ کلکتہ میں چرخہ کاتنے کی تربیت کا نظم کرایا تھا۔ اس
کے انتظام کے سلسلے میں انھوں نے عبدالرزاق ملیح آبادی کو ایک خط میں لکھا تھا کہ ''اگر
مولوی منیر الزماں کے یہاں چرخے عمدہ ہیں تو پانچ چرخے آج ہی منگوا لیے جائیں، قیمت
ان کو دے دی جائے گی۔ یا یوں کہیے کہ جس قدر چرخے ان کے پاس ہوں خلافت کمیٹی
انھیں خرید لے اور کمیٹی سے حسب ضرورت مدرسے کے لیے لے لیے جائیں''(۷۸)۔
لیکن مولانا آزاد مہاتما گاندھی کی طرح مکمل طور پر عدم تشدد کے حامی نہیں تھے۔ گاندھی جی
عدم تعاون کو کلی طور پر تشدد سے پاک رکھنا چاہتے تھے جب کہ مولانا کی نظر میں ظلم کو روکنے
کے لیے تشدد کا سہارا لینا بھی غیر مناسب نہیں تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ''ظلم کے خلاف
دوسری طاقت کے ظلم و مفاسد کا استیصال ہمارا فرض ہے''(۷۹)۔ انسانی حقوق اور آزادی کو
چھیننے یا نقصان پہنچانے والا ان کی نظر میں مجرم تھا اسی لیے انھوں نے انسانی حقوق و آزادی
کو غارت کرنے والوں کو قتل کرنے تک کی حمایت کی تھی(۸۰)۔

مولانا آزاد بہت قبل سے اس نظریے کے حامل تھے کہ مسلمانوں کو فوج میں نوکری
نہیں کرنی چاہیے۔ اپنے اسی یقین و اعتماد کی وجہ کر انھوں نے رانچی کی نظربندی کے دوران
ہندوستان کے وائسرائے کو ایک خط میں لکھا تھا کہ ''کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے
کہ ایک لمحے کے لیے بھی برٹش گورنمنٹ کی نوکری کرے۔ نہ صرف یہ حرام ہے بلکہ قرآن و
حدیث کے قطعی احکام کے بموجب یہ لفظ کافی نہیں کہ حرام ہے بلکہ اسلام اور کفر کا فیصلہ
کر دینے والا ہے۔ ہر لمحہ جو ایک بدبخت کے لیے انگریزی جھنڈے کے نیچے گزرے گا وہ

اس کے لیے حرام ہے''(۸۱)۔ اسی یقین کی بنیاد پر مولانا آزاد نے مارچ میں منعقدہ
جمعیۃ العلماء کی بیٹھک میں یہ کہا تھا کہ فوج میں نوکری کرنا شریعت کے حساب سے حرام
ہے۔ صرف عدم تشدد تک محدود نہ رہنے کے ان کے جذبات اس بات سے بھی واضح ہوتے
ہیں کہ انھوں نے کلکتہ میں عید کے موقع پر کی گئی تقریر میں انگلینڈ کی حکومت کو مسلمانوں کے
پُرتشدد ہو اٹھنے کا انتباہ دے دیا تھا۔ انھوں نے حکومت کی بدنیتی کو واضح کرتے ہوئے عوام
سے کہا تھا کہ انگلینڈ کی سرکار کمال پاشا کو ختم کر دینا چاہتی ہے(۸۲)۔ اس کے خلاف
مولانا نے پریس کو دیے گئے ایک بیان میں سرکار کو متنبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر دنیا میں
دشمنانِ اسلام کے خلاف لڑنے والی کوئی آزاد اور طاقت ور جماعت ہے اور جو دنیا کے
مسلمانوں کا فرض نبھا رہی ہے تو وہ واحد جماعت کمال پاشا کی جماعت ہے۔ میں صاف
طور سے بتانا چاہتا ہوں کہ اگر برٹش سرکار کمال پاشا کے خلاف کوئی فوج بھیجے تو یہ اسلام کے
خلاف پھر دشمنی شروع کرنے کے مترادف ہوگا۔ ایسے نازک حالات پیدا ہو جائیں گے جن
کا تصور بھی ہمارے بے ادب اور متکبر حکمرانوں نے نہیں کیا ہوگا، انھوں نے یہ واضح کر دیا
کہ مسلمان کسی بھی حالت میں ترکی حکومت کے خلاف کوئی قدم برداشت نہ کریں گے۔
انھوں نے کہا کہ ایسی حالت میں ہندوستانی مسلمان مذہب کے مطابق اپنے موجودہ رویے
پر نظر ثانی کرنے نیز عدم تعاون تک محدود نہ رہنے کے لیے مجبور ہوں گے(۸۳)۔ مولانا
آزاد کے پوری طرح عدم تشدد پر عمل پیرا نہ ہونے کا ثبوت انھیں کے لفظوں سے ظاہر ہوتا
ہے کہ ''ہم نے آزادی اور حق طلبی کی جنگ میں نان وائی لینس و نان کوآپریشن کی راہ اختیار
کی ہے ... مہاتما گاندھی کی طرح میرا عقیدہ نہیں ہے کہ کسی حال میں ہتھیار کا مقابلہ ہتھیار
سے نہ کرنا چاہیے ... لیکن ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی اور موجودہ جدوجہد کے لیے مہاتما
گاندھی کے دلائل سے متفق ہوں''(۸۴)۔ اس طرح انھوں نے خلافت کے سوال کو
اُٹھاتے ہوئے حکومت کو عدم تعاون کی دھمکی اور تشدد کے امکانات سے متنبہ کرتے ہوئے
عدم تعاون و خلافت کے مشترکہ ہتھیار سے سرکار کی طاقت کو توڑنے کے لیے کوئی کسر نہیں
اٹھا رکھی تھی۔ حکومت کے خلاف عوام میں ماحول تیار کرنے کے دوران انھوں نے یہ محسوس
کر لیا تھا کہ جب حکومت پریشان ہو جائے گی تو اس کے پاس عوام الناس کی گرفتاری کے
علاوہ اور کوئی راستہ نہ ہوگا۔ اس حالت سے نبٹنے کے لیے انھوں نے عوام کے دل میں پہلے

ہی جذبہ بھر دیا تھا کہ ملک کے استحکام کے لیے گرفتاری سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہو سکتی (۸۵)۔ ۲۳ر جون ۱۹۲۱ء کو دہلی کے دارالاشاعت ہند کے منتظم کی جانب سے ایک فتویٰ جاری کیا گیا جس میں اسکول، عدالت، کاؤنسل اور فوج سے انگریزوں کے ساتھ عدم تعاون کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ فتویٰ اس طرح تھا:

تمام ہندوستان کے علماء کا مذہبی فتویٰ

(۱) سرکاری کاؤنسلوں کا ممبر ہونے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

(۲) برٹش عدالتوں میں وکالت کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

(۳) سرکاری یا نیم سرکاری اسکولوں میں پڑھنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

(۴) سرکار کے ذریعہ عطا کردہ اعزازی مجسٹریٹ کا عہدہ یا دیگر اعزازی خطابات و القاب رکھنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

(۵) گورنمنٹ کی تمام نوکریاں، جس سے سرکار کی مدد ہوتی ہے، حرام ہے۔ خاص کر پولس اور فوج کی نوکری کرنا سخت گناہ ہے کیوں کہ ان کو اپنے بھائیوں پر گولیاں چلانی پڑتی ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ ''جو جان بوجھ کر ایک مسلمان کو قتل کرتا ہے وہ جہنم کی آگ میں جلے گا''۔ پیغمبر صاحب نے کہا ہے کہ ''جو بھی مسلمان کے خلاف ہتھیار اٹھاتا ہے وہ مسلمان نہیں رہتا''۔

اس فتوے پر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا آزاد سبحانی کانپوری، مولوی کفایت اللہ دہلوی، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا عبدالباری لکھنوی، مولانا ثناء اللہ اور مولانا عزیز الرحمٰن مفتی دارالعلوم دیوبند کے دستخط تھے۔

یہ فتویٰ مولانا ابوالکلام آزاد کے حکم سے عوام میں تقسیم کیا گیا۔ اسے بنگال اور بمبئی میں چھپوا کر تقسیم کرنے کی ذمہ داری انھیں پر ڈالی گئی تھی۔ یہ فتویٰ کلکتہ، یوپی، دہلی اور پنجاب میں بھی بانٹا گیا۔ سرکاری حلقوں میں اسے مولانا آزاد اور عبدالباری کا کام مان کر تشویش ظاہر کی گئی تھی (۸۶)۔ عدم تعاون کے نشر و اشاعت کے کاموں کو خلافت تحریک کے ساتھ لے کر چلنے میں مولانا آزاد لگاتار مذہب اور شریعت کا سہارا لے رہے تھے۔ مذہب پسند مسلمانوں کو تحریک میں شامل کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری بھی تھا۔ اس لیے انھوں نے ۲۵، ۲۶ر جون ۱۹۲۱ء کو پٹنہ میں علمائے کرام کے ایک جلسے میں مسلمانوں کو منظم کرنے پر زور دیا۔ اس جلسے میں تنظیمی کاموں کے لیے شریعت کے مطابق مسلمانوں کی

رہنمائی کے مقصد سے مولانا آزاد کے قابل اعتماد دوست، گیا کے مدرسہ انوار العلوم کے سربراہ مولوی محمد سجاد اور سید سلیمان ندوی وغیرہ دس افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی (۸۷)۔ ۲۶ر جون کو صبح سویرے کے اجلاس سے بحیثیت صدر خطاب کرتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں سے اپنے سارے آپسی اختلافات کو بھول کر ایک ہونے کی اپیل کی تھی (۸۸)۔ اس وقت مولانا کے پیروں میں زخم تھے اور وہ چلنے میں پریشانی محسوس کر رہے تھے لیکن اپنی حب الوطنی کی وجہ کر ایسی حالت میں بھی وہ یکم جولائی کو کلکتہ کے مرزاپور اسکوائر کے ایک جلسے میں شامل ہوئے (۸۹)۔ یہاں عدم تعاون کی حمایت میں ایک بیان دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں اور لالہ لاجپت رائے، حکیم اجمل خاں اور گاندھی جی دلّی کی عدم تعاون تحریک چلانے کا فیصلہ کرنے والی بیٹھک میں موجود تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اسے سنجیدگی، عقیدت اور خدا پر یقین کے ساتھ اپنائیں گے تو ہمیں کوئی طاقت ہمارے راستے سے ہٹا نہیں سکتی۔ انھوں نے سرکار کو زیادتی کرنے کے لیے اُکساتے ہوئے اور عوام کو بے خوفی سے اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ —— اللہ کی زمین پر بویا گیا کوئی بھی بیج تب تک پھل نہیں دے سکتا جب تک کہ وہ سرکاری ظلم و زیادتی کے پانی سے نہ سینچا جائے۔ دنیا کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس پیڑ کو کون سے پانی نے سینچا ہے؟ جو آزادی یورپ اور مشرقی خطے کے ممالک میں قائم ہوئی ہے۔ خدائی صداقت اور تاریخ کے حقائق بتاتے ہیں کہ ظلم کے علاوہ اور کوئی پانی اسے سینچنے والا نہیں تھا ...اس سے زیادہ خوشی کی بات نہیں ہوسکتی کہ بنگال سرکار نے دور اندیشی کی وجہ کر وہی ظلم کی پالیسی اپنائی ہے اور پچھلے ہفتے میں سوراج و خلافت کے تین رضا کاروں کو گرفتار کرلیا ہے... انھوں نے اس کے علاوہ کوئی گناہ نہیں کیا کہ وہ اپنے بھائیوں کو وہ سب بتا رہے تھے جو آج ملک کے ہر باشندے یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں کے بھی دل میں ہے۔ اگر سوراج کی طرف بلانا اور خلافت کے لیے نصیحت کرنا نیز سرکار کے مظالم کو کھول کر رکھنا جرم ہے تو سوال یہ ہے کہ انھیں گرفتار کرنے کا مطلب کیا ہے؟ آج نہ صرف بنگال میں بلکہ سارے ہندوستان میں کروڑوں لوگ رہتے ہیں جو ایسا پاکیزہ جرم کرنے سے انکار نہیں کریں گے۔ کیا کوئی ایک ہندوستانی بھی یہاں ہے جس کے دل میں یہ پاکیزہ گناہ نہ ہو؟ اس جلسے میں انھوں نے صاف لفظوں میں سرکار کو چیلنج کیا کہ سرکار انھیں گرفتار کرے ورنہ وہ سرکار کے

خلاف ممکنہ حد تک کوشش کرتے رہیں گے۔ انھوں نے کہا کہ حکومت کو ظالم کہنا ایک پاکیزہ بات ہے۔ میں یہاں کھلے میدان میں بھی یہی کہہ رہا ہوں ... میں نے کئی بار جرم کیا ہے اور آج اس جلسے میں اعلان کرتا ہوں کہ مسلمان ہونے کے ناطے ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے یا تو میں حکومت کا یہ طریقہ بدل دوں گا اور اگر میں ظلم کا طریقہ نہ بدل سکا تو اس حکومت کو ختم کر دوں گا۔ مولانا آزاد نے لوگوں کو جیل جانے کے لیے جوش دلاتے ہوئے کہا کہ اگر حقیقت میں تم مسلمان ہو، اگر اصل میں خلافت کا فرض تمھارے دماغ میں ہے، اگر یہ بات تمھارے دماغ میں ہے کہ پیغمبر اسلام کی خواہش اور ان کا حکم تھا کہ مذہبی مقام کو لامذہبوں کے ہاتھ سے بچایا جائے، اگر تم نے وعدہ کیا ہے کہ یہ ملک غلامی کے آگے نہیں جھکے گا تو پورے جوش، عہد اور سنجیدگی سے اس کا استقبال کرو کہ تم میں سے ہر شخص جیل جانے کے لیے تیار رہے گا... ہر ایک کو جیل جانے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اگر ہم اپنے ملک کی آزادی کے لیے، نجات کے لیے جیل جا رہے ہیں تو یہ جیل نہیں ہے پھولوں کا بستر ہے(۹۰)۔

۸؍جولائی کو کراچی میں مولانا محمد علی کی صدارت میں منعقد خلافت کے اجلاس میں بھی سرکار کے ساتھ تعاون نہ کرنے اور فوج میں بھرتی ہونے کو حرام ٹھہرانے والی تجویز پاس کی گئی۔ اس میں کہا گیا کہ —— یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ اس وقت فوج میں رہنا، فوج میں نام لکھانا یا کسی کو فوج میں شامل کرانا شریعت کی نظر میں حرام ہے۔ سبھی مسلمانوں کا اور بالخصوص علماء کا یہ فرض ہے کہ وہ فوج کے مسلمانوں تک ان احکام کو پہنچا دیں۔ اجلاس یہ اعلان کرتا ہے کہ اگر انگلینڈ کھلے عام یا پوشیدہ طور انگورا کے خلاف کوئی کارروائی کرتا ہے تو ہندوستانی مسلمان سول نافرمانی شروع کر دیں گے اور احمد آباد میں ہونے والے کانگریس اجلاس میں کانگریس کے ساتھ مل کر ہندوستان کے لیے مکمل خود مختاری نیز قیام جمہوریت کا اعلان کر دیں گے(۹۱)۔ فوج میں عدم تعاون کے فتوے سے متعلق مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، آچاریہ کرپلانی، راجندر بابو، جمنا لال بجاج، ڈاکٹر مشتاق احمد انصاری، حکیم اجمل خاں اور آزاد سبحانی وغیرہ لیڈران کی طرف سے ایک مشترکہ بیان جاری کیا گیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ ہر ہندوستانی سپاہی اور سول ملازم حکومت سے قطع تعلق کر کے اپنی گزر، بسر کے لیے دیگر ذرائع معاش تلاش کریں(۹۲)۔ اس کے ایک ہفتہ بعد ہی پندرہ جولائی کو مولانا آزاد نے کلکتہ کے مرزاپور اسکوائر میں ایک جلسۂ عام کو خطاب کیا(۹۳)۔ اس مرتبہ انھوں

نے پھر سے عوام کو جیل بھرنے کے لیے اُکسایا۔ انھوں نے پندرہ دن قبل کلکتہ میں عدم تعاون کے تحت گرفتار ہونے والے تین اشخاص کے سلسلے میں کہا کہ جب یہ تین لوگ اپنا فرض پورا کر رہے ہیں تو کلکتہ کے لاکھوں ہندوؤں اور لاکھوں مسلمانوں کا کیا فرض ہے۔ اگر سچائی میں آپکا یقین ہے، اگر آپ خلافت کے لیے دل میں کچھ محسوس کرتے ہیں، اگر آپ کے دل میں سچائی کا ایک ذرہ بھی باقی ہے، اگر سچ کا ایک ذرہ بھی آپ تک آتا ہے تو فیصلہ کیجیے، یہ تہیہ کیجیے کہ جس کام کے لیے وہ تین لوگ جیل گئے ہم اسی کو نظر میں رکھ کر وہی راستہ اختیار کریں گے۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ علی پور جیل میں چوروں کے لیے کوئی کوٹھری خالی نہ رہے۔ سب کی سب ان پاکیزہ قیدیوں سے بھر جائے جو خدا کی راہ میں جیل کے کپڑے پہنیں گے۔ میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ تم میں سے کسی کے جیل جانے پر تم کوئی مظاہرہ نہ کرو گے۔ اگر انھیں (تینوں قیدیوں کو) پھانسی لگتی ہے تو ان کے متعلقین، بیوی بچوں کے پاس تعزیت کرنے نہیں جاؤ گے بلکہ مبارک باد دینے جاؤ گے۔ وہ لوگ اسے سمجھیں گے اور خود مختاری دینے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ انھوں نے سودیشی چیزوں کو مشتہر نیز ان کے استعمال پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہندو اور مسلمان مل کر عہد کریں کہ آپ ایک دن کے لیے بھی غیر ملکی کپڑا نہیں خریدیں گے۔ غیر ملکی کپڑا بیچنے والی دوکانوں میں آپ اس کے لیے کوشش کریں گے(۹۴)۔ انھوں نے پُر امن طور پر عدم تعاون کرنے کی صلاح دیتے ہوئے کہا کہ اگر آپ ہتھیار سے لڑیں گے تو آپ کو کامیابی نہیں ملے گی۔ امن اور خاموشی سے اچھی کوئی بہتر چیز نہیں ہے۔ اسے واضح کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ امن کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کا چہرہ خاموش ہوگا لیکن روح میں خاموشی نہیں ہوگی۔ آپ کی روح میں ملک کی آزادی کی لہریں اٹھ رہی ہوں گی۔ خود میں قوت پیدا کیجیے۔ ایثار کی قوت۔ راستہ، جو ہمارے سامنے آگیا ہے وہ طوفان میں آیا ہے، جس میں ہمالہ کی چوٹیوں جیسی پریشانیاں ہیں۔ اس میں ہماری فتح ہے(۹۵)۔ مولانا نے فوج میں عدم تعاون کی شروعات کرنے کے لیے فتوے کو ملک میں تقسیم کرایا تھا۔ اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے پروپیگنڈہ کرنے کی غرض سے کانگریس کی مجلس منتظمہ کی ۲۸ سے ۳۰؍جولائی ۱۹۲۱ء تک ہوئی میٹنگ میں مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، مولانا شوکت علی اور لالہ لاجپت رائے کی ایک کمیٹی بنائی گئی تھی(۹۶)۔ ۲۵؍اگست ۱۹۲۱ء کو آگرہ میں منعقد خلافت کانفرنس میں عدم تعاون کا مفہوم

سمجھاتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا کہ ''ترک موالات کے ضمن میں قرآن مجید کے احکام کیا ہیں؟ ترک موالات کے معنی ہوئے ''ہر طرح کے تعلقات کو منقطع کر لینا''۔ جب تک وہ جماعت (برٹش سرکار) اپنے ظلم سے باز نہ آئے...جن غیر مسلمان قوموں کا یہ حال ہے کہ وہ مسلمان قوموں کے ساتھ قتال کریں، مسلمانوں کو ان کی بستیوں سے نکالیں، ایسی غیر مسلمان قوموں کی نسبت بلا شبہ قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے ساتھ تعلقات منقطع کر لیے جائیں''۔ انھوں نے کہا کہ جس کے غرور سے اللہ کی عالمگیر صداقت کو سب سے بڑا خطرہ ہے وہ برٹش گورنمنٹ کے سوا کوئی دوسری طاقت نہیں ہے(۹۷)۔

حکومت ملک میں جاری تمام سرگرمیوں پر نظر رکھ رہی تھی۔ وہ قوم پرستانہ جذبات کو کچلنے کے لیے کسی بھی موقع کی تلاش میں تھی اور وہ موقع اسے کراچی کی خلافت کانفرنس سے حاصل ہوگیا۔ کراچی میں مولانا محمد علی کی صدارت میں، فوج میں نوکری کو حرام قرار دینے والی جو تجویز پاس ہوئی تھی اس کے جرم میں سرکار نے ۱۴ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو علی برادران کو گرفتار کر لیا(۹۸)۔ چار دن بعد ۱۸ر تاریخ کو اس گرفتاری کی خبر پہنچی۔ اس وقت مولانا آزاد نے ایک عوامی جلسے کا انعقاد کیا اور اس میں شریک بیس ہزار لوگوں کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''جس ریزولیوشن کی بنا پر علی برادران گرفتار کیے گئے ہیں وہ اسلام کا مانا ہوا ایک مشہور و معروف مسئلہ ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کا اعلان کرے۔ وہ ریزولیوشن دراصل میرا ہی تیار کیا ہوا ہے اور میری ہی صدارت میں سب سے پہلے اسی کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں منظور ہوا ہے۔ میں اس سے بھی زیادہ تفصیل اور صفائی کے ساتھ اس وقت اس کے مضمون کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ سی. آئی. ڈی. کے انسپکٹر بیٹھے ہیں اور انھیں سے کہتا ہوں کہ جرح قلم بند کرلیں۔ اگر یہ جرم ہے تو گورنمنٹ کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا ارتکاب ہمیشہ ہوتا رہے گا''(۹۹)۔ انھوں نے مسلمانوں کو یہ کام کرنے کے لیے جوش دلاتے ہوئے کہا کہ ''چونکہ گورنمنٹ نے اسلامی حکم کی تبلیغ کو جرم قرار دیا ہے اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس اعلان میں اپنی جان لگا دیں اور ہر مقام پر اس غرض سے جلسے منعقد کیے جائیں''۔ انھوں نے پھر کہا کہ میں نے ہی کلکتہ خلافت کانفرنس (۱۰۰) میں اس کا اعلان کیا تھا اور بریلی میں میں نے ہی اسے (فوج سے عدم تعاون کے فتوے کو) اپنی صدارت میں پاس کرایا تھا(۱۰۱)۔... گورنمنٹ کو چاہیے تھا کہ علی برادران سے پہلے مجھ پر مقدمہ چلاتی۔ اتنا بڑا چیلنج سن کر بھی

سرکار مولانا آزاد کو گرفتار کرنے کی ہمت نہ کر سکی(۱۰۲)۔

ان دنوں مولانا آزاد نہایت ہی شدت کے ساتھ تحریک عدم تعاون کے لیے سرگرم عمل تھے۔ سودیشی اور فوج میں عدم تعاون کی تبلیغ وتشہیر ان کے پروگرام کا خاص جز تھی۔ ۲۱ر تا ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو ہونے والی جمعیت العلماء ہند اور مرکزی خلافت کمیٹی کی نشستوں میں کراچی کے فتوے پر غور وخوض کیا گیا، جس میں مولانا آزاد کی نمائندگی میں علماء نے فوراً ہی نہایت سختی کے ساتھ سول نافرمانی پر عمل درآمد کرنے کا تہیہ کیا تھا(۱۰۳)۔ ۹ر اکتوبر ۱۹۲۱ء کی شام کو انھوں نے بمبئی کے جلسے میں بابو راجندر پرشاد، مہاتما گاندھی، لالہ لاجپت رائے اور شریمتی سروجنی نائیڈو کے ساتھ مل کر کراچی کی تجویز عدم تعاون جیسی ہی ایک تجویز پاس کرنے کی تائید کی۔ بعد میں وہ غیر ملکی کپڑے جلانے کے ایک پروگرام میں بھی شامل ہوئے(۱۰۴)۔ ۲۵ر اکتوبر کو آگرہ خلافت اجلاس میں انھوں نے خلافت کے دفاع کے لیے عدم تعاون پر عمل کرنے کی اپیل کرتے ہوئے لوگوں سے کہا کہ ''وہ کپڑا جو اپنے جسم پر لپیٹے ہو اس سے دشمن کی کتنی مدد تم انجام دے رہے ہو، تمھارے کپڑوں کے ذریعہ کتنا کروڑ روپیہ ہر سال ان کے خزانے میں چلا جاتا ہے، جو پانچ سال سے اسلام کو مٹانے میں صرف کیا جا رہا ہے۔ تمھارے فائدے کے لیے، خلافت اور سوراج کے لیے ضروری یہ ہے کہ ملک میں قربانی کا ولولہ پیدا ہو...اگر تمھارے دل میں اتنا عشق نہیں ہے کہ تم ان باریک کپڑوں کو چھوڑ کر موٹے کپڑے پہن سکو تو کیا تمھارے دل میں یہ آسکتا ہے کہ تم خدا کی زمین میں بسنے کی ہمت کرو۔ غیر ملکی کپڑوں کا بائیکاٹ، جب تک ملک کی اس منزل کو طے نہ کرو، قربانی کی کوئی منزل سامنے نہیں آسکتی...اگر تم اپنی جان قربان کر سکتے ہو تو تم کو کیا ہو گیا ہے جو تم اپنا لباس قربان نہیں کر سکتے۔ تم میں سے ہر مسلمان اور ہندو کا بڑا پاک اور اشرف فرض ہے۔ جتنا جلد ممکن ہو سکے اس معاملے کو کامیابی تک پہنچا دو(۱۰۵)۔ اس اجلاس کے دوسرے دن ۲۶ر اکتوبر کو جلسے کی اختتامی تقریر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے عوام کے سامنے ایک مرتبہ پھر علی برادران کی گرفتاری کو غلط بتا کر خود اپنے آپ کو گرفتار کرانے کی چنوتی دیتے ہوئے کہا کہ ''ہاں ہاں میں نے سپاہیوں سے، ہندوستان کی برٹش فوج سے یہ کہا ہے اور جب تک میرے حلق میں آواز پھنستی نہیں، یہی کہتا رہوں گا۔ آج بھی اعلان کرتا ہوں اور جب تک میری زندگی باقی ہے، ہر صبح کو، ہر شام کو

میرا پہلا فرض یہ ہوگا کہ سپاہیوں کو ورغلاؤں اور ان سے کہوں کہ گورنمنٹ کی نوکری چھوڑ دو۔ کیا عظیم الشان برٹش گورنمنٹ جس کی حکومت میں کبھی سورج نہیں ڈوبتا، تیار ہے کہ گرفتار کرے؟ اگر یہ جرم ہے تو اس جرم کا ارتکاب سارا ملک کر رہا ہے۔ میں نے سپاہیوں سے بھی کہا ہے اور لوگوں سے بھی کہا ہے کہ تم سپاہیوں کے پاس چھاؤنیوں میں جاؤ اور سپاہیوں کو یہ پیغام سناؤ۔ پھر برٹش گورنمنٹ اگر اپنی طاقت کا گھمنڈ رکھتی ہے تو کیوں نہیں قدم آگے بڑھاتی؟ کیا گورنمنٹ کی مشینری پر فالج گر گیا ہے" (١٠٦)۔ عدم تعاون اور خلافت کے لیے انھوں نے کہا کہ "برٹش گورنمنٹ اسلام کے اور ہندوستان کے مقابلے میں لڑنے والا فریق ہے۔ اس لیے برٹش گورنمنٹ سے مددگاری کا کوئی رشتہ بھی رکھنا جائز نہیں ...اگر انگریزی راج کی فوج میں سپاہی کو گناہ نہیں کرنا پڑتا بلکہ انگریزی راج چھاؤنیوں میں مسجد و مندر بنا کر مسلمان اور ہندو سپاہیوں سے کہتا کہ صبح وشام خدا کے آگے ماتھے ٹیکو تو بھی میں یہی کہتا کہ انگریزی راج کی فوج میں بھرتی ہونا کسی ہندو یا مسلمان کے لیے جائز نہیں" (١٠٧)۔ تقریروں کے علاوہ اپنے مضامین کے ذریعہ بھی مولانا آزاد عوام کو حکومت کے تئیں مخالف اور باغی بنا رہے تھے۔ وہ اپنے مضامین میں نہایت اشتعال انگیز باتیں لکھ رہے تھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے لکھا تھا کہ جس نے کسی انسان کا ناحق خون کیا ہے اس سے قصاص لیا جائے گا، کہ اس کے عمل بد سے دنیا محفوظ رہے" (١٠٨)۔

مولانا آزاد کے تبلیغ و تشہیر کے کاموں سے سرکار فکرمند ہو رہی تھی، دوسری طرف قومی کاموں کے تئیں ان کے حوصلے کو دیکھتے ہوئے ملک کی واحد طاقتور سیاسی تنظیم کانگریس کے اندر ان کا مقام نیز ان کی عزت وعظمت برابر بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اسی لیے کل ہند کانگریس کمیٹی کی ۴، ۵رنومبر کو دہلی میں ہوئی بیٹھک میں مولانا آزاد کو کانگریس کی مجلس منتظمہ کا رکن چن لیا گیا (١٠٩)۔

اسی ماہ کی ١٧ر تاریخ کو شہزادہ ویلس ہندوستان کے دورے پر آئے (١١٠)۔ کانگریس نے شہزادے کے سامنے ہڑتال کرنے اور ان کا بائیکاٹ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ حکومت اسے روکنا چاہتی تھی۔ سب سے پہلے بنگال کی سرکار نے ٢٠رنومبر ١٩٢١ء کو عدم تعاون تحریک میں مددگار سبھی تنظیموں کو غیر قانونی قرار دے دیا (١١١)۔ مولانا آزاد ماہ ستمبر کے اوائل سے ہی شہزادہ ویلس کی مخالفت میں ہونے والی ہڑتال کے لیے کلکتہ میں تیاری کر رہے

تھے (١١٢)۔ سارے ملک میں اسی طرح کی ہڑتال اور بائیکاٹ کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ لارڈ مانٹیگو نے اس بائیکاٹ کے خلاف خبردار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر کوئی ہماری سلطنت کے خلاف اٹھے گا ... اس غلط فہمی میں پڑ کر کہ ہم ان کے کہنے سے ہی ہندوستان سے چلے جائیں گے، من مانی مانگ کریں گے تو ایسا کرنے والے دھوکہ کھائیں گے۔ دنیا کی سب سے زیادہ پختہ ارادے والی انگریز قوم کو للکار کر وہ فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ انھیں ٹھکانے لگانے کے لیے انگریز قوم پھر ایک مرتبہ اپنی مردانگی اور ارادے کی پختگی دکھا دے گی (١١٣)۔

مولانا آزاد حکومت اور اس کے رویے کی پرواہ کیے بغیر اپنا کام کرتے جا رہے تھے۔ جہاں بھی انھیں موقع ملتا تھا وہیں وہ عدم تعاون کی حمایت میں تجویز پاس کراتے تھے۔ عوام کو ہر طرح سے اس جہت سے بیدار رکھتے تھے۔ ١٨-٢٠رنومبر کو لاہور میں منعقد جمعیت العلماء کی کانفرنس میں مولانا کے زیر صدارت سبجکٹ کمیٹی میں جو تجاویز پاس کیے گئے ان کے مطابق:

(١) دہلی میں پاس کیے گئے فتوے کی تجویز کی توثیق کی گئی اور مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ شریعت کے مطابق اس پر عمل کریں۔

(٢) ہندوستان کو آزاد کرانے کے کام کو مسلمانوں کا مذہبی فریضہ بتاتے ہوئے ان سے کہا گیا کہ وہ مذہبی و سماجی معاملوں میں پوری طرح آزاد ہیں۔

(٣) دین اسلام و قانون کے مطابق مسلمانوں کو دیگر ہندوستانی فرقے کے ساتھ مل کر ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کرنے پر زور دیا گیا۔

(٤) برٹش فوج و پولس کا استعمال مسلم حکومت کو برباد کرنے، مسلمانوں کو ہلاک کرنے اور انسانیت و انصاف کے حق کو دبانے کے لیے ہوتا ہے، اس لیے اس میں ملازمت کرنا حرام ہے۔

(٥) خلافت کے احکام کی تشہیر اور برائے امداد خلافت چندہ جمع کرنے کے لیے ایک نمائندہ وفد کے ذریعہ ملک گیر سفر کا فیصلہ کیا گیا (١١٤)۔

اسی کانفرنس میں مولانا کو "امام الہند" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ کانفرنس نے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کو مسلمانوں کے لیے مذہبی فریضے سے بھی اہم فرض قرار دیا تھا (١١٥)۔

مولانا آزاد کو یہ یقین تھا کہ ان تحریکوں کا انجام یقینی طور پر ہندوستان اور

ہندوستانیوں کے حق میں ہوگا۔ انھیں یہ بھی یقین تھا کہ حکومت کو اپنے غرور کے تخت سے اترنا ہوگا اور حق وانصاف کے ساتھ جھکنا پڑے گا یا ہمیشہ کے لیے تخت ہی چھوڑ دینا پڑے گا(۱۱۶)۔

حکومت مولانا آزاد کی سرگرمیوں پر برابر نظر رکھ رہی تھی۔ جب وہ لگاتار متشدد ہوتے چلے گئے تو ۱۰؍ دسمبر ۱۹۲۱ء کو عدم تعاون کی تبلیغ کی وجہ کر بنگال سرکار نے قانونِ فوجداری کی ترمیم شدہ ایکٹ کی دفعہ ۱۷ کے تحت انھیں اور مسٹر چترنجن داس کو گرفتار کر لیا۔ لیکن اس سے حالات پر امن ہونے کے بجائے مزید خراب ہوگئے۔ بنگال میں لوگوں نے بڑے پیمانے پر ہڑتال کی اور بدیشی کپڑوں کی ہولی جلائی(۱۱۷)۔ گرفتاری سے قبل مولانا آنے والے ۲۴؍ دسمبر کو شہزادہ ویلس کے خلاف کلکتہ میں ایک ہڑتال کرانے کے انتظام میں مشغول تھے(۱۱۸)۔ وہ اس ہڑتال کی کامیابی کے تئیں مکمل طور سے پُرامید تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کو کلکتے کی طرف سے مطمئن رہنے کو کہا تھا(۱۱۹)۔ لیکن ہڑتال ہونے کے قبل ہی وہ گرفتار ہو گئے۔ وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے ملک بھر میں ظلم وتشدد کا جال بچھا دیا۔ بعد میں وائسرائے نے کانگریس اور سرکار کے درمیان بات چیت کیا جانا منظور کر لیا تھا(۱۲۰)۔

چنانچہ مدن موہن مالویہ نے چترنجن داس اور مولانا آزاد کی مدد سے سرکار اور کانگریس کے درمیان ثالثی کر کے دونوں میں سمجھوتے کی کوشش شروع کر دی۔ مالویہ جی نے کلکتہ پریسیڈنسی جیل جا کر مولانا آزاد اور چترنجن داس سے بات چیت کی۔ مالویہ جی سے بات چیت کے دوران مولانا آزاد نے ۱۴؍ دسمبر ۱۹۲۱ء کو اس بات پر زور دیا تھا کہ پرنس آف ویلس کا بائیکاٹ کرنے پر جن لوگوں کو عدم تعاون کی حمایت کرنے اور حکومت کے خلاف فتویٰ دینے کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے انھیں چھوڑا جائے۔ جب تک ایسے قیدی نہیں چھوڑے جاتے تب تک ہمارے لیے کسی بھی طرح کی شرطیں قبول کر سکنا ممکن نہیں ہے۔ مالویہ جی نے اس سلسلے میں وائسرائے سے بات کرنے کے بعد اسی رات کو ۱۲ بجے مولانا آزاد اور چترنجن داس کو بتایا کہ فتوے کے قیدیوں کو پہلے چھوڑ دیے جانے سے وائسرائے کی پوزیشن بہت خراب ہو جائے گی۔ وائسرائے نے یقین دلایا ہے کہ حکومت اور کانگریس کی گول میز کانفرنس کے وقت ہم (وائسرائے) فتوے کے قیدیوں کو بھی چھوڑ دیں گے(۱۲۱)۔ اس گفتگو کے بعد چترنجن داس اور مولانا آزاد نے ۱۸؍ دسمبر ۱۹۲۱ء کو گاندھی جی کو تار دیا کہ ہم سفارش کرتے ہیں کہ درج ذیل شرطوں پر ہڑتال اٹھالی جائے:

(۱) سرکار ایک کانفرنس کرے، جس میں کانگریس کے ذریعہ اٹھائے گئے سارے سوالوں پر غور وخوض ہو۔

(۲) حال ہی میں نکالے گئے سرکاری اشتہار نیز پولیس اور مجسٹریٹوں کے احکام کو سرکار واپس لے لے۔

(۳) اس نئے قانون کے مطابق گرفتار سارے قیدی بنا شرط چھوڑے جائیں۔

گاندھی جی نے ۱۹؍ دسمبر کو اس کا جواب دیا۔ انھوں نے عدم تعاون کے فتوے اور کراچی کے قیدیوں کو بھی شامل کرتے ہوئے ہڑتال واپس لینا قبول کر لیا(۱۲۲)۔ مولانا آزاد ہڑتال واپس لینے اور پرنس آف ویلس کے خلاف مظاہرہ نہ کرنے پر تو متفق تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ پرنس کا بائیکاٹ واپس نہیں لیا جا سکتا کیوں کہ اس کے ذریعہ ملک پہلی بار سرکار سے کھلم کھلا ٹکر لے رہا تھا(۱۲۳)۔ ہڑتال کی واپسی کے سمجھوتے کے سلسلے میں حکومت کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے لیے مولانا آزاد اور چترنجن داس نے پندرہ فروری ۱۹۲۲ء کی تاریخ مقرر کی تھی، لیکن وائسرائے نے سمجھوتے کی گفتگو میں تاخیر ہونے سے یہ سمجھ لیا کہ ہڑتال کا روکنا ممکن نہیں ہوگا۔ مولانا آزاد کے لفظوں میں ''وائسرائے نے دوستی کا جو ہاتھ بڑھایا تھا وہ سرکار میں موجود شدت پسندوں کے اثر سے کھینچ لیا''(۱۲۴)۔ اس کے بعد پرنس آف ویلس کے خلاف کلکتہ میں ایک زوردار ہڑتال ہوئی۔ یہ ہڑتال اتنی کامیاب اور مکمل تھی کہ اس میں قصابوں کی دوکانیں بھی بند رہیں(۱۲۵)۔

مولانا خلافت کو انگریزوں کے خلاف ایک ایسا ہتھیار بنائے رکھنا چاہتے تھے جو ہر طرح سے کام دیتا رہے۔ جب ملک میں خلافت کے لیے تحریکوں کا زور مدھم پڑ گیا تھا تو کچھ مسلم لیڈران عدم تعاون کا ساتھ دینے کے حامی نہیں رہے تھے۔ مشہور لیڈر مولانا عبدالباری نے فرنگی محل لکھنؤ سے اپنے ایک دوست لکھنؤ کے مولوی عبداللہ کو ایک خط میں لکھا تھا کہ ''اب ہمیں انگریزوں کا ساتھ دینا چاہیے''(۱۲۶)۔ لیکن مولانا آزاد نہیں چاہتے تھے کہ خلافت تحریک کے ہتھیار کو ہاتھ سے جانے دیا جائے۔ اس لیے جب کمال پاشا نے ترکی میں خود ہی خلافت ختم کر دی تھی تو مولانا آزاد نے اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''یہ تو خلیفہ کو خاندانی روایت کے مطابق متعین کرنے کے بجائے صدر مملکت کو خلیفہ بنانے کا فیصلہ ہے''۔ اس وقت یہ خلافت تحریک کو عربوں کے نجات کی تحریک کے طور پر اٹھانا

چاہتے تھے۔ اسی لیے ان کا خیال تھا کہ جب تک جزیرۃ العرب آزاد نہیں ہو جاتا تب تک خلافت تحریک جاری رہے گی (١٢٧)۔ وہ اسے جاری رکھنا چاہتے تھے کیوں کہ ان کے لیے خلافت تحریک پوری طرح مذہبی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ ملکی آزادی کی تحریک تھی جو مسلمانوں کو حکمرانوں کے خلاف لڑنے کے لیے راغب کر سکتی تھی نیز اپنے دیش واسیوں کے ساتھ جوڑ سکتی تھی (١٢٨)۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو آزادی حاصل کرنے کے لیے متحرک کرتے رہتے تھے۔ جنوری ١٩٢٢ء میں ایک تقریر کرتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ ''سرکار ہمیشہ وہی کرے گی جو ہمیشہ استبداد نے آزادی کے مقابلے میں کیا ہے۔ آگے انھوں نے کہا کہ اسلام کی تعلیم اس کی کتاب میں موجود ہے، وہ کسی بھی حال میں یہ جائز نہیں رکھتی کہ مسلمان آزادی کھو کر زندگی بسر کریں، مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیے'' (١٢٩)۔ وہ مسلمانوں کو مذہب اور خلافت کے نام پر بار بار یہ سمجھاتے تھے کہ انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے لیے جاری عدم تعاون تحریک میں شامل ہونا چاہیے۔ یہی سمجھانے کے لیے انھوں نے اسلام کے حالات کے مطابق تشریح ان الفاظ میں کی تھی ''اسلام آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے، نوع انسانی کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا تھا (١٣٠)۔ آزادی کی راہ میں قربانی اور جاں فروشی ان کا قدیم اسلامی درس ہے''۔ جہاں کہیں مذہب سیاست میں رُکاوٹ بنتا تھا وہاں وہ خود راستہ نکال لیتے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ''اسلام میں دین اور دنیا کی تفریق کا کوئی سوال نہیں۔ وہ دین کو دنیا سے الگ نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ دین دنیا ہی کے حسن عمل کا نام ہے'' (١٣١)۔ مولانا کی خلافت سے متعلق سرگرمیوں کی وجہ کر ہی انھیں ١٢-١٣/ جنوری ١٩٢٢ء کو بمبئی میں منعقد مرکزی خلافت کمیٹی کی بیٹھک میں خلافت کمیٹی کا نائب صدر منتخب کیا گیا تھا۔ جب کہ حکیم اجمل خاں دوسرے نائب صدر چنے گئے تھے (١٣٢)۔

سیاسی قیدی

قومی تحریک کے اس دور میں مولانا کی تقریروں کا بڑا زبردست اثر پڑا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے لفظوں میں ''انھوں نے اپنی تقریروں سے ملک میں بیداری کی ایک ایسی لہر دوڑائی کہ ہر چہار جانب سے آزادی کا طوفان امنڈ آیا ہو (١٣٣)۔ سرکار اسے برداشت نہ

کر پائی اور جولائی ١٩٢١ء میں کلکتہ میں کی گئی دو تقریروں کی بنیاد پر حکومت کا باغی ہونے کا الزام لگا کر مولانا آزاد کو گرفتار کر لیا گیا۔ وہ جیل کے اندر بھی عدم تعاون اور سوراج کے لیے لگاتار عمل پیرا رہے۔ حکومت کی مخالفت کرنے کو وہ ایک پاکیزہ عمل تصور کرتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی گرفتاری کے وقت پولس کے اسپیشل برانچ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر گولڈی سے کوئی بھی سوال اپنے گرفتار کیے جانے سے متعلق نہیں کیا جب کہ ان کے پاس مولانا کو گرفتار کرنے کے لیے کوئی وارنٹ بھی نہیں تھا (١٣٤)۔ اپنی گرفتاری کے وقت مولانا آزاد نے عوام کے نام ایک پیغام دیا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ''سرکار اب حریف کی طرح مقابلہ نہیں کرے گی بلکہ غیظ و غضب میں بھرے ہوئے آدمی کی طرح جو کچھ کر سکتی ہے، کر گزرے گی ... ہم اس کے اس آخری اعلان جنگ کا پوری آمادگی و قبولیت کے ساتھ استقبال کرتے ہیں اور ہمارا اعلان ہے کہ ہم آخر تک میدان جنگ کو پیٹھ نہیں دکھائیں گے''۔ انھوں نے عدالت کی تکلیفوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کہا کہ ''اگر آج آزمائش کی گھڑی آگئی ہے اور وہ منزل سامنے ہے جس کے لیے ہم اس قدر دعوے کر چکے ہیں تو کیا ہم عین وقت پر اپنے تمام دعوے بھلا دیں گے اور تمام اعلان واپس لے لیں گے ... ہر اس شخص کے لیے جو اسلام اور ملک کی محبت کا دعویدار ہے، راہ عمل کھل گئی ہے کہ فوراً اٹھے اور سب کام چھوڑ کر قومی والنٹیر ز میں اپنا نام لکھا دے۔ اب سب سے بڑا کام یہی ہے کہ والنٹیر بن کر پورے صبر اور استقامت کے ساتھ اپنی ڈیوٹی پر کام کر کے جیل چلا جائے۔ کوئی خدمت بھی اس خدمت کو نہیں پہنچتی اور تحریک کی سب سے بڑی بڑائی اسی میں آگئی ہے ... کامیابیوں کی جڑ، عمل کی راہ اور خدا کی رحمت کا وسیلہ اگر ہے تو صرف یہی ہے اور اس کے سوائے کچھ نہیں'' (١٣٥)۔ مولانا آزاد کے ساتھ مسٹر چترنجن داس، ایس. این. ساسمل وغیرہ لیڈران بھی گرفتار کر لیے گئے تھے۔ گرفتاری کے دو دن بعد ١٢/ دسمبر ١٩٢١ء کو مولانا آزاد کو چوتھے درجے کے جج کے سامنے پیش کیا گیا۔ عدالت نے ٢٣/ دسمبر تک انھیں ریمانڈ پر رکھنے کے احکام صادر کیے۔ ان کی گرفتاری کی مخالفت میں کانگریس اور خلافت کمیٹی کی ہدایت پر ڈھاکہ میں ایک زبردست ہڑتال ہوئی اور بدیسی کپڑوں کی ہولی جلائی گئی (١٣٦)۔ مولانا کا جرم ثابت کرنے کے لیے ٩/ فروری ١٩٢٢ء تک مقدمہ چلا۔ مقدمے کے دوران انھوں نے اپنے کاموں کو نہایت بیباکی کے ساتھ قبول کیا اور سرکاری

عدالتوں میں اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کی صفائی دینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ''جب کبھی حکمراں طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلے میں ہتھیار اٹھائے ہیں تو عدالتوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہے ... جابر اور مستبد حکومت کے لیے اس سے بڑھ کر انتقام و ناانصافی کا کوئی آلہ بھی نہیں'' (۱۳۷)۔ ۲۹ر فروری ۱۹۲۲ء کو مقدمے کی آخری پیشی میں چیف پریسڈنسی مجسٹریٹ مسٹر ڈی سوین ہونے حکومت سے عدم تعاون کرنے کے لیے عوام کو ترغیب دینے کے جرم میں مولانا آزاد کو تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۳۴ اے کے تحت ایک سال قید با مشقت کی سزا سنائی (۱۳۸)۔ مولانا آزاد سزا سے ڈرنے والے انسان نہیں تھے۔ انھوں نے خوف کی جگہ بے خوفی سے اس سزا کو اپنی امید سے کم بتاتے ہوئے بخوشی قبول کیا (۱۳۹)۔ مولانا کی شریک حیات زلیخا بیگم نے بھی گاندھی جی کو ایک تار دے کر اس سزا کو امید سے کم بتاتے ہوئے خود مولانا کی جگہ پر قومی کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ مولانا آزاد نے اس وقت اپنی بیوی کے توسط سے ہی گاندھی جی کو ایک پیغام بھجوایا تھا، جس میں انھوں نے کہا تھا کہ اگر کبھی سمجھوتے کا موقع آئے تو آپ ہم لوگوں کی رہائی کو اتنی اہمیت مت دیجیے گا جتنی کہ بدقسمتی کے ساتھ آج دی جا رہی ہے۔ سمجھوتے کی شرط طے کرتے وقت صرف ہماری اعلیٰ قومی خواہشات پر ہی نظر رکھیے گا۔ ہماری رہائی کے سوال کو اس سے الگ رکھیے گا (۱۴۰)۔

گرفتار ہونے کے وقت بھی مولانا آزاد خلافت اور عدم تعاون کے قیدیوں کی رہائی کے لیے فکرمند تھے۔ انگلینڈ کی سرکار کے ساتھ اسی شرط پر وہ کوئی سمجھوتہ کر سکتے تھے کہ وہ قیدیوں کو رہا کر دے۔ اس کے لیے انھوں نے ایک مطالبہ نامہ تیار کیا تھا:

(۱) شہنشاہ کی حکومت خلافت کی یہ مانگ پوری کرے یا کم سے کم ایسی گارنٹی دے کہ:

(الف) میسوپوٹامیا میں انگریزوں کو مینڈیٹ سے حاصل شدہ حقوق کلی طور پر ختم کیا جائے اور میسوپوٹامیا کو پوری طرح وہاں کے لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

(ب) فلسطین کو بھی وہاں کے رہنے والے عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کے لیے چھوڑ دیا جائے، جو اپنے آپ ترکی کے ساتھ آزادی کی شرطیں طے کریں گے۔

(ج) عثمانی (ترکی) حکومت اور اس کے دارالخلافہ قسطنطنیہ پر سے سارے اختیارات ہٹا لیے جائیں۔

(د) سارے تھریس (سائپرس)، سمرنا اور ایشیائے کوچک جسے ترکی نے تلوار کے زور پر واپس لیا ہے اور جس کے لیے ابھی بھی لڑ رہے ہیں وہاں ترکی کی حکومت کو تسلیم کیا جانا چاہیے۔

(۲) خلافت اور سوراج کے ساری قیدی رہا کیے جائیں۔

(۳) پچھلے دو برسوں میں جاری کیے گئے استیصال کن قوانین ختم کیے جائیں۔

(۴) سوراج پر غور وخوض کے لیے ایک اجلاس بلایا جائے (۱۴۱)۔

سوراج آندولن کا التوا

مولانا کو سزا دیے جانے کے بعد ہی کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ مہاتما گاندھی نے عدم تعاون کی تحریک کو ملتوی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۷ر نومبر ۱۹۲۱ء کو باردولی میں اور ۱۳ر جنوری ۱۹۲۲ء کو مدراس میں مظاہروں کے دوران تشدد کی کچھ واردات ہو چکی تھی۔ گاندھی جی اس سے پہلے ہی رنجیدہ تھے۔ ۱۱، ۱۲ر فروری ۱۹۲۲ء کو اتر پردیش کے گورکھ پور ضلع میں چوری چورا نامی مقام پر تشدد کی واردات واقع ہونے سے کانگریس مجلس منتظمہ کی ہنگامی میٹنگ میں تحریک عدم تعاون کو ملتوی کرنے کا فیصلہ لے لیا گیا (۱۴۲)۔ مولانا آزاد اس طرح سے یکایک تحریک کو ملتوی کرنے کے حق میں نہیں تھے جیسا کہ انھوں نے بعد میں عبدالرزاق ملیح آبادی کو ایک خط میں لکھا تھا کہ ''میرا یقین ہے کہ اگر باردولی فیصلے کی یادگار غلطی نہ ہوئی ہوتی تو ہمارا پہلا تجربہ (مطلب تحریک سے ہے) بھی بہترین فوری نتائج حاصل کر سکتا تھا'' (۱۴۳)۔

کانگریس کی پھوٹ اور مولانا کا نقطۂ نظر

۱۹۲۳ء کے اوائل میں نہایت ہی شدید طور پر بے چینی پیدا ہو گئی تھی جس کا نتیجہ کانگریس کی پھوٹ کی شکل میں سامنے آیا۔ دیش بندھو چترنجن داس نے یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو گیا کے کانگریس اجلاس میں کانگریس سے استعفیٰ دے دیا (۱۴۴)۔ کانگریس سے الگ ہو کر انھوں نے سوراج دل قائم کیا۔ خود اس کے صدر ہوئے اور سبھاش چندر بوس کو اس کا

سکریٹری مقرر کر کے کام شروع کر دیا۔ مولانا آزاد کو اس کا بے حد ملال ہوا۔ وہ ان حالات سے بڑے متفکر تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ اختلاف دور ہو جائے یا ایسی شکل اختیار کر لے کہ کانگریس کی مجموعی طاقت باہمی جنگ و جدل میں ضائع نہ جائے (۱۴۵)۔ قید کی سزا کاٹ کر جنوری کے پہلے ہفتے میں جیل سے باہر آتے ہی انھوں نے پنڈت موتی لال نہرو سے اس بات کی درخواست کی کہ وہ سوراج دل کی ۲۰ر جنوری ۱۹۲۳ء کو بمبئی میں ہونے والی میٹنگ ۲۷ر جنوری کو کریں تا کہ ۲۸ر جنوری کو کانگریس کی مجلس منتظمہ کی میٹنگ وہاں ہونے پر مجھے (مولانا کو) دونوں پارٹیوں کے لوگوں سے بات کرنے کا موقع مل جائے (۱۴۶)۔ ان کی درخواست کے مطابق ایسا ہی ہونے پر آزاد بمبئی میں دونوں فریقوں سے ملے اور ان کے سامنے درج ذیل تجاویز پیش کیں:

(۱) دونوں فریق آئندہ تین ماہ میں گیا کانگریس کے پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے دل کھول کر کوشش کریں۔

(۲) اس درمیان کاؤنسلوں کے بائیکاٹ یا نئی پارٹی بنانے کا پرچار یا اس کی بات چیت نہ کی جائے۔

(۳) اگر تین ماہ کے بعد کانگریس نے سول قانون توڑنا منظور کر لیا تو دونوں پارٹی اس مقصد کی تکمیل کے لیے ایک ہو کر کوشش کریں۔

(۴) سول قانون توڑنے کی ابتدا کی گئی تو جون میں ملکی حالات پر غور وفکر کرنے کے لیے کانگریس کا ایک خاص اجلاس منعقد کیا جائے۔

(۵) خصوصی اجلاس کے ایک مہینہ پہلے دونوں پارٹیوں کو حق ہوگا کہ وہ ملک میں اپنے نظریات کی تشہیر کریں۔

(۶) لیکن کانگریس کے خصوصی اجلاس میں جو کچھ طے ہو اسے دونوں فریق منظور کریں (۱۴۷)۔

سوراج دل کے ممبران نے ان تجاویز کو نامنظور کر دیا۔ لہٰذا مولانا نے الٰہ آباد میں پنڈت موتی لال نہرو اور حکیم اجمل خاں سے گفتگو کی اور کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ دیش بندھو چترنجن داس کے سامنے وہ تجاویز دوبارہ پیش کی گئیں۔ مولانا آزاد، پنڈت موتی لال نہرو اور چترنجن داس نے ان پر کلکتہ میں صلاح ومشورہ کیا جس میں یہ طے پایا کہ:

(۱) ۳۰ر اپریل تک دونوں فریق کاؤنسل میں داخلے کی حمایت یا مخالفت میں کوئی آندولن نہیں کریں گے۔

(۲) اس دوران اکثریتی جماعت پچیس لاکھ روپے اور پچاس ہزار رضاکار جمع کرنے کی اَنتھک کوشش کرے گی۔

(۳) چترنجن داس کی پارٹی روپیہ جمع کر کے کارکنان کو مہیا کرانے نیز تعمیری کاموں کو پورا کرنے میں اکثریتی جماعت کا ساتھ دے گی۔

(۴) اگر دو ماہ میں آندولن کرنے کے لیے ملک میں پوری تیاری ہوگئی تو شریفانہ نافرمانی کا دور دورہ شروع ہوگا۔ اگر ملک تیار نہ ہوا تو دیش بندھو کی پارٹی اپنی مرضی کے مطابق کام کرنا شروع کر دے گی (۱۴۸)۔

۲۷ر فروری ۱۹۲۳ء کو الٰہ آباد کی کل ہند کانگریس کمیٹی کی بیٹھک میں سوراج دل اور کانگریس کے سمجھوتے کو منظوری دے دی گئی (۱۴۹)۔ اس طرح مولانا آزاد کی کوششوں سے کانگریس کی پھوٹ کو اتحاد میں بدل دیا گیا اور بکھرتی ہوئی کانگریس منظم ہوگئی۔

صدر کانگریس

کانگریس کی پھوٹ کو دور کرنے کے لیے مولانا آزاد کسی بھی فریق سے غیر متعلق رہ کر کام کرنا چاہتے تھے۔ کسی بھی فریق سے تعلق رکھ کر کام کرنا انھیں غیر مناسب محسوس ہوتا تھا۔ لہٰذا پختہ ارادے کے ساتھ غیر جانبدارانہ طور پر کام کرنے کے مقصد سے انھوں نے فروری ۱۹۲۳ء کے پہلے ہفتے میں کانگریس کی مجلس منتظمہ کی رُکنیت سے استعفیٰ دے دیا تھا (۱۵۰)۔ جیل سے باہر آنے کے بعد ایک بیان کے ذریعہ اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے کہا تھا کہ کوئی بھی سیاسی پروگرام ایک مذاق جیسا ہی ہوگا۔ پہلے اسے اس کے حقائق کی بنیاد پر جانچ لینا چاہیے۔ گاندھی جی نے حالات کو خالصتاً فہم و ادراک کی عملی بنیاد پر پرکھا ہے۔ انھوں نے ملک کو ستیاگرہ کا اصول دیا ہے۔ یہ انھیں بہت پیارا ہے لیکن دنیا میں بسنے والے انسانوں کی مانند انھوں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ نہ تو اس وقت عدم تعاون کے آدرش اور نہ عدم تشدد سے ہی کام چل سکتا ہے جب تک دونوں ایک دوسرے کی نکتہ چینی اور ایک دوسرے کی کوششوں کو بیکار کرتے رہیں گے (۱۵۱)۔ سوراج پارٹی والے کاؤنسلوں

میں داخل ہونے کی مانگ کر رہے تھے جب کہ کانگریس میں اس سلسلے میں عام اتفاق نہیں تھا۔ آزادی کے لیے پروگرام بنانے اور سوراج پارٹی کے کاؤنسل میں داخلے کے سوال پر غور کرنے کے لیے کانگریس کی مجلس منتظمہ نے ۴؍اگست ۱۹۲۳ء کو ویزاگاپٹم میں یہ فیصلہ کیا کہ ماہ ستمبر میں دہلی میں کانگریس کا خصوصی اجلاس ہوگا (۱۵۲)۔ مولانا آزاد کے انتخاب کے وقت زیادہ تر لوگوں نے ان پر انگریزی نہ جاننے کا الزام لگا کر ان کے صدر منتخب کیے جانے کی مخالفت کی تھی۔ وہ لوگ یہ کہتے تھے کہ مسلمان ہونے کی وجہ کر ہی انھیں کانگریس کا صدر بنایا گیا ہے (۱۵۳)۔

ستمبر ۱۹۲۳ء میں دہلی میں ہونے والے کانگریس کے خصوصی اجلاس کا قابل غور مدعا یہ تھا کہ کانگریس کو عدم تعاون کی پالیسی چھوڑ کر کاؤنسلوں کا چناؤ لڑنا چاہیے یا حکومت سے عدم تعاون کرتے ہوئے قانون ساز کاؤنسلوں کا بائیکاٹ کرتے رہنا چاہیے۔ مسٹر چترنجن داس اور موتی لال نہرو، جنھوں نے اسی مقصد سے گیا اجلاس کے بعد سوراج پارٹی کی تشکیل کی تھی، وہ بائیکاٹ کی جگہ پر کاؤنسلوں میں جانے کی حمایت کرتے تھے۔ خود مولانا آزاد کو سوراج والوں کی کوششوں پر اعتماد تھا۔ کانگریس کے ساتھ سوراج والوں کے سمجھوتے کے وقت انھوں نے مسٹر چترنجن داس کی بات اوپر رکھنے کے لیے ہی سوراج پارٹی کی، اپنی پارٹی کی تنظیم کے ساتھ بڑھنے، اپنا پروگرام نیز تنظیم بنانے کے حقوق پر زور دیا تھا (۱۵۴)۔ اسی لیے دلّی کے اس اجلاس (ستمبر ۱۹۲۳ء) کا انعقاد کرنے اور آزاد کو صدر کا عہدہ دلانے میں سوراج والوں نے جی توڑ کوششیں کی تھیں۔ اس اجلاس میں مولانا آزاد نے کاؤنسل میں داخلے کی حمایت کی تھی جب کہ ہندوستان میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو ان کاؤنسلوں میں جانے کے خلاف تھے (۱۵۶)۔ اجلاس میں کرسیِ صدارت سے تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ''موجودہ حالت میں ہمارے لیے باہر رہ کر بائیکاٹ کرنا کچھ بہتر نہیں ہوسکتا، جس طرح کہ گزشتہ انتخاب کے موقع پر ہمارے لیے بائیکاٹ ضروری تھا اسی طرح آج ہمارے لیے یہ مفید ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہم نشستوں پر قبضہ کرسکیں کہ یہ مقامات بھی ہماری جدوجہد کا ایک گوشہ بن جائیں''۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ عوام میں بھی لگاتار عدم تعاون سے متعلق بیداری پیدا کی جائے۔ اس لیے انھوں نے کہا کہ ''میری ناچیز رائے میں ہمارا آئندہ طرز عمل یہ ہونا چاہیے کہ ایک طرف ہماری ایک جماعت کاؤنسلوں میں

چلی جائے۔ دوسری طرف کاؤنسلوں سے باہر بھی سرگرمیاں جاری رہیں'' (۱۵۷)۔

اس اجلاس میں یہ تجویز پاس کی گئی کہ — جن کانگریسیوں کو کاؤنسل میں داخلے کے خلاف مذہبی یا دیگر کوئی اعتراض نہ ہو انھیں اگلے چناؤ میں کھڑے ہونے اور اپنے حقوق رائے دہندگی کو استعمال کرنے کی آزادی ہے۔ اس لیے کاؤنسل میں داخلے کے خلاف سارا پرچار بند کیا جاتا ہے (۱۵۸)۔ مولانا آزاد جانتے تھے کہ کاؤنسلوں میں جانے کا کانگریس کا فیصلہ برٹش حکومت کو پریشانی میں ڈال دے گا اور سرکار کو یہ سوچنا پڑے گا کہ ہندوستانیوں کو کس طرح مطمئن کیا جائے۔ مولانا کا ایسا سوچنا غلط نہیں تھا۔ کانگریس کے اس فیصلے کے بعد برٹش وزیر اعظم لائڈ جارج نے ہندوستان کے آئندہ انتخابات میں اسمبلی میں عدم تعاون کرنے والوں کو چنے جانے کے شبہات ظاہر کرتے ہوئے برٹش پارلیامنٹ میں کہا تھا کہ ان میں ایسے لوگ پہنچ جاتے ہیں جو ان اسمبلی نما آلات کے ذریعہ دی گئی طاقت کو ایسے کاموں میں لگاتے ہیں جو برٹش حکومت کے لیے غیر مفید ہو یا اس سارے طریق کار کو ہی برباد کرنے والا ہو جس کے ذریعہ اب تک ہندوستانی حکومت چل رہی تھی۔ ہمارے لیے یہ کہنا مناسب ہے کہ اگر اسمبلیوں کو مذکورہ بالا طریقوں سے بدلنے کی کوشش کی گئی اور متذکرہ بالا مقاصد سے ہندوستانیوں نے نمائندے چنے تو ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ سامنے آجائے گا اور اس پر دھیان دینا ضروری ہوگا (۱۵۹)۔ مولانا آزاد نے کاؤنسلوں کے باہر کانگریس کا پروگرام متعین کرتے ہوئے تین کام کرنے پر زور دیا تھا —

(۱) ہندو مسلم اتحاد کے لیے نئے سرے سے تحریک
(۲) مزدوروں کی پارٹی کی تشکیل
(۳) بیانات اور مضامین کے ذریعہ عوام میں سیاسی پروپیگنڈہ (۱۶۰)۔

مولانا آزاد نے اپنی صلاحیت اور سوجھ بوجھ سے اجلاس میں سوراج پارٹی اور کانگریس مخالف ووٹوں کی اس طرح آمیزش کی کہ ایک نیا درمیانی راستہ خود بخود تیار ہوتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ انھوں نے اپنی دور بینی سے کانگریس کو ٹوٹنے کے کگار سے پیچھے ہٹا لیا اور تحریک عدم تعاون کے ملتوی ہونے سے ملک میں جو ایک سیاسی غیر یقینی و غیر استحکام کی صورت حال پیدا ہوگئی تھی اس کی بنیاد پر گہری ضرب لگا کر ملک کے عوام میں مستقبل کے تئیں نئی اُمید جگاتے ہوئے، عمل میں یقین اور حصول مقاصد کے لیے نئے اعتقاد کا راستہ دکھایا۔

خلاصہ

مذکورہ بالا تفصیل سے ہمارے سامنے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ۱۹۲۱ء کے اوائل میں ہی ایک کٹر وطن پرست کی شکل میں مولانا آزاد نے قومی منچ پر قدم رکھا تھا۔ کانگریس میں شامل ہونے کے ساتھ ہی انھوں نے گاندھی جی سے اپنی پہلی ملاقات کے بعد ان کی حمایت اور ان کے حصول مقاصد کے لیے پوری مستعدی کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ گاندھی جی کے ذریعہ تحریک عدم تعاون کے آغاز سے قبل ہی مولانا نے حکومت کے خلاف صدائے بغاوت بلند کرنا شروع کر دیا تھا۔ ترکی کے خلاف انگریزوں کے رویے سے رنجیدہ ہو کر ان کے اندر بھی باغیانہ روش پیدا ہو چکی تھی۔ اس وجہ کر انھوں نے گاندھی جی سے پہلے ہی عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی تھی۔ ''الہلال'' کے ذریعہ سے وہ خلافت کی حمایت اور انگریزوں کے ساتھ عدم تعاون کا پرچار کر رہے تھے۔ گاندھی جی کے ہندوستانی سیاست میں داخل ہونے سے مولانا کو ایک باہمت شریک کار رہنما حاصل ہو گیا تھا اور مولانا کی شکل میں گاندھی جی کو ایک اہل، بے خوف و بے باک اور مضبوط معاون کی حصولیابی ہوئی تھی۔ مولانا کے زوردار تشہیری عمل، ڈاکٹر مشتاق احمد انصاری، حکیم اجمل خاں وغیرہ جیسے لیڈران کے تعاون اور سوجھ بوجھ سے عدم تعاون کی تحریک بھی مسلمانوں کے سامنے ایک مذہبی فریضے کی صورت میں آئی، نیز عدم تعاون اور خلافت تحریک ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہر طبقے میں پھیل گئی۔ مولانا اور گاندھی جی کی مشترکہ کوششوں سے پیدا شدہ ہندو مسلم ایکتا اتنی متاثر کن تھی کہ ہندوستان سے باہر مسلم ملکوں میں بھی اس کے اثرات محسوس کیے گئے تھے (۱۶۱)۔

ترکی کے خلیفہ کے ساتھ برٹش حکومت نے جو بدسلوکی کی تھی اسے مولانا آزاد نے مسلمانوں کو مشتعل کرنے کا ذریعہ مان کر شامل کیا تھا۔ مولانا کے وطن پرستانہ جذبات و نظریات کی شدت و وضاحت نیز ان کی دانائی و سادگی نے گاندھی جی کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ گاندھی جی علی برادران کی بہ نسبت مولانا آزاد سے زیادہ قربت محسوس کرتے تھے (۱۶۲)۔ عدم تعاون کی تحریک کو ہندوستانی عوام سے منظور کرانے اور اسے کامیابی کے ساتھ نافذ کرنے کے مرحلے تک پہنچانے میں آزاد کی خدمات گاندھی جی سے کم نہیں تھیں۔ سارے ہندوستان کی عوام کے ہر طبقے کو سرکار کے خلاف منظم کرنے کے لیے انھوں نے مذہب و سیاست دونوں کو ملا کر اپنی بات کہنی شروع کی تھی۔ مذہب کے توسط سے انھوں نے فوجیوں کو بھی حکومت کے خلاف بھڑکانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اسی مقصد سے انھوں نے ٹھیک اسی طرح ایک مذہبی فتویٰ جاری کیا تھا جیسا کہ ۱۸۰۳ء میں شاہ عبدالعزیز نے انگریزوں کے خلاف فوج میں جہاد چھیڑنے کے لیے جاری کیا تھا۔

مولانا آزاد نے مسلمانوں کو ہندوستانی قومیت کے ساتھ جوڑنے کے لیے اپنی ساری قوت لگا دی تھی۔ مسلم دانشوروں کو انگریزوں کے خلاف منظم کرنے کے لیے ہی انھوں نے جمعیت العلماء کی تشکیل کی تھی (۱۶۳)۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ طاقت سے تحریک عدم تعاون اتنا مضبوط و مستحکم ہو کر سامنے آیا تھا کہ انگلینڈ میں بھی ہندوستان کی حمایت میں ماحول تیار ہونے لگا تھا (۱۶۴)۔ مولانا کی نظر میں قوم کی آزادی سب سے بڑھ کر تھی۔ اس معاملے میں وہ مہاتما گاندھی سے بھی ایک قدم آگے تھے۔ ۱۹۲۱ء کی احمد آباد کانفرنس میں مولانا حسرت موہانی نے کہا تھا کہ کانگریس کے سوراج کے مفہوم کی تشریح کے لیے مکمل آزادی یعنی غیر ملکیوں کی محکومیت سے مکمل آزادی جیسے الفاظ کا استعمال کیا جائے، تو گاندھی جی نے ان کی مخالفت کی تھی (۱۶۵)۔ لیکن مولانا آزاد اس کے بہت قبل سے ہی کھلے طور پر مکمل آزادی کی بات کر رہے تھے۔ ان کی شخصیت، فکر و عمل نیز غیر جانبدارانہ رویے کو دیکھ کر ہی سب لوگ ان پر اعتماد کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے خصوصی اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری مولانا آزاد کو ہی سونپی گئی، جہاں انھوں نے پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو چترنجن داس جیسے بڑے لیڈروں کے ساتھ کام کرتے ہوئے کانگریس کے آپسی اختلافات کو نہایت دانشمندی کے ساتھ سلجھا کر ملکی مفاد کے تئیں اپنی محبت اور سمجھ داری کا ثبوت پیش کیا وہیں اپنے قوم پرستانہ نظریات کی وجہ کر ہی خلافت تحریک کے خاتمے کے باوجود بھی وہ کانگریس میں بنے رہے۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے خلافت کمیٹی کو بھی ملکی مفاد کے پیش نظر کانگریس کے ساتھ جڑ جانے کی صلاح دی تھی (۱۶۶)۔ اس طرح ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۳ء تک مولانا جذبہ حب الوطنی سے سرشار اور قوم پرستانہ نظریات کے حامل کی شکل میں ہمارے سامنے نمودار ہوتے ہیں۔ اس دوران سارے ملک کو متاثر کرنے والی سیاست مولانا آزاد سے متاثر ہوتی ہے۔ اس زمانے کے واقعات و تحریکات پر وہ اپنے افکار و عمل کے اَنمٹ نقوش چھوڑتے ہیں، جن کے دور رَس نتائج سے مستقبل میں رونما ہونے والی ملکی سیاست کے خدوخال متعین ہوئے۔

---

(۵)

ہندو۔مسلم مسائل

(۱۹۲۳ء تا ۱۹۳۰ء)

ہندوستانی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے ان میں مذہب کا نام سب سے پہلے لیا جا سکتا ہے۔ مذہبی بنیادوں پر کھڑے ہونے والے مفکر ہندوستانی سیاست کو مبینہ طور پر متاثر کرنے والے ثابت ہوئے۔ گوتم بدھ اور شہنشاہ اشوک اس کے اوّلین ثبوت ہیں۔ عہد وسطیٰ کی تاریخ بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ اس کے بعد کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے پیچھے مذہب بھی ایک وجہ تھا۔ اسی طرح مذہبی بنیاد پر بننے والی تنظیموں نے بھی ملک کو متاثر کیا ہے۔ ۱۹۰۶ء کے آخر میں لیگ کی تشکیل سے ہندوستانی سماج کو ایک نئی تبدیلی کی جہت کا حصول ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں فرقہ وارانہ تنازعات کا ایک نیا دور بھی شروع ہوا تھا۔ انگریزوں کو ہندستان میں اپنا اقتدار قائم و دائم رکھنے کے لیے ملک میں فرقہ وارانہ تنازعات کو بڑھاوا دینا ضروری تھا کیوں کہ انگریزی حکومت کی بنیاد کے کمزور ہو جانے کا خطرہ دنوں دن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

مولانا آزاد نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے ابتدائی دور سے ہی اس بات کو سمجھ لیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کا قائم رہنا ملک کے لیے نہایت ضروری ہے۔ وہ انسانوں کے درمیان بھید بھاؤ نہیں مانتے تھے۔ ان کی نظر میں دنیا کے سبھی انسان بنیادی طور پر ایک تھے(۱)۔ ان کا خیال تھا کہ دنیا کے سبھی مذہبی مبلغوں کا مقصد الگ الگ حصوں میں بٹے ہوئے لوگوں کو ایک کرنا تھا۔ ان کے مطابق ہر پیغمبر کا یہی پیغام تھا کہ تمام بنی نوع انسان ایک برادری ہیں اور سبھوں کا ایک ہی خدا ہے۔ لہٰذا سبھی ایک خاندان کی طرح رہیں اور مل کر اس کی عبادت کریں(۲)۔ اسی لیے مولانا آزاد کی نظر میں ہندو مسلم اتحاد کی بڑی اہمیت

تھی۔ ''الہلال'' کے توسط سے وہ اس اتحاد کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ ''الہلال'' کا ایک اہم مقصد تھا۔ ''الہلال'' میں انھوں نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''تم کو ہندوستان میں رہنا ہے تو اپنے ہمسایوں سے پیار کرو'' (۳)۔ انھوں نے آریہ سماج کے ذریعہ چلائے گئے ''شدھی آندولن'' کو بھی قبول کر لیا تھا۔ جب ۱۹۱۲ء میں سیالکوٹ میں آریہ سماج والوں نے ہندو اسماعیلیوں کی شدھی کر کے آریہ سماجی بنانا شروع کیا تو انھوں نے لکھا تھا کہ ''ہم اپنے ہندو اور آریہ معاصرین کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر وہ اس تحریک کو مفید سمجھتے ہیں تو شوق سے جاری رکھیں۔ اگر تمام اسماعیلی ہندو مذہب اختیار کر لیں تو بھی ہمارا کوئی نقصان نہیں'' (۴)۔ وہ ہر صحیح بات کو قبول اور غلط بات کو نامنظور کرتے تھے۔ خواہ اس کا انجام کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ اپنی اسی وسیع النظری کے سبب انھوں نے ۱۹۱۳ء میں اجودھیا میں گئوکشی کو لے کر ہوئے ہندو مسلم فساد کے دوران مسلمانوں کو اس معاملے میں پھٹکارا تھا(۵)۔ ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت کو انھوں نے ۱۴ر جون ۱۹۲۱ء کے ''زمیندار'' میں ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا کہ ''ملک کی مشکلات کے ازالے میں اگر ہندو مسلم مسئلہ معاون نہ ہوتا تو میں پچھلے آٹھ برسوں سے اس کا اور ملک کی آزادی کو سب کا یکساں نصب العین بنانے کی تشہیر نہیں کرتا''۔ ۲۵ر اگست ۱۹۲۱ء کو انھوں نے آگرہ کے خلافت اجلاس میں مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ ''پیغمبر حضرت محمدؐ نے مدینہ والوں اور بت پرستوں کے ساتھ جو کیا تھا، وہی کریں۔ وہ ہندوؤں کے ساتھ محبت کا پیمان باندھیں اور ایک نیشن ہو جائیں'' (۷)۔ تحریک عدم تعاون کے دوران انھوں نے انگریزوں کے خلاف ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپنا آندولن تیز کر دیا۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں خلافت کے عہدۂ صدارت سے بولتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ''ہندوستان کے لیے ہندوستان کی آزادی اور اعلیٰ فرض ادا کرنے کے لیے ہندوستان کے ہندو، مسلمانوں کا اتفاق اور ان کی یکجہتی ضروری ہے ... اگر ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین شرعی اور اسلامی فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو بحیثیت ہندوستانی ہونے کے انھیں انجام دینا چاہیے۔ بحیثیت ہندوستانی ہونے کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ایک ہو جائیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے بہتر فرائض انجام نہیں دے سکتے جب تک وہ احکام اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کریں'' (۸)۔

مولانا آزاد جیسے لوگ ملک میں ہندو مسلم اتحاد کا ماحول بنانے میں کوشاں تھے لیکن انگریز سرکار ملک کے ماحول کو بگاڑ کر یہاں فرقہ وارانہ فسادات کا منظر پیش کرنے میں معاونت کر رہی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں مالابار کی موپلا بغاوت اس بات کا ثبوت ہے۔ اس میں موپلوں نے سرکار کے خلاف بغاوت کی تھی (۹)۔ بعد میں اسے فرقہ وارانہ رنگ دے دیا گیا۔ مولانا آزاد نے ۱۹؍نومبر ۱۹۲۱ء کو جمیعت العلماء ہند کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے موپلوں کے ذریعہ زبردستی تبدیلیِ مذہب کیے جانے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اسلام بزور زبردستی تبدیلیِ مذہب کی اجازت نہیں دیتا۔ ایسا کرنا شریعت کی توہین ہے۔ اس عمل کے وہ ذمہ دار ہیں، ہم شریک نہیں ہیں'' (۱۰)۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے مالابار کے فساد میں ستائے گئے ہندوؤں کی مدد کے لیے خلافت کمیٹی کی بیٹھک میں دس ہزار روپے کا انتظام کرایا تھا (۱۱)۔ وہ چاہتے تھے کہ فساد متاثرہ علاقوں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مدد کے لیے کچھ دنوں تک امداد رسانی کا کام جاری رکھا جائے، لہٰذا انھوں نے یہ تجویز رکھی تھی کہ مسلمان دو سال تک دس روپیہ ماہانہ کے حساب سے بغرض تعاون چندہ جمع کریں (۱۲)۔ اس وقت آریہ سماج کا ''شدھی آندولن'' اور مسلمانوں کا تبلیغی پروگرام زور پکڑ رہا تھا۔ ایسے حالات میں دلّی میں ایک اتحادی تنظیم بنائی گئی تھی، جس کے عہدۂ صدارت سے بولتے ہوئے مولانا آزاد نے قرآن سے مثال دے کر دونوں فرقوں کے آپسی اتحاد کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا تھا کہ قرآن کی آیت (سورہ ۲۱، آیت ۹۲) کا مطلب ہے کہ تم سب انسانوں کی ایک برادری ہو۔ تم سب کا پالنہار اور محافظ صرف ایک ہے اس لیے اپنے آپ کو تقسیم مت کرو، صرف اس ایک ہی کی عبادت کرو (۱۳)۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں اپنی گرفتاری کے وقت بھی وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک تنظیم بنانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن گرفتاری کی وجہ کر یہ کام ادھورا رہ گیا (۱۴)۔

فرقہ وارانہ فسادات

انگریزی شہنشاہیت میں ہندو مسلم فسادات کو بھڑکانے والے حالات پھر سے پیدا ہوگئے تھے۔ نتیجتاً ملک میں فرقہ وارانہ فسادات دوبارہ شروع ہو گئے تھے (۱۵)۔ ۱۹۲۳ء کا سال فرقہ وارانہ فسادات کا سال بن کر آیا تھا۔ فسادات کے دوران فرقہ واریت و مذہبی

منافرت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ ملتان کے ملاّؤں نے مسجد میں مسلمانوں کو یہ قسم دلائی تھی کہ وہ ہندوؤں کا بائیکاٹ کریں۔ کلکتہ کے مسلمانوں میں یہ خیال گھر کر رہا تھا کہ مسلمان گئوکشی تب چھوڑ سکتے ہیں جب ہندو مورتی پوجا چھوڑ دیں (۱۶)۔ ایسی حالت میں کل ہند کانگریس کمیٹی نے ملتان میں اتحاد کے قیام کے لیے مدن موہن مالویہ اور مولانا آزاد کو بھیجنے کا فیصلہ کیا (۱۷)۔ مولانا آزاد یہ نہیں مانتے تھے کہ مورتی پوجا یا دیگر مذاہب کے قاعدے قانون آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ مورتی پوجا کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہ ویسی ہی پوجا ہے جیسے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے وقت تک عرب میں قبیلے کی مشہور شخصیات کی مورتیوں کی پوجا کی جاتی تھی (۱۸)۔ لہٰذا ان کے ذہن میں کسی بھی مذہب کے ماننے والوں کے لیے کسی طرح کی تنگ دلی یا تعصب کے جذبات نہیں تھے۔ کل ہند کانگریس کے ذریعہ سونپے گئے کام کے لیے اپریل ۱۹۲۳ء میں دیش بندھو چترنجن داس، شریمتی سروجنی نائیڈو، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، پنڈت موتی لال نہرو اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ جیسے لیڈران لاہور میں جمع ہوئے۔ یہاں دو جلسۂ عام میں انھوں نے فرقہ وارانہ اتحاد پر زور دیا۔ ان لیڈروں نے سارے ملک کا دورہ بھی کیا تھا (۱۹)۔ کچھ دنوں سے آگرہ میں آریہ سماج نے ملکانے راجپوتوں کی شدھی کر کے انھیں ہندو بنانے کا پروگرام چلایا ہوا تھا۔ اس کو لے کر وہاں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ مولانا آزاد ان فسادات کی جانچ کے لیے آگرہ گئے۔ جانچ کے بعد آگرہ کی کالی مسجد میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ملکانے ابھی تک ہندو کے ہندو بنے ہیں ... ہندوؤں کی جانب سے کسی طرح کا دباؤ نہیں ڈالا جا رہا ہے۔ انھیں حق ہے کہ وہ ملکانوں کو ہی نہیں سیدوں کو بھی اپنے مذہب میں ملا لیں (۲۰)۔ مولانا آزاد جانتے تھے کہ اخبارات میں چھپنے والے فرقہ وارانہ کشمکش کے واقعات فرقہ وارانہ اشتعال پیدا کرتے ہیں لہٰذا رابطۂ عامہ کے اس بااثر ذرائع کی جانب بھی ان کا دھیان گیا اور لاہور میں انھوں نے صحافیوں کے ایک جلسے میں ان سے اپیل کی کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کو بڑھائیں اور مبالغہ آمیز نیز غلط خبروں کو شائع نہ کریں (۲۱)۔

مولانا آزاد شدھی و سنگٹھن اور تنظیم و تبلیغ آندولن کو صحیح نہیں مانتے تھے۔ آریہ سماج کے شدھی اور سنگٹھن کے جواب میں مسلمانوں کے ذریعہ تنظیم و تبلیغ آندولن چلانا ان کی نظر میں صحیح نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے ایک دوست کو ایک خط میں لکھا تھا کہ ''قوم کی تعمیر میں

جوش وخروش سے زیادہ ضبط ونظم کی ضرورت ہے‘‘ (۲۲)۔ مولانا کا کہنا تھا کہ تنظیم وتبلیغ کے نام پر جو ہنگامہ کھڑا کیا گیا تھا وہ اسلامی طریقے (شریعت کی رُو سے) سے سراسر عاری تھا۔ اس لیے اس ہنگامے نے ہندوستان میں اسلام کو فائدہ نہیں نقصان پہنچایا اور آج بھی فرقہ پرستی کے نام سے اسلام کا نام لے کر جو کچھ کیا جا رہا ہے اس سے اسلام کی عظمت کو ہندوستان میں ناقابل تلافی نقصان ہو رہا ہے (۲۳)۔ ۲/ستمبر ۱۹۲۳ء کو دلّی میں ڈاکٹر انصاری کے گھر پر ہوئی ایک بیٹھک میں فرقہ وارانہ مسائل پر غور وخوض کرتے ہوئے مسلم رہنماؤں نے یہ فیصلہ کیا کہ شدھی اور سنگٹھن غیر مناسب تو نہیں ہے لیکن آپسی منافرت مٹانے کے لیے انھیں ملتوی کر دینا ہی مناسب ہے۔ اس بیٹھک میں فرقہ وارانہ فسادات کی جانچ کرنے کے لیے سات ہندوؤں اور سات مسلمانوں کی ایک کمیٹی مسٹر کونڈا وینکٹپا کی صدارت میں تشکیل دی گئی۔ اس میں مولانا آزاد کو بھی شامل کیا گیا تھا (۲۴)۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک پُرزور و مؤثر تحریک چلائی جائے۔ ان کے خیال میں بھارت کی آزادی نیز اس کے مستقبل کی ترقی کے پیش نظر اس کا چلایا جانا بہت ضروری تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ اسے کاؤنسلوں سے باہر عوام میں کانگریس کے ذریعہ چلائی جانے والی تحریک کا ایک حصہ بنایا جائے۔ ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے ایک خصوصی اجلاس (ستمبر ۱۹۲۳ء، دہلی) میں انھوں نے کہا تھا کہ آج یہ طے کیجیے کہ آزادی کی حفاظت کرنا ہے یا اسے آگرہ یا سہارنپور کی خون سے سنی مٹی میں دبا دینا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں میں نے مسلمانوں کے ہندوؤں سے الگ رہنے کی مخالفت کی تھی۔ آج شدھی اور سنگٹھن کی مخالفت کرتا ہوں (۲۵)۔ مولانا آزاد ہندو مسلم اتحاد کو حکومت کے خلاف لڑنے کے لیے ایک طاقت مانتے تھے۔ اس لیے فرقہ وارانہ اتحاد اور حکومت کی مخالفت دونوں کے ایک ساتھ اتفاقاً ہاتھ آجانے کا کوئی موقع گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ حکومت نے سکھوں پر جب ظلم کیا تو وہ سکھوں کے درد سے بھی دُکھی ہوئے اور ان کی تکلیف کے ازالے میں شریک ہوئے۔ ۱۴/نومبر ۱۹۲۳ء کو جب لالہ لاجپت رائے کے گھر پر امرتسر میں لالہ جی، موتی لال نہرو، دیش بندھو، ڈاکٹر انصاری و مولانا آزاد وغیرہ لیڈران کی گھریلو بیٹھک ہوئی اور اس میں شرومنی گرودوارہ پربندھک کمیٹی اور اکالی دَل پر سرکاری حملے کی مخالفت کی گئی تو بیٹھک میں سکھوں کی مدد کے لیے بنائی گئی کمیٹی میں مولانا آزاد بھی شامل کیے گئے (۲۶)۔

فسادات اور اتحاد کانفرنس

۱۹۲۴ء کا سال شروع ہونے کے وقت ملک کی ساری طاقت وقوت سوراج کے لیے ستیہ گرہ کے انعقاد کو منظم کرنے اور ہندو مسلم اتحاد کی جڑیں مضبوط کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ سوراج حامیوں نے کاؤنسلوں میں جا کر حکومت کی عوام مخالف پالیسیوں پر حملہ کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ حکومت کو کئی مرتبہ شکست بھی دے چکے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ جلد ہی حکومت ایسی پالیسیاں کانگریس کے مطابق بدلنے کے لیے مجبور ہو جائے گی۔ مولانا آزاد اس وقت تک کانگریس کے کاموں میں اتنے مشغول ہو گئے تھے کہ ۱۹۲۴ء میں ان کا زیادہ تر وقت دہلی میں گزرتا تھا اور ان کا پریس و لائبریری بھی کلکتہ سے دہلی آگئی تھی (۲۷)۔ ایک روزانہ اخبار ’’بھارت متر‘‘ کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے فرقہ وارانہ مسائل پر اپنے خیالات اس طرح واضح کیے تھے:

سوال: کیا عورتوں اور بچوں کو بہلا کر مسلمان بنانے کا طریقہ جائز ہے؟

مولانا آزاد نے جواب میں کہا کہ جب دونوں طرف سے یہ خبریں چھپتی ہیں تو بہت کم حصہ سچے اور اچھے جذبے سے لکھا جاتا ہے۔ اگر ان خبروں میں کچھ بھی سچائی ہے تو میں کہوں گا کہ دین اور مذہب کے نام سے ایسے کاموں کا کرنا سخت سے سخت برائی ہو سکتا ہے، جو دنیا میں ایک آدمی کر سکتا ہے۔

سوال: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہندو مسلمان کا جھگڑا مذہبی ہے؟

مولانا آزاد: بالکل نہیں۔ دونوں طرف فراخدلی کی کمی ہے، جس دن دونوں میں رواداری کا جذبہ پیدا ہوگا معاملہ درست ہو جائے گا۔

سوال: غیر رواداری دور کرنے کا طریقہ؟

مولانا آزاد: میں تو سمجھتا ہوں کہ اس وقت اور راستوں کے علاوہ ایک راستہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ ہندو مسلم دونوں مہاتما جی پر اعتماد کریں (۲۸)۔

سال کی آخری سہ ماہی میں جب ایک طرف کل ہند مسلم لیگ کے بمبئی اجلاس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر یہ کہہ رہے تھے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے رگوں میں پانڈووں اور کورووں کا خون ہے اور ہم ہندووں کے خونی رشتے کے بھائی ہیں (۲۹)۔ تب ہی اچانک ملک

میں فرقہ وارانہ فسادات پھر بھڑک اٹھے۔ ان فسادات میں کوہاٹ، گلبرگہ، دلی، شاہجہاں پور، الٰہ آباد، جبل پور، ناگپور، لکھنؤ وغیرہ شہر فرقہ وارانہ عناد کے شعلوں میں جل اٹھے۔ کوہاٹ میں ہندوؤں پر کافی ظلم ہوئے یہ فساد بہت ہی بھیانک تھا۔ ان فسادات کی جانچ کے لیے مولانا شوکت علی اور مہاتما گاندھی کی ایک کمیٹی بنائی گئی لیکن بدقسمتی سے دونوں ہی فسادات کی ذمہ داری سے متعلق ہم خیال نہیں ہو سکے (۳۰)۔ سچائی جو بھی ہو لیکن مہاتما گاندھی نے فسادات کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اکیس دن کے اُپواس (فاقہ) کا فیصلہ کیا اور مولانا محمد علی کے مکان پر اس کی شروعات کی گئی (۳۱)۔ مولانا آزاد پہلے ہی گاندھی جی پر اعتماد کرنے کی بات کہہ کر فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لیے ایک واضح سمت متعین کر چکے تھے۔ چنانچہ اس وقت ملک کے سبھی فرقوں کے لیڈروں کو اکٹھا کر کے اتحاد کی راہ نکالنے کی کوشش کی گئی۔

۲۶ر ستمبر ۱۹۲۴ء کو دن کے تین بجے سنگم تھیٹر ہال دلّی میں موتی لال نہرو کی صدارت میں اتحاد کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس میں سرلا دیوی چودھرانی نے فرقہ وارانہ کشمکش روکنے کے لیے ایک تجویز پیش کی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ سبھی مذاہب کے مبلغ اور عالم اپنے اپنے مذہب کے پیروکاروں کو ان رسم و رواج اور دستور و قوانین پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دیں جو سبھی مذاہب میں یکساں ہیں۔ مولانا آزاد نے اس تجویز کی تائید کی اور حاضرین مجلس کو اس کی حمایت کے لیے سمجھانے کی کوشش کی (۳۲)۔ جلسے میں مولانا آزاد کی کوششوں سے یہ تجویز پاس ہوئی کہ یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ — کسی کے ذریعہ بھی بدلہ لینے یا سزا دینے کے جذبے سے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا نہ صرف قانون کی رو سے غلط ہے بلکہ مذہب کے بھی خلاف ہے۔ یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ سبھی متنازع مسائل کو یا تو ذاتی طور پر یا جہاں یہ ممکن نہ ہو سکے وہاں عدالت کے توسط سے سلجھایا جائے گا (۳۳)۔ اجلاس میں پاس دیگر تجاویز میں گئوکشی روکنے کے لیے سرکاری احکام کی جگہ پر آپسی دوستی اور ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے پر زور دیا گیا۔ اجلاس کے مسلم ممبران نے اپنے ہم مذہب افراد سے ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ پہنچانے کے لیے گئوکشی کم کرنے کی حتی المقدور کوشش کی گزارش کی (۳۴)۔ تنگ نظر اور متعصب خیالات کے حامل کچھ لوگوں کے ذریعہ دہلی میں اس کی مخالفت بھی کی گئی نیز اس سے متعلق پوسٹر لگائے گئے۔

ایسا کیے جانے پر مولانا آزاد، مولوی کفایت اللہ اور مولانا محمد علی نے مخالفین کے پروپیگنڈہ کی مذمت کرنے کے لیے جامع مسجد میں ایک عظیم جلسے کا انعقاد کیا اور اتحاد کمیٹی کے جلسے میں پاس شدہ تجاویز کی حمایت کی (۳۵)۔ مہاتما گاندھی اپنے ۲۱ روزہ اُپواس پر تھے۔ جب انھیں جلسۂ اتحاد کمیٹی کے فیصلوں پر عمل درآمد کرنے کا یقین دلایا گیا تو انھوں نے ۱۲ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کو اپنا اُپواس ختم کر دیا۔ اُپواس کے خاتمے کے وقت مولانا آزاد نے گاندھی جی سے کہا تھا کہ مجھے یقین ہے کہ ہندو مسلمانوں کے دل ایک ہوں گے اور پھر ہوں گے، اور وہ جلدی ہی ہوں گے۔ اس کام کے لیے میں اپنی تمام تر طاقت لگا دینے کو تیار ہوں (۳۶)۔

ایک طرف جلسۂ اتحاد کے توسط سے فرقہ وارانہ کشمکش کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی اور دوسری طرف جلسے کے تجاویز کی سیاہی ابھی سوکھنے بھی نہ پائی تھی کہ ناگپور میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ مہاتما گاندھی نے ان فسادات کو ختم کرانے کے لیے مولانا آزاد کو تار دیا اور ۲۸ر اکتوبر سے قبل ہی پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ ناگپور پہنچ جانے کی صلاح دی (۳۷)۔ پنجاب میں بھی حالات اطمینان بخش نہیں تھے۔ مولانا آزاد نے مہاتما گاندھی کی دعوت پر پنجاب کے حالات سدھارنے کے لیے دسمبر ۱۹۲۴ء میں کئی لیڈروں کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا (۳۸)۔ ناگپور کے فسادات کو ختم کرانے کے لیے مولانا آزاد، پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ متاثرہ علاقوں کے مسلم لیڈروں سے ملے۔ فسادات مسجد کے سامنے باجہ بجانے کو لے کر شروع ہوئے تھے۔ اس سوال پر دونوں لیڈروں نے ۱۱ر جنوری ۱۹۲۵ء کو ۶۰ مقامی مسلم لیڈروں سے بات چیت کی اور مسلمانوں کو اس سوال پر کوئی جھگڑا نہ کرنے کے لیے سمجھایا۔ اس گفتگو کے بعد ۱۲ر جنوری کو مولانا آزاد نے ایک جلسے میں لوگوں سے اتحاد بنائے رکھنے کی اپیل کی۔ ۱۳ر جنوری کو دونوں لیڈروں نے ایک بیان جاری کیا کہ گرچہ پہلے سے ہی یہ روایت رہی ہے کہ مسجد کے سامنے سے گزرتے وقت باجہ بجانا بند کر دیا جاتا ہے پھر بھی صلاح و مشورے کے بعد دونوں فرقوں کے درمیان اتحاد قائم رکھنے کے لیے یہ طے کیا گیا ہے کہ مسلمان اس موضوع پر اپنے قانونی حق کو چھوڑنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور اسے ہندوؤں کے خلوص نیت پر چھوڑتے ہیں کہ وہ چاہیں تو مسجد کے سامنے باجہ بجائیں اور چاہیں تو اسے بند کر دیں۔ پنڈت موتی لال نہرو کے مطابق ناگپور کا یہ سمجھوتہ مولانا آزاد کی فراست اور ہنگامی سوجھ بوجھ کا ہی نتیجہ تھی۔

ناگپور کے بعد کلکتے میں مسلمانوں کے ذریعہ بقرعید کے موقع پر گائے ذبح کرنے کی وجہ کر ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ اس کے خاتمے کے لیے ۲/ جولائی ۱۹۲۳ء کو وہاں ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ مہاتما گاندھی کے ساتھ مولانا آزاد بھی اس میں شریک ہوئے۔ خضر پور گودی میں بھی مسلمانوں کے ذریعہ روایت کے خلاف مقررہ مقام کو چھوڑ کر دوسری جگہ پر گائے ذبح کرنے کی وجہ سے فساد پھوٹ پڑا تھا۔ فساد ختم کرانے کے لیے وہ گاندھی جی کے ساتھ وہاں بھی گئے تھے (۴۰)۔ دسہرہ کے موقع پر اس سال پریاگ میں بھی فساد ہوا۔ اسے ختم کرانے کے لیے بھی مولانا آزاد نے اپنی خدمات پیش کی تھیں (۴۱)۔ مولانا آزاد اس وقت فرقہ پرست طاقتوں کو غیر مؤثر بنا دینا چاہتے تھے تاکہ وہ ملک کی جدوجہد آزادی کی راہ میں رُکاوٹ نہ بن سکیں۔ ۲۹/ دسمبر ۱۹۲۵ء کو کانپور خلافت اجلاس میں انھوں نے مسلمانوں سے صاف طور پر کہا تھا کہ ''میں اس طریق عمل سے انکار کرتا ہوں کہ مسلمان ہندوؤں کے طرز عمل سے روٹھ کر اجنبی حکومت کی آڑ پکڑ لیں اور ان کی ہستی ہمیشہ ملک کی قسمت کے لیے ایک دھمکی کی طرح استعمال کی جائے۔ اگر ہندوؤں سے انھیں منصفانہ طرز عمل کا مطالبہ کرنا ہے تو پوری قوت سے کرنا چاہیے لیکن ساتھ ہی ضروری ہے کہ ہماری باہمی آویزش ملک کی جنگ کے میدان سے ہمیشہ الگ رہے''۔ مسلمانوں سے انھوں نے اپیل کی کہ ضروری ہے کہ آپ کی قوت ملک کی اندرونی خدمات کے لیے وقف ہو جائے (۴۲)۔

مولانا آزاد ہندوؤں سے اتحاد کے لیے مسلمانوں میں صحیح خیالات ونظریات کی تبلیغ کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لیگ کے خلاف ایسی ایک تنظیم مسلمانوں میں بنی رہنی چاہیے جو یہ کام ٹھیک طور پر انجام دے سکے۔ اس سلسلے میں وہ خلافت اور عدم تعاون تحریکات کے دوران کیے گئے کاموں کی وجہ کر خلافت کمیٹی کو زیادہ باا ثر مانتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے کانپور خلافت اجلاس میں کہا تھا کہ ''میں تو محسوس کرتا ہوں کہ اس کی ضرورت ہے، اور اگر یہ حلقہ (تنظیم مراد ہے) اپنی جگہ سردست خالی کر دے تو صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ خالی رہے گی بلکہ ایسی جماعتیں آگے بڑھ جائیں گی جن سے نہ تو کسی طرح کی عملی سرگرمی کی اُمید کی جاسکتی ہے اور نہ وہ آگے کی طرف کوئی نگاہ رکھتی ہے'' (۴۳)۔

اپریل ۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں بھیانک فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ چھ ہفتوں تک لوٹ، قتل اور آگ زنی ہوتی رہی۔ خود وائسرائے لارڈ اِروِن تک اس سے پریشان ہو اُٹھے

تھے (۴۴)۔ ایسی مصیبت کی گھڑی میں فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لیے مولانا آزاد نے گاندھی جی کو یہ مشورہ دیا تھا کہ کانگریس کا خصوصی اجلاس بلایا جائے (۴۵) لیکن گاندھی جی کے ذریعہ اسے غیر مفید ماننے کی وجہ کر ایسا نہ ہو سکا (۴۶)۔ اس مسئلے پر غور وخوض کرنے کے لیے مولانا آزاد نے کانگریس مجلس عاملہ کی بیٹھک طلب کیے جانے کی کوشش کی، جو کامیاب ہوئی اور ۴/ جولائی ۱۹۲۶ء کو کلکتہ میں کانگریس مجلس عاملہ کی ایک نشست ہوئی۔ اس میں فیصلہ کیا گیا کہ کانگریس کا ایک مستقل شعبۂ اشاعت قائم کیا جائے، جو ہندوستان بھر کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کا خاتمہ کرنے کی کوشش کرے اور عوام میں قومی یکجہتی کی روح پھونکے۔ اس کام کی بحسن وخوبی انجام دہی کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد، شریمتی سروجنی نائیڈو اور پنڈت موتی لال نہرو کو متعین کیا گیا تھا (۴۷)۔ ان تمام کوششوں کے ہوتے ہوئے بھی ملک کے سماجی ماحول میں فرقہ واریت کا زہر پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ ۲۳/ دسمبر ۱۹۲۶ء کو ایک تنگ نظر مسلمان نے پستول سے گولی مار کر سوامی شردھانند کا قتل کر دیا (۴۸)۔

اس واقعے سے فرقہ وارانہ منافرت پھر جاگ اٹھی اور دونوں فرقوں کی لڑائی میں ایک بار پھر ملک کو خون ریزی کے دور سے گزرنا پڑا۔ ۱۹۲۷ء کی گرمیوں میں فساد کی آگ پھر بھڑک اٹھی۔ مولانا آزاد سماجی سطح پر فرقہ وارانہ مسائل کے حل کرنے اور سیاسی حلقے سے اس کے بُرے اثرات دور کرنے کے لیے کوئی راستہ نکالنا چاہتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے قوم پرستی کی تبلیغ وتشہیر کے لیے ۳۱/ جولائی ۱۹۲۶ء کو پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ مل کر انڈین نیشنل یونین نامی ادارے کے قیام کے لیے ایک اعلان نامہ جاری کیا۔ مذہبی رواداری اور آزادی کو ماننے والے سبھی لوگوں کے لیے اس ادارے کے دروازے کھلے تھے (۴۹)۔ اس کے ساتھ ہی اپنے اخبار ''الہلال'' کے توسط سے مولانا آزاد نے سماجی نشر واشاعت کے ذریعہ فرقہ واریت کے خلاف جنگ چھیڑ دی تھی۔ ''رنگیلا رسول'' نامی ایک کتاب کو لے کر اس وقت سخت نزاع چھڑا ہوا تھا۔ پنجاب کی ایک عدالت نے اسے قابل اعتراض ٹھہرایا تھا۔ مولانا آزاد نے فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے والی سرگرمیوں پر اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''ملک کی اخلاقی اور دماغی فضا شائستہ اور پاک رہے اور لوگ قلم وزبان کی گندگیوں سے آلودہ نہ ہوں۔ ہندوستان جیسے مختلف المذاہب ملک میں صلح وامن کا قیام بھی اسی پر موقوف ہے۔ اگر فی الحقیقت اس بارے میں کوئی قانونی روک موجود نہیں تو ہمیں منتظر

رہنا چاہیے کہ ہر مذہب کا پیرو دوسرے مذہب اور اس کے رہ نماؤں کو اعلانیہ گالیاں دینا شروع کر دے گا اور ظاہر ہے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے"؟(۵۰) فسادات کی وجہ کر ملک کے سیاست دانوں کو فکر ہونی فطری بات تھی، لہٰذا ستمبر ۱۹۲۷ء میں شملہ میں "ایکتا سمیلن" بلایا گیا۔ اس میں مولانا آزاد، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کی مشترکہ حمایت سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ جہاں اب تک گاؤکشی نہیں کی گئی ہے وہاں اسے نہ کیا جائے، لیکن یہ تجویز پاس نہیں ہو سکی (۵۱)۔ آگے چل کر اس سمیلن کے بارے میں مولانا آزاد نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ "ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے ضروری تھا کہ جہاں تک مذہبی جھگڑوں کا تعلق ہے، "یونیٹی کانفرنس" دلّی کی تجاویز کو بنیاد بحث قرار دیتے تاکہ اس سے اور آگے بڑھ پاتے کیوں کہ جس نکتے تک وہ پہنچ چکے ہیں اس کے آگے بڑھنا یا اس پر قائم رہ کر مزید ترک مصلحت پر غور کرنا چاہیے نہ کہ پیچھے ہٹنا چاہیے لیکن یہ بات نظرانداز کر دی گئی۔ ضرورت ہے کہ آئندہ اس غلطی سے احتراز کیا جائے" (۵۲)۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ اگر کوئی فیصلہ ہو جائے تو اس سے ہٹنے کی بجائے اس پر عمل کرتے ہوئے دوبارہ غور وخوض کر کے آگے کے لیے راستہ نکالا جانا چاہیے۔ یہ طے ہے کہ ایسا کرنے پر نئے اختلافات پیدا ہونے کا راستہ بند ہوگا اور آپسی ٹکراؤ نہیں ہو سکے گا۔

۲۹/اکتوبر ۱۹۲۷ء کو کلکتہ میں کل ہند کانگریس کمیٹی نے فرقہ وارانہ اتحاد کی تشہیر کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس میں مولانا آزاد، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، پنڈت موتی لال نہرو، سبھاش چندر بوس، مولانا محمد علی اور راجندر پرشاد وغیرہ لوگوں کو شامل کیا گیا تھا(۵۳)۔ مولانا آزاد کا نقطۂ نظر نہایت وسیع تھا، پنڈت سندر لال کے لفظوں میں وہ ایک ہمہ گیر انسانی مذہب میں یقین رکھتے تھے(۵۴)۔ ان کا یہ نقطۂ نظر مذہب کے باہری اعمال و رسوم کی مسلسل تبدیلی کو تسلیم کرنا تھا۔ وہ مانتے تھے کہ اعمال و رسوم مذہب نہیں مذہب کی خارجی شکل و صورت ہے۔ مذہبی جذبات اس سے اعلیٰ و ارفع کچھ اور ہی چیز ہے جو دین یا دھرم ہے۔ صحیح طور سے خدا کے حضور خود سپردگی کے ساتھ زندگی گزارنا ہی دین ہے اور یہ انسانوں کے کسی ایک گروہ کی امانت نہیں ہے(۵۵)۔ مولانا آزاد کا یہ نظریہ ۳۰/ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو ان کے زیر صدارت کلکتہ میں منعقد اتحاد کمیٹی کی بیٹھک میں پاس تجاویز میں واضح

طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اس بیٹھک میں درج ذیل تجویزیں پاس کی گئی تھیں:

(۱) مذہب تبدیل کرانے کے لیے سبھی آزاد ہیں لیکن اس میں دھوکے یا خوف کا استعمال نہیں کیا جائے گا، سمجھا کر کرایا جا سکتا ہے۔

(۲) باجہ بجانے میں مسجد کے سامنے رُکیں نہیں۔ اس کا مظاہرہ نماز میں خلل ڈالنے والا نہ ہو۔

(۳) گاؤکشی مندر کے پاس یا عام سڑک پر نہ ہو۔ ان گایوں کا جلوس نہ نکالا جائے تاکہ ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے(۵۶)۔

فرقہ وارانہ اتحاد کی راہ میں یہ تجاویز سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہاں ہندو مسلمان دونوں بالآخر کسی ایک ایسے نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے، جس سے آگے بڑھنے کا راستہ کھلنے میں آسانی ہوئی۔ عوام میں آپسی بھائی چارگی بڑھانے کے لیے مولانا آزاد نے "الہلال" کے ذریعہ جو تبلیغ و تشہیر شروع کی وہ اس وقت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ انھوں نے مذہبِ اسلام کے نظریے سے ہندو مسلم اتحاد کو صحیح ثابت کرنے اور از روئے مذاہب جائز ٹھہرانے کے لیے "الہلال" میں ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے بیچ محبت و اخوت کا تعلق قائم ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ان کے اتحاد کے لیے خود پیغمبر اسلام نے ہی مثال قائم کی ہے۔ انھوں نے لکھا کہ "ایران، شام و مصر کی فتح کے بعد وہاں کے غیر مسلم باشندوں کے جن حقوق کا ذمہ لیا گیا تھا، وہ اس طرح ہیں:

(۱) انھیں پوری مذہبی آزادی ملے گی۔ ان کی مذہبی عبادت گاہیں اور ہر طرح کی عمارتیں محفوظ رہیں گی۔ صلیبوں اور مورتیوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ وہ سنکھ بجانے سے نہیں روکے جائیں گے۔ وہ اپنے تیوہاروں میں اپنے جلوس نکال سکیں گے۔ تمام مذہبی عہدے اور انتظامات اسی طرح قائم رکھے جائیں گے، جس طرح پیشتر سے موجود ہیں۔

(۲) انھیں ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا۔

(۳) ان کی جان و مال اور ہر طرح کی جائیداد محفوظ رہے گی۔ انھیں اس میں تصرف کے تمام حقوق حاصل ہوں گے۔ اگر ان کا کوئی دشمن اس پر حملہ کرے گا تو

مسلمان ان کی طرف سے لڑیں گے۔

(۴) ان کا کوئی حق چھینا نہیں جائے گا۔

(۵) انھیں ان کے مذہبی احکام کے خلاف کسی بات پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

(۶) قانون کی نظر میں ان کی جان مسلمانوں کے جان کی طرح ہوگی اور ان کا مال مسلمانوں کے مال کی طرح سمجھا جائے گا۔

(۷) تجارت، کاروبار اور معاشیات میں کسی طرح کی روک عائد نہیں کی جائے گی۔ ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہوگا جیسا مسلمانوں کے ساتھ ہوگا۔

(۸) وہ ان تمام ٹیکسوں سے معاف رکھے جائیں گے جو مسلمانوں کے لیے قرار دیے گئے ہیں۔ ان سے عشر بھی نہیں لیا جائے گا۔

(۹) وہ فوجی خدمت سے بھی معاف رکھے جائیں گے۔

یہ ان معاہدات کا خلاصہ ہے جو خود پیغمبر اسلامؐ نے غیر مسلموں سے کیے تھے۔ آگے چل کر جب بے شمار آبادیاں اسلام کے ماتحت آگئیں تو ان مجمل شریعت میں اور زیادہ تفصیل ہوئی اور مذہبی، ملکی اور معاشرتی آزادی وحقوق کی تمام باتیں پوری صراحت کے ساتھ منظور کر لی گئیں جو آزاد باشندگانِ شہر کے لیے اس عہد میں ہوسکتی تھیں۔

یہ محض معاہدہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک ایسا قطعی اور واضح طرزِ عمل تھا، جس میں کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں تھی۔

خلیفہ حضرت ابوبکرؓ سے خلیفہ حضرت علیؓ تک چاروں خلفاء کی زبان پر مرتے وقت یہ کلمات جاری تھے ''غیر مسلموں کے حقوق کا خیال رکھنا کیوں کہ ہم نے ان کا ذمہ لیا ہے'' (۵۷)۔

نہرو رپورٹ کی منظوری کے بعد مولانا محمد علی وغیرہ کچھ مسلم لیڈران نے مسلمانوں سے کانگریس سے الگ ہو جانے کے لیے کہنا شروع کر دیا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد پر اس کا اچھا اثر نہیں پڑ سکتا تھا، لہٰذا مولانا آزاد و ڈاکٹر انصاری وغیرہ جیسے لیڈروں نے ہندو مسلم اتحاد کی حفاظت اور مسلمانوں کو کانگریس سے الگ ہونے سے روکنے کے لیے ایک بیان شائع کیا، جس میں کہا گیا تھا کہ ''مسلمانوں کو علیحدگی کی خطرناک پالیسی سے ہوشیار رہنا چاہیے کیوں کہ آزادی کے لیے قومی لڑائی سے الگ رہنا اور اس طرح نوکر شاہوں کے ہاتھ مضبوط کرنا مسلمانوں کے معیار نیز ان کی عظمت کے خلاف ہے اور اسلامی روایت کے برخلاف

بھی'' (۵۸)۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ کی کھائی بڑھتی جا رہی تھی جسے روکنے کی ضرورت کو سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ ۲۷؍ جولائی ۱۹۲۹ء کو الہ آباد میں قوم پرست مسلمانوں کی ایک بیٹھک میں آل انڈیا مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا۔ مولانا آزاد کو پارٹی کا صدر اور ڈاکٹر انصاری کو خزانچی اور مسٹر ٹی۔ اے۔ کے شیروانی کو سکریٹری کا عہدہ تفویض کیا گیا۔ پارٹی کے مقاصد طے کرنے کے لیے مولانا آزاد، ڈاکٹر محمد عالم اور چودھری خلیق الزماں کی ایک ذیلی کمیٹی بنائی گئی، جس میں پارٹی کے اغراض و مقاصد اس طرح طے کیے گئے:

(۱) ہندوستانی مسلمانوں میں قوم پرستی کے جذبات اُجاگر کرنا، فرقہ واریت سے اوپر اٹھنے کے احساسات کو جگانا نیز ان میں ہندوستانی قومیت کے آدرشوں کے تعلق سے یقین واعتماد پیدا کرنا۔

(۲) مسلمانوں کی قومی جدوجہد میں صحیح معنوں میں حصہ لینے کے لیے حوصلہ افزائی کرنا۔

(۳) اقلیتی واکثریتی فرقوں کے درمیان ایسے تعلقات پیدا کرنا جو کہ اقلیتی فرقے کے حقوق کے بارے میں کھلے ذہن اور ملک پرستی سے پُر طریقے سے سوچنے کے لیے اکثریت کو ترغیب دے اور اقلیت بھی ایک سچے قوم پرست کی نظر سے ان پر غور کرے (۵۹)۔

اتحاد بنائے رکھنے کے لیے جتنی کوششیں بڑھتی جاتی تھیں فسادات کا سلسلہ بھی اتنی ہی تیزی کے ساتھ بڑھتا جاتا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں بنگال کے ڈھاکہ ضلع میں فسادات شروع ہو گئے۔ ان فسادات کی خبر سنتے ہی سرکار نے ان کی جانچ کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی لیکن ڈھاکہ کی پیپلس ایسوسی ایشن نے مسٹر مہندر کمار گھوش کی صدارت میں اتفاق رائے سے ایک تجویز پاس کر کے سرکاری کمیٹی کے ساتھ کوئی بھی تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا (۶۰)۔ کانگریس نے فسادات کو روکنے کے لیے قدم اٹھا کر مولانا آزاد کو ڈھاکہ میں امن قائم کرنے کا کام سونپا۔ وہ ڈھاکہ جا کر دونوں فرقوں کے لیڈروں سے ملے۔ پہلے انھوں نے ۲۲؍ جولائی ۱۹۳۰ء کو ڈھاکہ میں ہندوؤں کے نمائندوں سے بات کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے اپنے ایک معتبر لیڈر بابو سورج کانت بنرجی کے ساتھ مولانا سے تعاون کرنے کا تہیہ کیا۔ مسلم لیڈروں سے ملاقات کرنے کے مقصد سے ۲۳؍ جولائی کو

تیرہ ہندو لیڈروں پر مشتمل ایک وفد کی تشکیل کی گئی۔ ۲۴؍ جولائی کو ڈھاکہ کے مختلف محلوں کے دونوں فرقوں کے لیڈروں کی ایک مشترکہ بیٹھک مولانا آزاد کی صدارت میں بلائی گئی۔ اس میں اتفاق رائے سے قیام امن کی تجاویز پاس کی گئیں۔ پندرہ ہندوؤں اور پندرہ مسلمانوں کی ایک مشترکہ ''قیام امن کمیٹی'' کی بھی تشکیل کی گئی۔ ہندو لیڈر بابو آنند چندر رائے کے لڑکے بابو دھیریندر چندر رائے اور ڈھاکہ ضلع بورڈ کے نائب صدر قاضی شہاب الدین کو کمیٹی کے سکریٹری کے بطور منتخب کیا گیا۔ ۲۵؍ جولائی کو ڈھاکہ کے نواب اس کے صدر اور مشہور وکیل بابو جوگیندر ناتھ سین اس کے نائب صدر چنے گئے۔ مولانا کے حسب ہدایت منتخب اس کمیٹی نے ہندو مسلم سمجھوتے کا ایک اعلانیہ تیار کیا۔ شہر میں ڈھول پیٹ کر ہندو مسلم سمجھوتے کا اعلان کیا گیا۔ اس طرح مولانا کی کوششوں سے ڈھاکہ کے فسادات کو فرو کرنے میں کامیابی نصیب ہوئی (۶۱)۔

مولانا آزاد نے اپنی ہر ممکن قوت وطاقت نیز ذرائع کا استعمال کر کے اتحاد کو بنائے رکھنے کی پوری کوشش کی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے کتنے بڑے حامی تھے اس کا پتہ صرف اسی بات سے چل سکتا ہے کہ انھوں نے ایک بار کہا تھا کہ ''اگر بہشت سے اُترا فرشتہ بھی قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ کہے کہ ہندو مسلم اتحاد کا خیال چھوڑ دو تو ۲۴ گھنٹے کے اندر تمھیں سوراج مل سکتا ہے تو میں سوراج کو چھوڑ دوں گا پر اپنی جگہ سے نہیں ہٹوں گا۔ سوراج کو چھوڑنے سے صرف ہندوستان ہی متاثر ہوگا جب کہ اتحاد کے خاتمے سے پوری دنیا کا نقصان ہوگا (۶۲)۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا آزاد فرقہ وارانہ فسادات کو ختم کرانے کے لیے ہمیشہ نیک نیتی کے ساتھ دونوں فرقوں کے سمجھ دار لوگوں کو ساتھ لے کر نہایت ہی ہوشیاری و دانشمندی کے ساتھ مسائل کے دائمی حل کی کوشش میں لگے رہے۔ ایسا ممکن نہ ہو پانے پر بھی وہ کبھی مایوس نہ ہوئے بلکہ انھوں نے ایک بیچ کا راستہ نکال کر فوری طور پر مسائل کو حل کرتے ہوئے مستقبل میں اس کے دائمی اختتام کی راہ کھولنے کی کوشش تو ضرور ہی کی اور زیادہ تر وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

کل جماعتی اجلاس

اس وقت بنگال میں ستیہ گرہ کرنے والوں اور سوراج دَل کے خلاف سرکاری ظلم و

جبر بڑھتا ہی جا رہا تھا لہٰذا کانگریس کے حق میں رائے عامہ تیار کرنے کے لیے کل جماعتی اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کی پہلی بیٹھک بمبئی میں سر دین شاپٹ کی صدارت میں ۲۱ اور ۲۲؍ نومبر ۱۹۲۴ء کو ہوئی (۶۳)۔ اس بیٹھک میں طے ہوا کہ بنگال کے ہنگامے کی وجہ سوراج کا نہ ملنا ہے۔ کانفرنس میں سوراج کا منصوبہ اور فرقہ وارانہ سمجھوتہ تیار کرنے کے لیے گاندھی جی کی صدارت میں مسٹر سی. آر. داس، محمد علی جناح، مسز اینی بیسنٹ اور مولانا آزاد وغیرہ ۱۸ اشخاص کی ایک کمیٹی بنائی گئی (۶۴)۔ اس کمیٹی نے ایک تجویز پاس کر کے بنگال کریمنل لاء امینڈمنٹ ایکٹ کی مذمت کی۔ اجلاس نے گاندھی جی کی تجویز کے مطابق دوسری سیاسی جماعتوں کو اپنے ساتھ ملانے اور ہندو مسلم مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے ایک دوسری کمیٹی بھی بنائی۔ مولانا آزاد کو اس کا بھی ممبر بنایا گیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ یہ کمیٹی ۳۱ مارچ ۱۹۲۵ء تک اپنی رپورٹ پیش کرے گی (۶۵)۔ ۲۴؍ جنوری ۱۹۲۵ء کو ایک کل جماعتی جلسہ دہلی میں منعقد ہوا جس میں ۵۰ لوگوں کی ایک ذیلی کمیٹی بمبئی تجاویز کے تیسرے حصے فرقہ وارانہ اتحاد، دیگر جماعتوں کے کانگریس میں ملنے اور سوراج ہونے پر سیاسی اداروں میں بھی فرقوں کی نمائندگی پر رپورٹ دینے کے لیے بنائی گئی۔ مولانا آزاد کو اس کا بھی ممبر بنایا گیا (۶۶)۔ ۲۵؍ جنوری کو اس جلسے میں مسٹر محمد علی جناح نے مسلمانوں کو علیحدہ انتخابی حلقے کے ذریعہ قومی نمائندگی دینے کی وکالت کی تھی لیکن اس وقت کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکا (۶۷)۔

سائمن کمیشن اور کل جماعتی اجلاس

کل جماعتی اجلاس اور اتحاد کانفرنس ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کرنے اور ملک کے دیگر مسائل سلجھاتے ہوئے انگریزوں کے خلاف ملک کو زیادہ سے زیادہ منظم کرنے کے طریقوں پر غور وفکر کر رہے تھے۔ اسی دوران انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر اسٹینلے والڈوین نے ۸؍ نومبر ۱۹۲۷ء کو ایک نیا فرمان جاری کیا۔ اس کے مطابق باشندگان ہند کو بتایا گیا کہ برٹش سرکار سر جان سائمن کی سربراہی میں ایک کمیشن ہندوستان بھیجے گی۔ یہ کمیشن اس بات کی جانچ کے لیے مقرر کیا گیا تھا کہ ہندوستان میں جوابدہ حکومت کا اصول لاگو کرنا ٹھیک ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس درجے تک (۶۸)۔ اس کمیشن کے سبھی ممبران انگریز تھے۔ کسی

ہندوستانی کو اس کا ممبر نہ بنائے جانے پر سارے ملک میں سخت ردّعمل ہوا۔ یہاں تک کہ مسٹر دین شاواچا، سرتیج بہادر سپرو، مسز اینی بیسنٹ جیسے نرم مزاج لیڈروں نے بھی ایک اعلان نامہ نکال کر اپنی مخالفت کا اظہار کیا۔ کانگریس کو چھوڑ کر ہندوستان کی سبھی سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے اس پر اپنے دستخط کیے تھے(۶۹)۔ ۱۹۲۷ء کو مدراس کانگریس نے کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور ہندوستانی عوام سے کمیشن کے ملک میں آنے کے دن سارے ملک میں اور جہاں کمیشن کے ممبران جائیں وہاں اس دن کمیشن مخالف مظاہرے کے لیے تیار رہنے کی اپیل کی(۷۰)۔ ۱۵رجنوری ۱۹۲۸ء کو کانگریس کے صدر ڈاکٹر انصاری نے کمیشن کی مخالفت کرنے کے لیے بنارس میں مختلف پارٹیوں کے نمائندگان کی ایک میٹنگ بلائی، مولانا آزاد بھی اس میں شامل ہوئے تھے(۷۱)۔ کانگریس کے ذریعہ کمیشن کی مخالفت کرنے کے فیصلے کو لاگو کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کمیشن کی مخالفت کو سوراج کے ساتھ جوڑ دیا۔ ۲۸رجنوری کو دِلّی کے ایک جلسے میں ہڑتال کے لیے عوام سے اپیل کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ سائمن کمیشن کے آنے پر اگر تم مکمل ہڑتال نہیں کر سکتے تو تمھیں اپنے دماغ سے ''سوراج'' کا خیال نکال دینا چاہیے اور پھر کبھی اپنے منہ سے لفظ ''آزادی'' نہیں کہنا چاہیے(۷۲)۔ مولانا آزاد سائمن کمیشن کی تیاری میں مشغول تھے۔ انھوں نے سائمن کمیشن کے ملک میں آنے سے پہلے اخباری نمائندوں کو ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ سائمن کمیشن کے خلاف ملک مکمل ہڑتال منائے گا۔ مسلمانوں کی زیادہ تر تعداد بائیکاٹ کی حمایت میں ہے(۷۳)۔ سارے قومی لیڈران کمیشن کے بائیکاٹ کی اپیل کر رہے تھے۔ کمیشن مخالف جذبات ملک میں اتنے مضبوط اور با اثر تھے کہ مرکزی قانون ساز اسمبلی کے کچھ ممبران نے نئی دِلّی میں ایک غیر رسمی بیٹھک میں کمیشن کی مخالفت کرنے کا پروپیگنڈہ کرنے کے لیے مرکزی اور صوبائی بورڈوں کی تشکیل کی تھی۔ صوبۂ بنگال کے لیے جو بورڈ بنایا گیا اس میں بنگالی لیڈروں مسٹر جیوتیندر ناتھ بسو، مسٹر جے. ایم. سین گپتا وغیرہ کے ساتھ مولانا آزاد بھی شامل کیے گئے تھے(۷۴)۔ دوسری طرف کمیشن کی حمایت کرنے والے بھی خاموش نہیں تھے۔ پنجاب مسلم لیگ کا ''صفی گروپ'' کمیشن کا بائیکاٹ نہ کرنے کی تشہیر کر رہا تھا۔ اس کا اثر ختم کرنے کے لیے قومی لیڈروں نے اس جانب بھی توجہ دی۔ ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد نے لاہور، جالندھر اور گجرانوالہ وغیرہ شہروں میں عوامی جلسوں

سے خطاب کر کے لوگوں کو کمیشن کا بائیکاٹ کرنے کی ترغیب دی(۷۵)۔ لیگ والوں کے علاوہ ملک کے کچھ دیگر با اثر مسلمان بھی کمیشن کی حمایت کر رہے تھے۔ خان بہادر محمود الحسن (ایم. ایل. سی.) کی صدارت میں جامع مسجد مرادآباد میں سائمن کمیشن سے تعاون کرنے کے سلسلے میں ۱۴ردسمبر ۱۹۲۸ء کو ایک میٹنگ ہوئی تھی(۷۶)۔

سائمن کمیشن کے ہندوستان آنے پر ایک سرکاری اعلان کیا گیا تھا، جس میں مرکزی کاؤنسل کے ذریعہ منتخب ۷ ہندوستانیوں کو کمیشن کے ساتھ برابری کی بنیاد پر کام کرنے کا موقع دینے کی بات کہی گئی تھی۔ صوبوں سے بھی ایسے ہی ممبر منتخب کیے جانے کا اعلان کیا گیا تھا(۷۷)۔ سائمن کمیشن کی جانب سے ۷رفروری ۱۹۲۸ء کو ہندوستان کی پارٹیوں سے تعاون کرنے کی اپیل جاری کی گئی تھی۔ اس کے جواب میں دہلی میں موجود کانگریسی انڈپنڈنٹ اور نیشنلسٹ لیڈروں نے ایک مشترکہ بیان جاری کر کے اپنی مخالفت اور بائیکاٹ پہلے کی طرح ہی جاری رکھتے ہوئے کمیشن کی کسی کارروائی سے کسی بھی حالت میں کسی بھی شکل میں کچھ بھی تعاون نہ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس بیان پر مدن موہن مالویہ، شری نواس آئینگر، ایم. آر. جیکر، لالہ لاجپت رائے، مولانا آزاد، مولانا محمد علی و شوکت علی، محمد علی جناح اور راجہ غضنفر علی نے دستخط کیے تھے(۷۸)۔ کمیشن کے آنے کے بعد سارے ملک نے اس کا زبردست بائیکاٹ کیا۔

نہرو رپورٹ

کل جماعتی اجلاس ملک کے عوام کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کی نشستوں میں حصولِ آزادی کی تدبیروں پر غور وفکر کیا جا رہا تھا۔ ستمبر ۱۹۲۷ء میں اس کی کلکتہ میں منعقدہ نشست میں کوئی فیصلہ نہیں لیا جا سکا تھا(۷۹)۔ فروری، مارچ ۱۹۲۸ء میں اجلاس کی ۲۵ نشستیں ہوئیں، جن میں دیگر سبھی مسائل کے حل کے علاوہ سبھی لوگ اس بات پر بھی متفق ہوئے کہ مکمل جوابدہی کو بنیاد مان کر ہی ہندوستان کے آئینی مسائل پر غور وخوض ہونا چاہیے۔ ۱۹رمئی ۱۹۲۸ء کو ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں منعقد بمبئی اجلاس میں یہ طے ہوا کہ ہندوستانی آئین کے کلیات (اصولوں) کا مسودہ تیار کرنے کے لیے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی جائے جو یکم جولائی ۱۹۲۸ء تک اپنی رپورٹ دے

دے(۸۰)۔

نہرو کمیٹی نے ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان سلجھے ہوئے تعلقات قائم رکھنے کے لحاظ سے اپنی رپورٹ تیار کی تھی۔ اس میں ہندوستانی عوام کے لیے بالغ رائے دہندگی کے حقوق کی بنیاد پر مرکزی وصوبائی اسمبلیوں کا نظم کیا گیا تھا اور عوام کو بنیادی حقوق فراہم کیے گئے تھے لیکن کسی بنیاد پر کسی کو بھی ہمیشہ کے لیے (محفوظ) انتخابی حلقہ دینے سے انکار کیا گیا تھا۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان کی ہندو اقلیتوں اور ملک کی مسلم اقلیتوں کو صرف دس سال کے لیے محفوظ حلقۂ انتخاب دیے گئے تھے تاکہ اس دوران وہ عام انتخابات کے عادی ہو جائیں اور فرقہ واریت کے اثرات کم ہوتے جانے سے دس سال بعد سارا ملک ایک ہی نظام کے تحت انتخابات میں حصہ لے سکے(۸۱)۔

لکھنؤ اجلاس

نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لیے کل جماعتی سطح کا اجلاس ۲۸ سے ۳۰؍اگست ۱۹۲۸ء کو لکھنؤ میں منعقد ہونے والا تھا لیکن اس سے قبل ہی مولانا آزاد کی کوششوں سے ۸؍ جولائی کو الہ آباد میں کچھ لیڈروں نے نہرو رپورٹ کی سازشوں سے متعلق تبادلۂ خیال کیا۔ یہاں پر پنجاب کی سکھ لیگ کے لیڈر سردار منگل سنگھ نے مطالبہ کیا کہ اگر مسلمانوں کے لیے سیٹ محفوظ کی جاتی ہے تو سکھوں کے لیے بھی سیٹیں محفوظ کی جائیں اور جس طرح مسلمانوں کو ان کی آبادی سے زیادہ سیٹیں دی جا رہی ہیں اسی طرح سکھوں کی آبادی کم ہونے پر انھیں بھی زیادہ سیٹیں دی جانی چاہئیں۔ اس مطالبے کی وجہ کر الہ آباد میں کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا(۸۲)۔ اس طرح یہاں وائسرائے لارڈ اِرون کا وہ اندیشہ صحیح ثابت ہو رہا تھا، جو انھوں نے ۱۹۲۶ء میں بمبئی کے مسلمانوں کے ایک وفد کے سامنے ظاہر کیا تھا کہ ''اگر فرقہ وارانہ نمائندگی کو ہی آخری مقصد سمجھا جائے گا تو جس چیز کے ذریعہ اتحاد کو فروغ دینے کا خیال تھا وہی ٹوٹ پھوٹ اور جھگڑے کی بیج بن جائے گی''(۸۳)۔ مولانا آزاد کی نظر میں فرقہ وارانہ نمائندگی کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ مانتے تھے کہ علیحدہ انتخابی حلقے جیسے نظام کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہندو مسلم اختلافات کو حل کرنے کے لیے ان کا خیال تھا کہ متحدہ انتخابی حلقوں کی تشکیل سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات یقیناً حل ہو

جائیں گے اور ملک اتحاد کی جانب گامزن ہوگا۔ اختلافات دور کرنے کا اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے(۸۴)۔ اسی لیے ان کا کہنا تھا کہ نہرو رپورٹ میں بالغ حق رائے دہی منظور کیے جانے پر مسلمانوں کے لیے کسی طرح کی سیٹ محفوظ کیے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے الہ آباد کے اجلاس میں کہا تھا کہ بالغ حق رائے دہی اختیار کرنے پر کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ مسلمان انتخابی طرز حکومت کے مطالبے میں بھی شریک ہوں اور دوسری طرف مزید تحفظ کا بھی مطالبہ کریں(۸۵)۔ ۸؍جولائی کی رات کو ہی مولانا آزاد نے ڈاکٹر مشتاق احمد انصاری اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے ساتھ بات چیت کی اور اس پر زور دیا کہ بالغ حق رائے دہی کو بطور ایک لازمی شرط کے تسلیم کر لیا جائے تو پھر بنگال کے لیے تحفظ ضروری نہیں(۸۶)۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ مولانا کے مطابق بالغ حق رائے دہی تسلیم کر لینے پر بنگال میں بھی مسلمانوں کے لیے محفوظ انتخابی حلقوں کا نظم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ اس بارے میں مختلف لیڈروں سے گفتگو کر کے ایک عام رائے بنائی جائے، تب لکھنؤ میں اس پر کوئی فیصلہ لے لیا جائے۔ اس مقصد سے انھوں نے کلکتہ جا کر لیگ اور کانگریس کے لیڈروں سے بات چیت کی اور اپنا مندرجہ بالا نظریہ ان کے سامنے رکھا۔ سب سے پہلے انھوں نے کلکتہ میں سر عبدالرحیم سے اس سلسلے میں گفتگو کی۔ سر عبدالرحیم نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ انتخابی حلقوں کی ضرورت پر ہی زور دیا تو مولانا آزاد نے یہ تجویز سامنے رکھی کہ اس موضوع پر نئے سرے سے مکمل بحث ہونی چاہیے۔ سر عبدالرحیم اس بات پر راضی ہو گئے اور طے پایا کہ جو لوگ مشترکہ انتخابی حلقوں کی مخالفت اور علیحدہ انتخابی حلقوں کی موافقت کرتے ہیں ان سب کو بلا کر بات چیت کر لی جائے۔ بنگال کی مسلم لیگ کے سکریٹری مولوی مجیب الرحمٰن سے اس کا انتظام کرنے کے لیے کہا گیا۔ ۴؍اگست کو سر عبدالرحیم کے مکان پر ایک بیٹھک بلائی گئی۔ اس میں بنگال کے مسلم لیڈران میں مولوی عبدالکریم، فضل الحق، خان بہادر مولوی مقبول حسن، خان بہادر تمیز الدین، بنگال لیگ کے سکریٹری مولوی مجیب الرحمٰن، جمعیۃ العلماء کے سکریٹری مولوی منیر الزماں، محمدی اخبار کے مولوی اکرام خاں اور دیناج پور کی جمعیۃ العلماء کے صدر مولانا عبد الباقی شریک ہوئے۔ تین گھنٹے تک بحث چلتی رہی۔ مولانا آزاد کی کوششوں سے سب نے یہ تسلیم کیا کہ اگر بالغ حق رائے دہی نفاذ میں آجائے تو بنگال کے

لیے نشستوں کا تحفظ غیر ضروری ہے۔ بحث ختم ہو جانے کے بعد مولانا آزاد نے تین مرتبہ لوگوں سے یہ پوچھ کر اس کی تصدیق کر لی کہ لکھنؤ میں ہونے والے اجلاس میں اس بات کی تائید کی جائے گی کہ اگر بالغ حق رائے دہی منظور ہو جائے تو تحفظ پر زور دینا ضروری نہیں ہے(۸۷)۔

مرکزی خلافت کمیٹی کی ایک بیٹھک بلا کر اس میں بھی ۲۵/اگست کو اس مسئلے پر غور کیا گیا۔ اس نے نہرو کمیٹی رپورٹ کی تجاویز کو تسلیم کرتے ہوئے ایک تجویز یہ منظور کی کہ پنجاب کے لیے دس برسوں تک یعنی دو چناؤ تک نشستیں محفوظ رکھی جائیں، اس کے بعد تحفظ ختم ہو جائے گا۔ اس بیٹھک میں مولانا شوکت علی بھی یہی چاہتے تھے کہ دس برسوں تک سیٹوں کو محفوظ رکھنے کی بات مان لی جائے۔ پنجاب کے مسلم لیڈران بھی اس بات کے حمایتی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دس سال یعنی دو انتخابات تک اسے تجربہ کرنے کے لیے منظور کر لیا جائے پر بعد میں اس نظام کو بنائے رکھنے یا نہ رکھنے پر غور و خوض کیا جا سکتا ہے(۸۸)۔ مولانا آزاد نے اس خیال کی تائید نہ کی۔ انھوں نے کہا کہ ''ایڈلٹ سفریج'' ہوتے ہوئے ایسا فیصلہ لینا غلط ہے۔ ووٹنگ ہونے پر انھوں نے تجویز کے خلاف ووٹ دیا۔ انھوں نے اپنی بات کے حق میں دلیل پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

(۱) گیارہ سال بعد رپورٹ کی تجویز منظور کرنے کے کیا معنی ہیں؟

(۲) اگر تحفظ نہ ہونا خطرے سے خالی نہیں ہے تو دس سال بعد ہمیشہ کے لیے خطرہ کیوں مول لیا جائے؟

(۳) یہ کہنا کہاں کی عقل مندی ہے کہ دس سال بعد منظور کریں گے، شفا حاصل ہو یا نہ ہو۔

(۴) اگر دس سال بعد تحفظ ختم کرنا تجربے سے غلط ثابت ہوا تو کیا نتیجہ نکلے گا؟

(۵) اگر یہ کہنا کہ ہمارے یہ کہنے سے کہ دس سال بعد تحفظ اڑا دیا جائے، کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم سچ مچ دس سال کے بعد اس پر راضی بھی ہو جائیں گے، یہ تو سیاسی معاملات میں مطلب براری کا ایک ڈھنگ ہے کہ جب دس سال کی مدت گزر جائے گی تو دیکھا جائے گا کہ منظور کرنا چاہیے یا نہیں۔

انھوں نے کہا کہ اگر آپ رپورٹ کو ٹھیک نہیں سمجھتے تو ''ایڈلٹ سفریج'' کی شرط

کے ساتھ دس سال کے لیے بطور آزمائش منظور کر لیں اور صاف طور پر قطعی لفظوں میں یہ بات طے کر لیں کہ اگر دس سال بعد انھوں نے چاہا تو تحفظ کے مطالبے کا حق ہوگا(۸۹)۔

مرکزی خلافت کمیٹی کی اس بیٹھک میں مولانا شوکت علی نے خود اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ مطالبۂ تحفظ کے تعلق سے ایسا کچھ بھی نہیں کہیں گے جس سے نہرو کمیٹی کی رپورٹ کو نقصان پہنچے(۹۰)۔

لکھنؤ میں ۲۸ سے ۳۰/اگست ۱۹۲۸ء تک کل جماعتی اجلاس کا انعقاد ہوا۔ اس میں نہرو رپورٹ پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ مولانا شوکت علی نے اپنے سابقہ اعلان کے برعکس یہاں رپورٹ کی مخالفت کی(۹۱)۔ اجلاس کے دوران ایک غیر رسمی نشست میں محمد علی جناح نے مسلمانوں کی جانب سے یہ مانگ رکھی کہ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے ایک تہائی سیٹیں محفوظ کی جائیں اور قانون ساز اسمبلی میں جن موضوعات پر مرکزی حکومت کو اختیارات دیے گئے ہیں، صوبوں کو بھی ان پر اختیارات دیے جائیں۔ مسٹر ایم۔ آر۔ جیکر نے اس مانگ کی زبردست مخالفت کی(۹۲)۔ ۳۰/اگست کو اجلاس میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی اور مولانا آزاد کو اس کا صدر مقرر کیا گیا۔ مولانا آزاد کی صلاح پر سر تیج بہادر سپرو کو بھی اس کمیٹی میں شامل کر لیا گیا۔ اسی دن کمیٹی کی اپنی ایک بیٹھک میں لیے گئے فیصلوں کے مطابق:

(۱) نہرو رپورٹ کو ''ایڈلٹ سفریج'' (بالغ حق رائے دہی) سے متعلق مانا گیا۔

(۲) دس سال کے لیے اسے منظور کر لیا گیا۔

مولانا شوکت علی کو بھی اس بیٹھک میں بلایا گیا تھا لیکن وہ قریب کے ایک کمرے میں موجود کچھ لوگوں سے یہ کہہ کر چلے گئے کہ اگر آپ مطمئن ہوں تو تجویز منظور کر لیں(۹۳)۔

اجلاس میں نہرو رپورٹ کو منظور کر لیا گیا۔ رپورٹ منظور کیے جانے کے بعد جب لالہ لاجپت رائے نے نہرو رپورٹ پر توصیفی تجویز پیش کی تو مولانا آزاد نے ان کی تجویز کی توثیق کرتے ہوئے کہا کہ اس رپورٹ سے واضح ہو گیا کہ ہندوستان کو موقع ملے تو وہ کیا کر سکتا ہے(۹۴)۔ اجلاس نے نہرو رپورٹ کو منظور کرتے ہوئے اپنے آپ کو نو آبادیاتی سوراج کے حق میں پیش کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جن سیاسی جماعتوں کا مقصد مکمل آزادی حاصل کرنا تھا، اجلاس نے انھیں بھی اپنا کام کرنے کے لیے پوری آزادی عطا کی تھی۔ اس کی وجہ

یہ تھی کہ مسٹر سبھاش چندر بوس، جواہر لال نہرو اور شری نواس آئینگر نوآبادیاتی سوراج کی جگہ پر مکمل سوراج کی حمایت کر رہے تھے اور انھوں نے انڈپنڈنٹ لیگ نامی ادارے کی تشکیل کی تھی اور تشکیل کے بعد ۳۰ راگست کو ہی اس کی بیٹھک میں مکمل خودمختاری کو ہندوستانیوں کا فوری مقصد بھی منظور کر لیا تھا(۹۵)۔

لکھنؤ کانفرنس کے فیصلوں سے مولانا شوکت علی کو کوئی خوشی نہ ہوئی۔ انھوں نے اس فیصلے کے خلاف اپنے اخبار ''ہمدرد'' کے تین ستمبر ۱۹۲۸ء کے شمارے میں ایک مضمون شائع کیا۔ اس میں صدر جلسہ ڈاکٹر مشتاق احمد انصاری کی مذمت کرتے ہوئے سیٹوں کا محفوظ نہ ہونا منظور کر لینے کو ہندوؤں کے نقطۂ نظر کی منظوری کہہ کر اس کی تنقید کی(۹۶)۔ لیکن مولانا آزاد مولانا شوکت علی کے اس نقطۂ نظر سے کبھی متفق نہیں ہو سکے۔ ان کی نظر میں نہرو رپورٹ مسلمانوں کے لیے غیر مفید نہ تھی اور نہ ہی اجلاس کا فیصلہ انھیں کوئی نقصان پہنچاتا تھا۔ انھوں نے اپنے ایک خط میں عبدالرزاق ملیح آبادی کو لکھا تھا کہ نہرو رپورٹ اور کانفرنس نے مسلمانوں کے حقوق کے لیے جو اصول و مبادیات قرار دے دیے ہیں وہ صحیح ہیں اور ان کی وجہ سے مسلمانوں کی آزادانہ جدوجہد اور سیاسی و اجتماعی ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ انھوں نے مولانا محمد علی کے ذریعہ کی گئی مخالفت کے بارے میں لکھا کہ اگر کسی شخص یا جماعت کو اختلاف ہے تو یہ اختلاف کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں۔ لیکن یہ نہیں کرنا چاہیے کہ جزوی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کے قتل عام کا شور مچا دیا جائے(۹۷)۔ مولانا شوکت علی کے ذریعہ ''ہمدرد'' میں تنقید و مذمت سے پُر مضمون چھاپنے سے متعلق مولانا نے اپنی مخالفت ان الفاظ میں ظاہر کی تھی کہ ''اگر ۱۹۲۸ء میں بھی ہماری پبلک لائف کا یہ حال ہے کہ ملک کے سیاسی مستقبل جیسے اہم اور نازک معاملوں میں بھی ملک کے ذمہ دار لیڈروں کا قلم بالکل بے قابو ہو جاتا ہے، تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے لیے عقل و تمیز میں کیا باقی رہ گیا ہے اور مسلمانوں کی جماعتی زندگی اور جماعتی جدوجہد پر کیوں نہ فاتحۂ خیر پڑھ دیا جائے''(۹۸)۔ مولانا آزاد یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان کنھیں شرائط کی بنیاد پر ہندوؤں کا ساتھ دیں۔ آگے چل کر انھوں نے اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا تھا کہ ''۱۹۱۲ء سے میری دعوت مسلمانوں کے لیے یہ رہی ہے کہ جہاں تک ملک کی سیاسی جدوجہد کا تعلق ہے انھیں بنا کسی شرط کے شریک ہونا چاہیے اور یہ کہہ کر شریک ہونا

چاہیے کہ وہ محض ادائے فرض کے لیے شریک ہو رہے ہیں۔ اس لیے شریک نہیں ہو رہے ہیں کہ ہندوؤں نے انھیں ان کے مستقبل کی طرف سے مطمئن کر دیا''(۹۹)۔

نہرو رپورٹ کی حمایت کرنے کی وجہ کر انھیں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ رپورٹ کے مخالفین نے کلکتہ میں ان کے خلاف یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ مولانا آزاد ہندوؤں کے ساتھ ہیں اور اب وہ ہندوؤں کے مندروں میں جا کر وعظ کریں گے پر مولانا نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ ان کے مخالفین نے طاقت کے بل پر انھیں اپنے فیصلے سے ہلانا چاہا اور کلکتہ میں منعقد خلافت کمیٹی کے ایک جلسے میں جہاں مولانا تقریر کرنے والے تھے، ان کی تقریر نہ ہونے دینے کے مقصد سے یہ لوگ لاٹھی ڈنڈے اور چاقو چھرے سے لیس ہو کر خلل پیدا کرنے اور ہنگامہ کرنے پہنچے تھے(۱۰۰) اور باوجود ان باتوں کے مولانا اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔

کلکتہ و لاہور کانگریس

مولانا آزاد کی قومی کاموں میں دلچسپی و خلوص نیز ان کی صلاحیت کو سبھی مقامات پر محسوس کیا جا رہا تھا۔ لہٰذا ۳ رستمبر ۱۹۲۸ء کو انھیں بھی نہرو کمیٹی میں شامل کر لیا گیا تھا(۱۰۱)۔ نہرو کمیٹی کے فیصلے کو لکھنؤ کی کل جماعتی کانفرنس میں منظور کیا جا چکا تھا۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کے کانگریس اجلاس میں کل جماعتی کانفرنس کی رپورٹ پر غور و خوض کیا گیا۔ کل جماعتی فیصلوں کی بنیاد پر اس کانگریس نے بھی نہرو رپورٹ کا استقبال کرتے ہوئے اسے ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے میں بہت ہی معاون مانا(۱۰۲)۔ یہاں بھی جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس نے مکمل آزادی کی بات منظور کرنے پر زور دیا تھا لیکن گاندھی جی، جنھوں نے ۱۹۲۷ء میں مدراس میں مکمل خودمختاری کے نصب العین کے اعلان کیے جانے پر اسے ایک ایسا فیصلہ بتایا تھا جس پر ہم عمل کرنے سے قاصر ہیں، وہ اب بھی اس کے لیے تیار نہیں تھے کہ مکمل آزادی کو منظور کیا جائے(۱۰۳)۔ لہٰذا گاندھی جی نے اس سلسلے میں ایک تجویز رکھی۔ مسٹر سبھاش چندر بوس و پنڈت جواہر لال نہرو نے مکمل خودمختاری پر زور دیتے ہوئے اس میں کچھ ترمیم پیش کی۔ جواہر لال نہرو و سبھاش چندر بوس دونوں کی ترمیمات لگ بھگ ایک جیسی تھیں۔ جواہر لال نے مکمل خودمختاری کے سلسلے میں یہ ترمیم

پیش کی تھی کہ ''یہ کانگریس مدراس کانگریس کے مکمل آزادی کے فیصلے پر اٹل ہے اور اس کی یہ رائے ہے کہ جب تک برطانیہ سے قطع تعلق نہ ہوگا تب تک حقیقی آزادی نہیں ملے گی (۱۰۴)۔

اس ٹکراؤ کا خاتمہ مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس کے درمیان ایک سمجھوتے سے ہوا۔ اس میں یہ منظور کیا گیا کہ اگر حکومت برطانیہ اس سال کے اندر نہرو رپورٹ کو مان لیتی ہے اور ہندوستان کو نوآبادیاتی سوراج دے دیتی ہے تو ٹھیک ہے، نہیں تو ایک سال کے بعد کانگریس مکمل آزادی کو ہی اپنا نصب العین مان لے گی اور اس کے لیے کام کرے گی (۱۰۵)۔

انگریزی حکومت ہندوستانیوں کی خواہشات کی جانب سے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ اس وقت صرف کانگریس ہی نہیں بلکہ انگریزوں کے حمایتی سمجھے جانے والے راجہ مہاراجہ بھی ملک میں ایک ذمہ دار حکومت کی حمایت کرنے لگے تھے جیسا کہ بیکانیر کے مہاراجہ نے ایک اخباری رپورٹر سے کہا تھا کہ ''آج کل باشندگان ملک کی یہ سب سے پُرزور خواہش ہے اور اس کو کوئی ٹال بھی نہیں سکتا کہ انھیں ذمہ دار حکومت حاصل ہو۔ وہ آزاد قوم سمجھے جائیں، انھیں اس وجہ کر کسی کے آگے خود کو کمتر نہ سمجھنا پڑے'' (۱۰۶)۔ لیکن سرکار عوام کے جذبات کو مسلسل نظرانداز کر رہی تھی۔ کانگریس کے ذریعہ نہرو رپورٹ کی شکل میں عوام کی خواہش کا اظہار کرنے پر بھی سرکار کی آنکھیں نہیں کھلیں اور اس نے نہرو رپورٹ یا کلکتہ کانگریس کے ذریعہ اسے منظور کر لینے کے فیصلے پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ اسے نظرانداز کرنے پر تلی رہی کیوں کہ اس میں ہندو مسلم مسائل کے حل کی نئے سرے سے کوشش کی گئی تھی جب کہ انگریز سرکار کی کوشش ابتدا سے ہی ملک میں ہندو مسلم کے درمیان دوری بنائے رکھنے اور اسے مزید بڑھاوا دینے کی تھی۔ اس نقطۂ نظر سے انگریز ہندوستان میں حکومت کرتے تھے، جیسا کہ لارڈ اولیویر پہلے ہی قبول کر چکے تھے (۱۰۷)۔ حکومت عوام اور کانگریس کو الجھائے رکھنا چاہتی تھی اور کوئی فیصلہ نہیں ہوتا تھا۔ وائسرائے نے یکم نومبر ۱۹۲۹ء کو ایک اعلان کر کے سبھی سیاسی لیڈران کے ساتھ گول میز کانفرنس کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ۲رنومبر کو کانگریس نے اس میں شامل ہونے کے لیے مطالبہ کیا کہ اس میں خاص خاص سیاسی جماعتوں کو پوری نمائندگی دی جائے ان سب میں انگریزی کانگریس کے نمائندوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو۔ ماہ دسمبر میں ۲۳رتاریخ کو گاندھی جی، موتی لال نہرو،

مرکزی اسمبلی کے چیئرمین وٹھل بھائی پٹیل، تیج بہادر سپرو اور محمد علی جناح کے ساتھ وائسرائے کی گفتگو ہوئی لیکن گول میز کانفرنس اور نوآبادیاتی سوراج کے سلسلے میں بات چیت ہونے کے بعد بھی کوئی کامیاب نتیجہ نہیں نکلا (۱۰۸)۔ لہٰذا ان سب کا انجام یہ ہوا کہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو کانگریس نے لاہور کے اجلاس میں جواہر لال نہرو کی صدارت میں ایک تجویز پاس کر کے مکمل آزادی کو اپنا نصب العین مقرر کر دیا۔ اب کانگریس پچھلے شکوک یا حکومت سے سمجھوتہ ہونے کے امکانات کے غیر معین و غیر مستحکم راستے سے ہٹ کر ایک معیّن اور مستحکم مقصد کی تکمیل کا فیصلہ کر کے آگے بڑھ گئی۔

خلاصہ

تحریک عدم تعاون کے پہلے دور کے اختتام کے بعد ملک میں جو فرقہ وارانہ عدم استحکام کی فضا تھی، مولانا آزاد اسے ختم کرنے کے لیے کھل کر سامنے آئے۔ رویندر ناتھ ٹیگور نے فرقہ وارانہ مسائل کے حل سے متعلق کہا تھا کہ ''ہندو مسلم مسائل کے لیے اندر سے کام کرنا ہوگا ... یہ دونوں فرقے اپنی اقتصادی حالت سدھارنے کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کریں، اس سے پیدا شدہ اتحاد دیرپا و دائمی ہوگا'' (۱۰۹)۔ مولانا آزاد کے کام کرنے کا طریقہ بھی اسی انداز کا تھا وہ فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے مختلف تنظیموں کے توسط سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لانا چاہتے تھے۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اقتصادی حالت کے سدھار سے مسائل کا سلجھانا زیادہ آسان ہوگا۔ اسی لیے انھوں نے گاندھی جی کے چرخہ آندولن کا مسلمانوں کے درمیان پرچار کیا اور سودیشی کے پرچار کو خلافت تحریک کے ساتھ جوڑ دیا۔ انھوں نے ہی ۱۹۲۵ء میں خلافت کمیٹی سے اپیل کی تھی کہ وہ قومی پروگراموں میں کانگریس سے تعاون کرے۔ انھی کی صدارت میں خلافت کمیٹی نے یہ تجویز منظور کی تھی کہ مسلمان کانگریس کے ''کتائی سنگھ'' میں شامل ہوں گے (۱۱۰)۔ مولانا آزاد قومی کام کی راہ میں کسی طرح کی کوئی رکاوٹ قبول نہیں کر سکتے تھے خواہ وہ کسی جانب سے اور کسی بھی وجہ سے کیوں نہ ہو۔ وہ ان رکاوٹوں کو ہر حال میں ختم کرنا چاہتے تھے۔ جب ہندو مہاسبھا نے ۱۹۲۶ء میں ہندو مفاد کی حفاظت کے لیے شدھی و سنگٹھن کی تجویز پاس کی اور مسلمانوں کو ہندو بنانے کی مانگ کی تھی تو بدلے میں خلافت کانفرنس میں بھی ہندوؤں

کومسلمان بنانے کی مانگ کی گئی اور مولانا محمد علی تو گاندھی جی کو بھی مسلمان بنانے کی بات کہنے لگے تھے۔ خلافت کانفرنس میں اس طرح کی اشتعال انگیز تجاویز و تقاریر کے سامنے آنے کی وجہ کر مولانا آزاد نے جان بوجھ کر اس کے کانفرنسوں و بیٹھکوں میں حصہ لینا چھوڑ دیا تھا(۱۱۱)۔ انھوں نے ہمیشہ ہی اس بات کی کوشش کی تھی کہ دونوں فرقوں کے جھگڑے اس طرح سلجھائے جائیں کہ قومی کاموں میں رکاوٹ نہ آئے بلکہ انھیں رفتار حاصل ہوتی رہے۔ مذہبی اختلاف کو انھوں نے سیاست کے ساتھ جوڑ کر دیکھنا شروع کیا تھا۔ اسی لیے وہ مانتے تھے کہ فساد آزادی کی راہ کا روڑا ہے اور ہندوستان کی نجات کے لیے اتحاد بہت ضروری ہے(۱۱۲)۔ ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ اور حصول آزادی کے لیے انھوں نے ہر ممکن ایثار کیا۔ وہ سبھی مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ ان کی نگاہ واضح، افکار و خیالات سلجھے ہوئے، فیصلے منصفانہ اور ذات ہر جہت سے غیر جانبدارانہ تھی۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے کبھی اپنے خیالات میں تبدیلی نہیں کی۔ اسی وجہ کر مولانا محمد علی ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ جب مولانا آزاد نے نہرو رپورٹ کی تائید کی تو مولانا محمد علی کی نظر میں یہ کام غلط تھا۔ وہ مانتے تھے کہ مولانا آزاد مسلمانوں کے حق میں کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے مولانا آزاد کے نام ''ابوالکلام'' کا مذاق بنایا اور اپنے اخبار ''ہمدرد'' کے ۱۰ر جنوری ۱۹۲۹ء کے شمارے میں انھوں نے ''ابوالسکوت'' کا نام دیا تھا(۱۱۳)۔ مولانا آزاد کبھی اپنے راہ عمل سے منحرف نہیں ہوئے۔ انھوں نے فرقہ وارانہ فسادات کے ہوتے ہوئے بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کو حصول آزادی کے لیے ایک ساتھ آگے بڑھنے میں تعاون کرنے کی صحت مند ترغیب دینے میں قابل ذکر کامیابی حاصل کی۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے یہ الفاظ ان کے کاموں کا صحیح لیکھا جوکھا پیش کرتے ہیں کہ ''وہ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ اپنے ہم مذہبوں کی تلخ و ترش تنقیدوں کے درمیان بھی وہ ایک غیر متزلزل چٹان کی طرح جمے رہے، ذرا بھی ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ اس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ ملک کے ہر طبقے میں ان کو یکساں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ تمام پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے میں ان کا مشورہ لیا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ بے جھجک، غیر جانبدارانہ اور ٹھوس مشورہ دیتے تھے''(۱۱۴)۔

---

(۶)

تحریک سول نافرمانی اور کانگریسی کابینہ

(۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۹ء)

کلکتہ کانگریس میں انگریزی حکومت کو ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء تک کا وقت دیا گیا تھا کہ وہ یا تو اس دوران نو آبادیاتی اقتدار دینا قبول کر لے یا اس کے بعد مکمل خود مختاری دینے کے لیے تیار رہے۔ برٹش سرکار نے اس پر بھی اپنی خموشی نہیں توڑی۔ ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو وائسرائے کے ساتھ گاندھی جی، موتی لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو وغیرہ کی ملاقات کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لہٰذا دسمبر کے آخر میں لاہور کے کانگریس اجلاس میں ایک تجویز پاس کر کے مکمل خود مختاری کو کانگریس کا نصب العین قرار دے دیا گیا تھا۔ اسمبلی کے ممبران کو قانون ساز اسمبلی کا بائیکاٹ کرتے ہوئے ایوان چھوڑ دینے کی ہدایت کی گئی تھی(۱)۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء کی آدھی رات کو راوی ندی کے کنارے ترنگا جھنڈا لہرا کر کانگریس کے ذریعہ ہندوستان کی خود مختاری کا اعلان کر دیا گیا۔ حکومت کے خاموش رہنے کی وجہ کر ۲ر جنوری ۱۹۳۰ء کو کانگریس کی مجلس عاملہ کی ایک بیٹھک میں کاؤنسل کے بائیکاٹ پر عمل کرنے اور ۲۶ر جنوری کو ملک بھر میں مکمل یوم خود مختاری منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس دن کی تقریبات میں عوام کو سنانے کے لیے ایک اعلانیہ تیار کیا گیا، جس میں کہا گیا تھا کہ:

> ''ہم ہندوستانی لوگ بھی دوسری قوموں کی طرح اپنا پیدائشی حق مانتے ہیں کہ ہم آزاد ہو کر رہیں، اپنی محنت کا پھل ہم خود کھائیں اور ہمیں زندگی گزارنے کے لیے ضروری سہولتیں حاصل ہوں جن سے ہمیں بھی ترقی کا پورا موقع ملے۔ ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اگر کوئی سرکار یہ حق چھین لیتی

ہے اور عوام کو ستاتی ہے تو عوام کو اس سرکار کو بدل دینے یا مٹا دینے کا بھی حق ہے۔ انگریزی حکومت نے نہ صرف یہ کہ باشندگان ملک کی آزادی سلب کر رکھی ہے بلکہ اس کی بنیاد ہی غریبوں کے خونی استیصال پر ہے اور اس نے معاشی سیاسی، تہذیبی و روحانی طور پر ہندوستان کو برباد کر دیا ہے، لہٰذا ہمارا حق بنتا ہے کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلا کر مکمل خود مختاری یا آزادی حاصل کر لی جائے''۔

ہندوستان کی اقتصادی بربادی ہو چکی ہے۔ عوام کی آمدنی کو دیکھتے ہوئے اس سے بے حساب ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ ہماری روزانہ اوسط آمدنی سات پیسے ہے اور ہم سے جو ٹیکس لیے جاتے ہیں ان کا ۲۰ فیصدی کسانوں سے لگان کی شکل میں اور ۳ فیصدی غریبوں سے نقد کی صورت میں وصول کیا جاتا ہے۔

ہاتھ کتائی وغیرہ جیسی دیہی صنعتیں برباد کر دی گئی ہیں اس سے سال میں کم از کم چار مہینے کسان لوگ بیکار رہتے ہیں۔ دستکاری جاتے رہنے سے ان کی عقل بھی کمزور پڑ گئی ہے اور جو صنعتیں برباد کر دی گئی ہیں ان کی جگہ پر دوسرے ملکوں کی طرح کوئی نئی صنعت قائم نہیں کی گئی ہے۔

چنگی اور سکّے کا نظم اس طرح کیا گیا ہے کہ اس سے کسانوں کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔ ہمارے ملک میں باہر کا مال زیادہ تر انگریزی کارخانوں سے آتا ہے۔ چنگی کے محصول سے انگریزی مال کے ساتھ صاف طور پر جانبداری برتی جاتی ہے۔ اس کی آمدنی کا استعمال غریبوں کا بوجھ ہلکا کرنے میں نہیں کیا جاتا بلکہ ایک نہایت ہی فضول خرچ حکومت کو قائم رکھنے میں کیا جاتا ہے۔ تبادلے کی شرح بھی ایسے من مانے ڈھنگ سے متعین کی گئی ہے کہ جس سے ملک کا کروڑوں روپیہ باہر چلا جاتا ہے۔

سیاسی نقطۂ نظر سے ہندوستان کا درجہ جتنا انگریزوں کے زمانے میں گھٹا ہے اتنا پہلے کبھی نہیں گھٹا تھا۔ کسی بھی سدھار اسکیم کے ذریعہ عوام کے ہاتھوں میں حقیقی سیاسی طاقت نہیں آئی ہے۔ ہمارے بڑے سے بڑے آدمی کو غیر ملکی اقتدار کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ اپنی رائے آزادی سے ظاہر کرنے اور آزادی سے ملنے جلنے کے ہمارے حقوق چھین لیے گئے ہیں۔ ہماری ملکی انتظامی صلاحیت و ذہانت ماری گئی ہے اور عوام الناس کو گاؤں کے

چھوٹے چھوٹے عہدوں اور منشی گیری پر صبر کرنا پڑتا ہے۔

تہذیبی لحاظ سے نظام تعلیم نے ہماری جڑ ہی کاٹ دی اور ہمیں جو تعلیم دی جاتی ہے اس سے ہم اپنی غلامی کی زنجیروں کو ہی پیار کرنے لگے ہیں۔

روحانی طور پر غور کریں تو ہمارے ہتھیار چھین کر ہمیں نامرد بنا دیا گیا ہے۔ غیر ملکی فوج ہماری چھاتی پر سدا موجود رہتی ہے۔ اس نے ہمارے مقابلے کے جذبات کو بری طرح کچل کر رکھ دیا ہے نیز ہمارے دلوں میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ نہ ہم اپنا گھر سنبھال سکتے ہیں اور نہ غیر ملکی حملوں سے ملک کا دفاع کر سکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں چور، ڈاکو اور بدمعاشوں کے حملوں سے بھی ہم اپنے بال بچوں اور جان و مال کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ جس حکومت نے ہمارے ملک کو اس طرح تباہ و برباد کیا ہے اس کے ماتحت رہنا ہماری رائے میں انسان اور خدا دونوں کے تئیں جرم ہے۔ لیکن ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ ہمیں تشدد کے ذریعہ آزادی نہیں ملے گی۔ اس لیے ہم برٹش سرکار سے حتی الامکان کسی بھی طرح کا تعاون نہ کرنے کی تیاری کریں گے اور سول نافرمانی کے ساتھ ساتھ عدم ادائیگی ٹیکس تک کا بیڑا اٹھائیں گے ہمارا یقین کامل ہے کہ اگر ہم برضا و رغبت ترک تعاون کر سکے نیز اشتعال دلانے پر بھی پُرتشدد ہوئے بغیر ٹیکس دینا بند کر سکے تو اس غیر انسانی حکومت کی بربادی طے ہے۔ لہٰذا ہم حلفیہ عہد کرتے ہیں کہ مکمل قیام خود مختاری کے سلسلے میں کانگریس وقتاً فوقتاً جو احکام صادر کرے گی ہم اس کی بجا آوری کرتے رہیں گے(۲)۔

وائسرائے اور قومی لیڈران کی جو گفتگو گزشتہ دسمبر میں ہوئی تھی، اس میں وائسرائے نے گول میز کانفرنس پر زور دیا تھا۔ ۲۵ر جنوری ۱۹۳۰ء کو وائسرائے نے مرکزی اسمبلی میں ایک بیان دے کر ہندوستانیوں کی خواہشات پر پانی پھیرتے ہوئے کہا کہ برٹش سرکار جو کاؤنسل بلائے گی وہ فی الحقیقت وہی چیز نہیں ہے جو ہندوستانی چاہتے ہیں(۳)۔ گاندھی جی نے اس پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے ''ینگ انڈیا'' میں لکھا ہے کہ ''بھارت کے کسان کو جب اپنی بری حالت کا مکمل علم ہو جائے گا اور وہ سمجھ جائے گا کہ یہ قسمت کی وجہ کر نہیں ہوئی ہے، موجودہ حکومت کی وجہ کر ہوئی ہے تو منظم ہو کر اٹھ بیٹھے گا اور بیقرار ہو کر ایک ہی جھونک میں قانونی و غیر قانونی ہی نہیں، تشدد و عدم تشدد کا بھی فرق بھول جائے گا(۴)۔ کانگریس کے فیصلے کے مطابق ۲۶ر جنوری کو سارے ملک میں نہایت ہی جوش و

خروش کے ساتھ (سوراج دیوس) یوم جمہوریہ منایا گیا۔ وائسرائے کی تقریر کی مخالفت میں مدن موہن مالویہ اور بٹھل بھائی پٹیل نے اسمبلی کی رُکنیت سے استعفیٰ دے دیا(۵)۔

سول نافرمانی کا آغاز

۲۶ر جنوری کے اعلان نامے کی بنیاد پر ۱۴ سے ۱۶ر فروری ۱۹۳۰ء کو سابرمتی میں کانگریس مجلس عاملہ کی بیٹھک ہوئی اس میں تجویز پاس کی گئی جس کے مطابق عدم تعاون کی حمایت میں اتفاق ظاہر کرتے ہوئے گاندھی جی اور عدم تشدد میں یقین رکھنے والے ان کے ساتھیوں کو سول نافرمانی جاری کرنے کا اختیار دیا گیا۔ ساتھ ہی لیڈروں کی گرفتاری ہونے پر عوام کو تحریک جاری رکھنے کے لیے اپنی اہلیت و صلاحیت کے مطابق کام کرنے کا اختیار بھی دیا گیا(۶)۔ گاندھی جی نمک بنا کر سول نافرمانی تحریک کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے ڈانڈی مارچ کا پروگرام طے کیا گیا۔ ۱۲ر مارچ کو ''ڈانڈی مارچ'' کے ساتھ ہی ملک میں ''سول نافرمانی تحریک'' شروع ہوگئی(۷)۔ مسلمانوں کو کانگریس کی تحریک سے الگ رکھنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ مولانا آزاد اس تحریک کو پوری طرح کامیاب بنانا چاہتے تھے۔ مسلمان اس تحریک سے الگ نہ رہ جائیں، اس لیے انھوں نے احمد آباد میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ایک بیٹھک میں یہ مشورہ دیا کہ جو مسلمان قومی خیالات کے حامل ہیں ان کا پورا وقت پروپیگنڈہ کے کاموں میں صرف کیا جائے۔ اس کام میں ہونے والے اخراجات کی ذمہ داری مسٹر جمنا لال بجاج پر ڈالی گئی تھی(۶)۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی اس مشورے پر عمل کرنے کا تہیہ کر چکی تھی، لیکن گاندھی جی اس کام سے متفق نہ ہو سکے۔ انھوں نے مسٹر جمنا لال بجاج کو لکھا کہ ''یہ انتظام ٹھیک نہیں رہے گا اور اس طرح کی اشتعال انگیز تحریک سے فائدے کی جگہ نقصان ہونے کا ڈر زیادہ رہے گا''۔ گاندھی جی نے نقصان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ ہم لوگوں کا سچا ہمدرد ہی صحیح آندولن کر سکے گا۔ ورنہ اس طرح کے آندولن سے جوابی آندولن کا امکان ہے اور اس سے دشمنی میں بھی مزید اضافہ ہو سکتا ہے(۱۰)۔ خود جمنا لال بجاج کو بھی یہ اندیشہ تھا کہ کہیں اس کا برا انجام تو نہیں ہوگا؟(۱۱) گاندھی جی کے غیر متفق ہونے کی وجہ کر یہ نظم نہیں کیا جا سکا۔ کئی مسلم رہنما کافی دنوں سے کانگریس کی پالیسیوں کے خلاف مسلمانوں کو بھڑکا رہے تھے اور انھیں کانگریس کے جلسوں

میں حصہ نہ لینے کے لیے راغب کر رہے تھے۔ مولانا آزاد دوسرے کئی مسلم لیڈروں کے ساتھ مل کر کانگریس مخالف پروپیگنڈے کی مذمت کرتے چلے آرہے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر انصاری وغیرہ کے ساتھ مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ مسلمانوں کو علیحدگی کی نقصان دہ پالیسی سے ہوشیار رہنا چاہیے کیوں کہ آزادی کے لیے قومی لڑائی سے الگ رہنا اور اس طرح نوکر شاہی کے ہاتھ مضبوط کرنا مسلمانوں کی شان و شوکت اور اسلامی روایت کے خلاف ہے(۱۲)۔

گاندھی جی ابھی سابرمتی آشرم سے ڈانڈی تک کے سفر کی مہم کا آغاز بھی نہیں کر پائے تھے کہ آنے والی تحریک کے لیے لوگوں میں بیداری پھیلانے کا کام کر رہے سردار ولبھ بھائی پٹیل کو راس گاؤں میں مارچ کے پہلے ہفتے میں گرفتار کر لیا گیا اور چار ماہ کی سزا دے دی گئی(۱۳)۔ گاندھی جی ۱۲ر مارچ کو ''ڈانڈی مارچ'' پر نکل پڑے۔ ۲۱ر مارچ کو کل ہند کانگریس کمیٹی کی بیٹھک میں صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو بھی سول نافرمانی جاری کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ ۵ر اپریل کو گاندھی جی نے ڈانڈی میں سمندر کے کنارے نمک بنا کر قانون کی خلاف ورزی کر دی(۱۴)۔ اس کے ساتھ ہی سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز ہو گیا۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ مسلمان بھی جوش و خروش سے اس تحریک میں شامل ہوں لہٰذا انھوں نے کچھ لیڈروں کے ساتھ مسلمانوں سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت ساری دنیا کی نظر ہندوستان کے اوپر لگی ہوئی ہے۔ لوگ مہاتما گاندھی کے اس جہاد کی طرف پُرامید نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اگر مسلمانوں اور ان کے لیڈروں نے مہاتما گاندھی کا ساتھ اس موقع پر نہیں دیا تو ساری دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ جو لوگ یہ بات کہتے ہیں کہ آجکل کا آندولن مسلمانوں کے خلاف ہے، وہ سخت غلطی کر رہے ہیں۔ اس لیے ہر ایک مسلمان بھائی کو اس جہاد میں فوراً شامل ہونا چاہیے(۱۵)۔

ملک میں غیر معمولی جوش و خروش پھیلا ہوا تھا ملکی اشیاء کے استعمال اور غیر ملکی مال کے بائیکاٹ کا پروپیگنڈہ ہو رہا تھا۔ گاندھی جی کے ذریعہ نمک بنانے کی حمایت میں سارے ملک میں جلسے ہو رہے تھے۔ ۲۰ر اپریل ۱۹۳۰ء کو دلّی میں ''ہندوستان ٹائمز'' کے ایڈیٹر مسٹر جے. این. سہانی کی صدارت میں ایک عوامی جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں مولانا آزاد نے عوام الناس کو حکومت سے زیادہ طاقتور بتاتے ہوئے کہا کہ گرچہ ملک میں آج لاکھوں آدمی قانون کی

خلاف ورزی کر رہے ہیں لیکن ان میں سے صرف کچھ ہی لوگوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ستیہ گرہ کے ہتھیار کا مقابلہ حکومت کی طاقت سے باہر ہے(۱۶)۔ ۳۰؍اپریل کو انھوں نے وٹھل بھائی پٹیل کے ساتھ الہ آباد کا دورہ کیا اور سول نافرمانی کی حمایت میں بیان دیا(۱۷)۔ ۲۷؍جون کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے پریاگ کی بیٹھک میں سارے ہندوستان کے طلبا سے اس جنگ میں حصہ لینے کی گزارش کی۔ کانگریس کی سرگرمیاں دیکھ کر حکومت نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا(۱۸)۔ سول نافرمانی تحریک، ملک گیر شکل اختیار کر رہی تھی۔ ۳۱؍جولائی سے یکم اگست تک بمبئی میں سردار پٹیل کی صدارت میں ''غیر ملکی کپڑوں کا بائیکاٹ'' اور ''عدم تعاون'' کو پوری طرح اپنانے کی تجویز پاس کی گئی۔ مولانا آزاد بھی اس بیٹھک میں موجود تھے(۱۹)۔ تحریک کی تیزی کے دوران حکومت و کانگریس کے بیچ سمجھوتے کے امکان پر ۱۳؍سے ۱۵؍اگست ۱۹۳۰ء تک کانگریس کے لیڈران اور حکومت کی طرف سے سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر ایم۔ آر۔ جیکر کے درمیان تبادلۂ خیال ہوا، لیکن برٹش سرکار کے ذریعہ ہندوستان کی ''حصول آزادی'' اور ''قومی حکومت کے قیام'' کا مطالبہ منظور نہ کیے جانے سے یہ گفتگو ناکامیاب ہوگئی(۲۰)۔

نمک ستیہ گرہ کو چلانے کے لیے کانگریس نے طے کیا تھا کہ گاندھی جی ستیہ گرہ کے ڈکٹیٹر ہوں گے۔ ایک ڈکٹیٹر کی گرفتاری کے بعد وہ ڈکٹیٹر کسی دوسرے شخص کو نامزد کر دیا کرتا تھا تاکہ تحریک کا کام نہ رُکے۔ اس ترتیب میں سردار پٹیل کی گرفتاری پر مولانا آزاد ڈکٹیٹر بنائے گئے تھے(۲۱)۔ انھوں نے کانگریس کے مستقل سکریٹری مسٹر راجہ رام کو ۲۶؍اگست کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کی بیٹھک دہلی میں بلانے کا حکم جاری کیا(۲۲)۔ اس دوران میرٹھ میں ایک باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں مولانا آزاد کو ۲۸؍اگست ۱۹۳۰ء کو کلکتہ میں گرفتار کر لیا گیا اور میرٹھ جیل میں رکھا گیا۔ اس جرم میں انھیں ۶ ماہ کے لیے قید کی سزا ہوئی(۲۳)۔

انگلینڈ میں پہلی گول میز کانفرنس ۱۲؍نومبر ۱۹۳۰ء سے ۱۹؍جنوری ۱۹۳۱ء تک ہوئی۔ گول میز کانفرنس میں کانگریس نے حصہ نہیں لیا تھا۔ اس وقت سبھی کانگریسی لیڈران نظر بند تھے۔ اس کانفرنس کے بعد ۲۶؍جنوری کو کانگریس مجلس عاملہ کے ۲۷ ممبر رہا کر دیے گئے تاکہ کانگریس اور سرکار کے درمیان کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے سازگار ماحول کی تشکیل کی

جاسکے(۲۴)۔ کانگریس نے وائسرائے سے گفتگو کرنے کے لیے گاندھی جی کو سارے اختیارات سونپ دیے۔ ۵؍مارچ ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی اور وائسرائے لارڈ ارون میں ایک سمجھوتہ ہوا۔ جواہر لال کے علاوہ کانگریس مجلس عاملہ کے سبھی ممبران اس سمجھوتے سے خوش تھے(۲۵)۔ گاندھی۔ ارون پیکٹ کی وجہ کر ''سول نافرمانی تحریک'' ملتوی کر دی گئی۔ تحریک کے ملتوی ہو جانے پر مولانا آزاد دوسرے سماجی کاموں میں مشغول ہو گئے۔ مارچ۔ اپریل ۱۹۳۱ء میں کانپور میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ اس میں فرقہ وارانہ اخوت قائم کرنے کی کوشش میں مشہور صحافی مسٹر گنیش شنکر ودیارتھی کی موت ہوگئی۔ اس حادثے پر مولانا آزاد نے کئی ایک قومی لیڈروں کے ساتھ فرقہ وارانہ اخوت کے قیام کے مقصد سے ایک اپیل جاری کی۔ اس اپیل سے مسٹر گنیش شنکر ودیارتھی کی موت پر اظہارِ غم کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ''ہمیں یقین ہے کہ ہمارے درمیان اختلافات سے زیادہ معاملے آپسی مفادات نیز باہمی اختلاط و ارتباط کے موجود ہیں جن میں بطور خاص معاشی زندگی میں ہمارے لیے الگ رہنا غیر ممکن ہے، جو دونوں فرقوں کو الگ کرتا ہے وہ اپنا ہی دشمن ہے اور اس سے دشمن جیسا ہی سلوک کیا جانا چاہیے۔ ایسے حالات میں مسلمان بھائیوں کو بچانا ہندو اپنے وقار کا مسئلہ بنائیں اور ہندوؤں کی حفاظت کو مسلمان اپنے وقار کا مسئلہ بنالیں اور اس طرح باہمی تعاون سے حقیقی اتحاد کی بنیاد ڈالیں''(۲۶)۔

دوسری گول میز کانفرنس

گاندھی۔ ارون معاہدہ ہونے سے سول نافرمانی تحریک ملتوی کر دی گئی تھی۔ اس معاہدے کے فوراً بعد سردار پٹیل کی صدارت میں کراچی کانگریس نے یہ معاہدہ منظور کرتے ہوئے، دوسری گول میز کانفرنس کے لیے گاندھی جی کو کانگریس کے نمائندہ وفد کا سربراہ مقرر کیا۔ لارڈ اِروِن کے جانشیں لارڈ ویلنگڈن کے اقتدار میں آتے ہی سول سروس کے ممبران اور خود وائسرائے نے گاندھی۔ اِرون معاہدے کی شرطوں کو پورا کرنے میں آنا کانی شروع کردی۔ اس پر گاندھی جی نے سرکار کے ہوم سکریٹری مسٹر ایمرسن، صوبہ متحدہ کے گورنر سر مالکم ہیلی اور بمبئی سرکار کو خط لکھ کر حکومت ہند کے ذریعہ معاہدے کی شرطوں کی خلاف ورزی کی جانب توجہ مبذول کرائی لیکن نہ تو خطوط کا اطمینان بخش جواب ملا اور نہ ہی خلاف ورزی

بند ہوئی۔ لہٰذا گاندھی جی نے گول میز کانفرنس میں نہ جانے کا فیصلہ لے کر ۱۳ر اگست ۱۹۳۱ کو بذریعہ تار وائسرائے کو اس کی اطلاع دے دی (۲۷)۔ اس حالت میں مہاتما گاندھی، سردار پٹیل اور جواہر لال نہرو کے دوست سر پر بھا شنکر پٹنی کی ثالثی سے مسئلے کو سلجھایا گیا اور ۲۹ر اگست کو گاندھی جی بمبئی سے بذریعہ جہاز لندن روانہ ہوگئے۔ گول میز کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والے مسلم سربراہان کی وجہ کر کانگریس کو کوئی کامیابی نہیں مل سکی (۲۸)۔ ۱۴ر ستمبر سے یکم دسمبر ۱۹۳۱ء تک چلنے والا یہ اجلاس بھی ہندوستانی مسائل کے حل میں ناکامیاب رہ کر ختم ہوگیا۔ اجلاس کی ناکامی کے بعد گاندھی جی نے ہندوستان لوٹنے سے متعلق سردار پٹیل سے مشورہ طلب کیا۔ سردار پٹیل نے ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے تبادلۂ خیال کیا۔ ڈاکٹر انصاری کا کہنا تھا کہ گاندھی جی کے وہاں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا لہٰذا انھیں دسمبر کے پہلے ہفتے تک ہندوستان لوٹ آنا چاہیے، لیکن مولانا آزاد اس سلسلے میں گاندھی جی کو آزاد چھوڑ دیے جانے کے حق میں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ گاندھی جی کو اپنا پروگرام طے کرنے میں آزاد چھوڑ دینا ہی مناسب ہے (۲۹)۔

دوبارہ سول نافرمانی

گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد لارڈ ویلنگڈن نے سرکاری ظلم و جبر کی شروعات کر دی۔ وہ دو ہفتوں میں کانگریس کو ختم کر دینا چاہتے تھے (۳۰)۔ گاندھی جی نے ۲۸ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو ہندوستان واپس آکر فوراً ہی وائسرائے سے بات چیت کرنا چاہا لیکن وائسرائے نے بات چیت کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ ۱۴ر جنوری ۱۹۳۲ء سے حکومت نے کانگریس پر حملہ شروع کر دیا۔ گاندھی جی، سردار پٹیل وغیرہ لیڈران قید کر لیے گئے (۳۱)۔ اس کے ساتھ ہی ملک ایک بار پھر تحریک سول نافرمانی کی راہ پر چل پڑا۔ سردار پٹیل کانگریس کے صدر تھے۔ ان کی گرفتاری کے بعد بابو راجندر پرساد کو کارگزار صدر بنایا گیا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی گرفتاری کے بعد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو یہ ذمہ داری سونپی گئی لیکن وہ بھی ۹ر جنوری کو قید کر لیے گئے نیز سرکار نے کانگریس کو غیر قانونی تنظیم قرار دے دیا۔ تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے ملک بھر میں جگہ جگہ پر دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی (۳۲)۔ حکومت جتنی سنگدل اور مطلق العنان ہوتی جا رہی تھی کانگریس کا حوصلہ اتنا ہی بڑھتا جا رہا

تھا۔ ایک شخص کے گرفتار ہونے کے بعد دوسرا شخص اس کی جگہ لے لیتا تھا۔ ڈاکٹر انصاری کی گرفتاری کے بعد شاردل سنگھ کویشار کارگزار صدر بنائے گئے۔ ۱۵ر فروری کو ان کی گرفتاری کے بعد مولانا آزاد کارگزار صدر بنائے گئے لیکن حکومت بنگال نے مولانا آزاد پر ایک ماہ تک سول نافرمانی تحریک میں حصہ لینے پر پابندی لگا دی (۳۳)۔ مولانا آزاد اس سے گھبرانے والے نہیں تھے۔ انھوں نے تحریک میں مزید تیزی لانے اور اسے مؤثر بنانے کے لیے ۸ر مارچ ۱۹۳۲ء کو سبھی صوبائی کارکنان کے نام ایک سرکلر جاری کیا۔ سرکلر میں مظاہروں کی اہمیت سمجھاتے ہوئے نیز سبھی کانگریسی کارکنان سے آندولن میں ہونے والے مظاہروں کو مؤثر بنانے کی اپیل کرتے ہوئے انھیں ہدایت دی گئی تھی کہ:

(۱) چھوٹے پیمانے پر روزانہ مظاہرے کیے جائیں اور ہفتے میں ایک بار یا دو ہفتے میں ایک بار بڑے پیمانے پر مظاہرے کیے جائیں۔

(۲) ''جیل بھرو تحریک'' کو بنائے رکھا جائے۔ سارے پروگرام و تدابیر اور ان پر عمل درآمد اس طرح ہونے چاہئیں کہ باقاعدہ طور پر کچھ لوگ جیل جائیں نیز مقامی سطح کی اہم شخصیتیں بھی جیلوں میں جائیں۔ یہ سوچنا ایک بھول ہوگی کہ عقلمند اور اہم لوگوں کو کسی آنے والے مشکل وقت کے لیے محفوظ رکھا جائے۔

(۳) کسی بھی حالت میں پیرول کو قبول نہ کیا جائے۔ ایسا کرنا ہمارے مفاد کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس سے متعلقہ شخص کی بے عزتی کے ساتھ ہی دیگر کارکنان کے اندر عدم حوصلگی پیدا ہوتی ہے اور سول نافرمانی کی بنیاد میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے (۳۴)۔

مولانا آزاد کے ذریعہ سرکاری احکام کی اس کھلی خلاف ورزی کو دیکھ کر حکومت خاموش نہیں رہ سکی اور ''ایمرجینسی پاور آرڈی نینس'' کی دفعہ ۳ کے تحت ۱۲ر مارچ ۱۹۳۲ء کو مولانا آزاد گرفتار کر لیے گئے (۳۵)۔ انھوں نے اپنی گرفتاری پر مسز سروجنی نائیڈو کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ ملک کے عوام کا جوش و خروش غیر معمولی تھا۔ کانگریس کا ایک اجلاس دلّی میں ہونا طے کیا گیا اور مدن موہن مالویہ کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ دہلی میں داخل ہوتے وقت وہ گرفتار کر لیے گئے، مسز نائیڈو کو بمبئی چھوڑتے وقت قید کر لیا گیا، پھر بھی احمد آباد کے سیٹھ رنچھوڑ داس امرت لال کی صدارت میں دہلی کے چاندنی چوک میں وقت مقررہ پر کانگریس

کا اجلاس ہوا۔ یہ تاریخی اجلاس دس منٹ میں ختم ہوگیا۔ سیٹھ جی گرفتار کر لیے گئے(۳۶)۔ باوجود اس کے یہ کارروائی حکومت کے منہ پر ایک زبردست طمانچہ تھا۔ گرفتاری کے ٹھیک دو ماہ بعد ۱۱رمئی ۱۹۳۲ء کو مولانا آزاد کو رہا کر دیا گیا(۳۷)۔

فرقہ وارانہ فیصلہ

گول میز کانفرنس میں دیگر موضوعات کے علاوہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسائل پر بھی غور و خوض کیا گیا تھا۔ مہاتما گاندھی انگلینڈ کے وزیر اعظم کے حسب خواہش ان ہی کو اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے پنچ ماننے کو تیار تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ اقلیتوں میں اچھوتوں کو شامل نہ کیا جائے(۳۸)۔

کانفرنس کی ناکامی کے بعد وزیر اعظم ''میکڈونلڈ'' نے ہندوستانی فرقہ وارانہ مسائل کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کیا جسے اگست ۱۹۳۲ء میں شائع کیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ چھوٹی بڑی سب ذات برادریوں کے میل جول اور امن و شانتی کے ساتھ متحدہ طور سے کام کرنے تک کے لیے الگ حلقۂ انتخاب کو قائم رکھنا پڑے گا(۳۹)۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ برٹش سرکار ہندوستانی معاشرے کی تباہی و بربادی چاہتی تھی، کیوں کہ اس کی حکومت کا مقصد ہندوؤں کو کمزور کرنا تھا۔ اس کے خیال سے ہندو ہی انگریزی اقتدار کے قائم رہنے کی مخالفت کرنے والی طاقت تھے۔ اس لیے اس نے پنجاب کے مسلم لیڈر فضل حسین کی پارٹی و مسلم لیڈران اور بھیم راؤ امبیڈکر کی مانگ کو بڑھاوا دینے کی چال چلی تھی(۴۰)۔ اس فیصلے کو لے کر ملک میں مخالفت کی لہر پھیل گئی۔ ملک کی کئی تنظیموں نے اس کی مخالفت میں تجاویز پاس کیے(۴۱)۔ آگے آنے والے دنوں میں بھی مناسب وقت پر اس کی مخالفت کی جاتی رہی۔

مولانا آزاد انگریزی حکومت کے فرقہ وارانہ فیصلے کو صحیح نہیں مانتے تھے۔ انھوں نے مسٹر ایچ. آر. جیکر سے فرقہ وارانہ فیصلے کی جگہ پر ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور دیگر فرقوں کے بیچ ایک نیا سمجھوتہ کرانے کی ضرورت پر زور دیا تھا(۴۲)۔ وہ فرقہ وارانہ فیصلے کو غیر مؤثر بنانے کے لیے کوئی مؤثر قدم اٹھانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم لیڈران فرقہ وارانہ فیصلے کے خلاف ہم خیال ہو جائیں۔ جب مسلم لیڈروں کے اجلاس میں یہ فیصلہ

ہوا کہ دیگر مطالبات منظور ہو جانے پر مسلمان علیحدہ حلقۂ انتخاب کے لیے اصرار نہیں کریں گے تو مولانا آزاد نے مہاتما گاندھی کو اس کی اطلاع دی تھی اور گاندھی جی نے مولانا کی کوششوں کو سراہتے ہوئی ان کی میابی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا۔ مولانا یہ نہیں چاہتے تھے کہ فرقہ وارانہ فیصلے کو لے کر ملک میں کوئی آپسی منافرت پھیلے یا تلخی پیدا ہو۔ لہٰذا کانگریس پر انھوں نے اس بات کے لیے پورا زور دیا کہ ''کمیونل ایوارڈ'' کے خلاف ہندوؤں کی طرف سے کوئی ایجی ٹیشن نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ کوشش کرنی چاہیے کہ باہمی رضامندی سے کوئی بدل پیدا ہو۔ خود مولانا کے مطابق یہی وجہ تھی کہ کانگریس نے تمام ہندو جماعتوں کی مخالفت برداشت کی اور باوجود الیکشن میں پڑنے اور انھیں کے ووٹوں کے غرض مند ہونے کے، اپنے مسلک پر قائم رہی(۴۴)۔ مولانا آزاد قبل سے ہی کسی طرح کے علیحدہ انتخاب کے خلاف تھے۔ کلکتہ کے کل جماعتی اجلاس میں سیٹوں کے ریزرویشن کی مانگ کرنے والے مسلمانوں کو ''بیوقوف'' کہہ کر انھوں نے علیحدہ انتخاب سے متعلق اپنی مخالفت ظاہر کی تھی(۴۵)۔ جس طرح یوپی کے ایم. ایل. سی. سر شفاعت احمد نے ۱۵رنومبر ۱۹۲۷ء کو لندن کے ''ویسٹ منسٹر ہال'' میں ''ہندوستان کے آئندہ آئین میں مسلمانوں کا مقام'' کے موضوع پر بولتے ہوئے ملک کے مفاد میں الگ انتخابی حلقوں کے ختم کیے جانے کو لازمی قرار دیے جانے پر زور دیا تھا(۴۶)۔ اسی طرح مولانا کا بھی یقین تھا کہ متحدہ حلقۂ انتخاب کی وجہ کر اختلافات ختم ہوں گے اور ملک اتحاد کی طرف گامزن ہوگا(۴۷)۔ مسلمانوں کو فرقہ وارانہ فیصلے سے الگ رکھنے کے لیے وہ ہر طرح کی کوششیں کرتے تھے۔ مسلمانوں کے ذریعہ مشترکہ حلقۂ انتخاب کی جگہ پر علیحدہ حلقۂ انتخاب منظور کرنا مولانا آزاد کی نظر میں مسلمانوں کے ذریعہ اپنی عزت بیچنا تھا۔ اسی نظریے سے انھیں اچھوتوں کے بارے میں ڈاکٹر امبیڈکر کا مشترکہ انتخاب کے بدلے ریزرویشن لینے کا رویہ نیلامی بولی سے زیادہ کچھ نہیں لگتا تھا(۴۸)۔ مولانا آزاد فرقہ وارانہ فیصلوں کے امکانی نقصانات سے بے خبر نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ ملک کے لیے فائدہ مند نہیں ہوگا۔ جیسا کہ ۱۹۰۹ء میں جب ''مارلے منٹو اصلاحات'' سے مسلمانوں کو علیحدہ نمائندگی دینے کی بات منظور کی گئی تھی تب ہندوستان کے دورے پر آئے ہوئے برٹش صحافی ''لائینل بریفس'' نے کہا تھا کہ ایسا کرنا سب سے بڑی غلطی ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر انتخاب جداگانہ کا اصول مستقل

طور پر قائم ہوگیا تو ہم ہندوستان میں ذات پات کا نیا طریقہ جاری کرنے کے ذمہ دار ہوں گے اور یہ وہ طریقہ ہوگا جو ہندوستان کی زندگی کو سال بسال گھن کی طرح کھاتا رہیگا۔ جب تک یہ طریقہ جاری رہے گا ہندوستان کبھی بھی قومیت کے لحاظ سے متحد نہ ہو سکے گا اور جتنے عرصے تک یہ قائم رہے گا اتنی ہی مشکلات اس کے استیصال میں پیش آئیں گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آخرکار اندرونی خانہ جنگی اس کا خاتمہ کرے گی(۴۹)۔ مولانا آزاد اسی سے بچنے کی غرض سے مسلمانوں کے لیے مشترکہ حلقۂ انتخاب کی وکالت کرتے تھے۔ مسٹر دین بندھو سی۔ ایف۔ اینڈریوز بھی یہی مانتے تھے کہ مشترکہ انتخاب کا قدم اٹھاتے ہی بنگال اور پنجاب کی کئی مشکلات کا حل نکل آئے گا(۵۰)۔ یہی وجہ تھی کہ گاندھی جی نے فرقہ وارانہ فیصلے کے زیر اثر اچھوتوں اور اونچی ذاتوں کے بیچ بڑھتی خلیج کو پاٹنے کے لیے ''آمرن اُپواس'' شروع کیا تو دین بندھو اینڈریوز نے لندن میں اپنی ساری قوت برٹش سرکار سے اس مفہوم کا ایک عوامی بیان نکلوانے میں لگا دی کہ ''اگر اونچی اور نیچی ذاتوں میں کوئی سمجھوتہ ہو جاتا ہے تو وہ اسے مان لے گی(۵۱)۔ اسی بنیاد پر آگے چل کر برٹش سرکار نے پونہ سمجھوتے کو منظور کیا تھا۔

مولانا آزاد اور جماعتی تنظیم

۱۹۳۲ء میں جیل سے رہائی کے بعد ۱۹۳۷ء تک مولانا آزاد کسی خاص کام میں مشغول نہیں رہے۔ اس دوران وہ پارٹی کے عام پروگراموں میں ایک عام کانگریسی کی طرح سے حصہ لیتے رہے تھے۔

''سول نافرمانی تحریک'' کے دوران کانگریس کے اندر کئی طرح کے اختلافات اٹھتے رہے تھے۔ مولانا آزاد ان اختلافات کو حل کرنے کی جانب نہایت ہی سنجیدگی سے توجہ دیتے تھے۔ ان کا نقطۂ نظر جماعتی اتحاد و ڈسپلن کو بنائے رکھنے کا ہوتا تھا۔ وہ پارٹی کے اہم ممبران میں شمار کیے جاتے تھے۔ ۱۹۳۱ء کے اوائل میں کانگریس میں قومی پرچم کے رنگ کا تنازع زور پکڑ گیا تھا۔ کراچی کانگریس میں سکھوں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا قومی جھنڈے کے رنگ فرقہ وارانہ بنیاد پر مخصوص کیے گئے ہیں؟ لیکن اجلاس میں اس پر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔ پارٹی نے اس کے لیے ایک کمیٹی متعین کی تھی، جس کی رپورٹ جولائی ۱۹۳۱ء سے پہلے مانگی گئی تھی(۵۲)۔ مولانا آزاد کو بھی سردار پٹیل، جواہر لال نہرو، ڈی۔ بی۔ کالیکر، پٹابھی

سیتارمیا، این۔ ایس۔ ہارڈیکر اور ماسٹر تارا سنگھ کے ساتھ اس کمیٹی میں شامل کیا گیا تھا(۵۳)۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی بہت اہم مانتے تھے۔ جب ۱۹۳۳ء کے دوران پنڈت بنارسی داس چترویدی نے ہندو مسلم بھائی چارہ کو بڑھانے والی کچھ چھوٹی موٹی کتابوں کی اشاعت شروع کی تھی تو مولانا آزاد نے انھیں اس کارِ خیر کے لیے مبارکباد دیتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا(۵۴)۔ جماعتی نقطۂ نظر سے اگر وہ کسی بات کو ناپسند کرتے تھے تو اس کی پوری طرح مخالفت کرتے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں جب کانگریس کی مجلس عاملہ میں بنگال کے نمائندے کی شکل میں مولانا آزاد کی موجودگی کو کافی مان لیا گیا تو انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک خط لکھ کر اپنی ناراضگی ظاہر کی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ''میرا خیال ہے کہ آپ نے ورکنگ کمیٹی میں بنگال سے ڈاکٹر رائے کا نام پیش کیا تھا۔ گاندھی جی نے بھی یہی مشورہ دیا تھا، لیکن آپ نے آخری فیصلے میں بنگال کے لیے کوئی جگہ نہیں رکھی۔ میرا فرض یہ تسلیم نہیں کرتا کہ میں بنگال کی نمائندگی کے لیے کافی ہوں۔ مجھے کمیٹی کی ممبری سے علیحدہ کیجیے اور بنگال کے نمائندہ کو منتخب کیجیے۔ یہاں کانگریس کے کاموں کے لیے کوئی آدمی سوائے ڈاکٹر رائے کے نظر نہیں آتا، اور اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ انھیں کام کا موقع دیا جائے''(۵۵)۔ سنہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں انھوں نے اپنا دھیان دو باتوں پر مرکوز رکھا تھا، یکم کانگریس اور عوام کا تعلق جو عوامی تحریک کی غیر موجودگی میں فطری طور پر کم ہو گیا تھا اور دوئم فرقہ وارانہ ہم آہنگی۔ ۱۹۳۵ء کا سال کانگریس کی گولڈن جوبلی کا سال تھا۔ اس بار ۲۸؍دسمبر کو سالگرہ کے موقع سے عید کا تیوہار بھی پڑ رہا تھا۔ مولانا آزاد نے ۹؍دسمبر ۱۹۳۵ء کو کانگریس صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ساتھ مسلمانوں کے نام ایک مشترکہ اپیل جاری کی۔ اس میں گولڈن جوبلی تقریبات میں حصہ لینے کی اپیل کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ عید کی نماز ادا کرنے کے بعد مسلمان گولڈن جوبلی کے پروگراموں میں شامل ہوں۔ ساتھ ہی امید کی گئی تھی کہ مسلمان اس پروگرام میں دوسرے فرقوں سے الگ نہیں رہیں گے(۵۶)۔ کانگریس کو عوام کے ساتھ قریبی تعلقات بنائے رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ کانگریس کا سارا کام کاج عوامی زبان یعنی ہندوستانی میں ہو۔ ۱۹۳۶ء کے کانگریس اجلاس میں جب مرارجی ڈیسائی نے اس طرح کی تجویز رکھنی چاہی تو پنڈت جواہر لال نہرو نے ان کی حوصلہ فرسائی کی لیکن مولانا آزاد اس کی اہمیت سمجھتے تھے

لہٰذا انھوں نے مسٹر ڈیسائی کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کے ذریعہ حوصلہ افزائی کرنے پر ہی مرارجی ڈیسائی نے اپنی تجویز پیش کی جو پاس ہوگئی (۵۷)۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات اور کانگریسی کابینہ

انگلینڈ کی حکومت ہندوستان کی سیاسی سرگرمیوں کو اپنے مفاد کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اسی لیے وہ یہاں کے مسائل کے حل کے لیے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاتی تھی، جس سے بروقت مسائل کا حل ہو سکے۔ خود مختاری کا حق مانگنے والے ہندوستانیوں کو مطمئن کرنے کے لیے ۱۹۳۵ء میں انگلینڈ کی پارلیامنٹ کی ''جوائنٹ پارٹی رپورٹ'' شائع کی گئی تھی۔ کانگریس کے موجودہ صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے عوام سے اپیل کی تھی کہ ۷؍ فروری ۱۹۳۵ء کو ''رپورٹ مخالف دن'' منائیں (۵۸)۔ لیکن انگلینڈ کی حکومت نے ہندوستانی عوام کی مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے اسی رپورٹ کی بنیاد پر اپنی پارلیامنٹ میں ایک بل پیش کیا۔ گرچہ مسٹر ونسٹن چرچل کی نظر میں وہ ''بونوں کے ذریعہ تعمیر شدہ ڈھکوسلوں کی عمارت'' تھا، لیکن سر سیموئیل ہور کی کوششوں سے بنے اس ایکٹ کو ۲؍ اگست ۱۹۳۵ء کو انگلستان کے شہنشاہ کی منظوری حاصل ہوگئی (۵۹)۔ اس نئے قانون سے ہندوستان کو کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ انگلینڈ کی پارلیامنٹ میں مزدور پارٹی کے لیڈر مسٹر اٹلی نے کامن ہاؤس میں ٹھیک ہی کہا تھا کہ جتنا ہم دینے کا آغاز کر رہے ہیں اس سے زیادہ اپنے ہاتھ میں رکھ رہے ہیں (۶۰)۔ لیکن ۱۶؍ ستمبر ۱۹۳۵ء کو ہندوستان میں وائسرائے لارڈ ویلنگڈن نے اس ایکٹ میں ''ترقی کی عظیم طاقت کی پوشیدگی'' بتاتے ہوئے اسے منظور کرنے کی سفارش کی (۶۱)۔

کانگریس کے لکھنؤ اجلاس میں اس بل پر، جس میں دین بندھو اینڈریوز کے بقول نہ ہندوستانیوں کے جذبات کو سمجھا گیا تھا اور نہ ان کے دل کو چھوا گیا تھا، غور کیا گیا تو کرسی صدارت سے تقریر کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے اسے غلامی کے ایک نئے پروانے کا نام دیا (۶۲)۔ کانگریس نے اس ایکٹ کے اسمبلیوں کے انتخاب کے انتظامات والے حصے کو تسلیم کر لیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی کانگریس انتخاب میں حصہ لینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ کانگریس کو انتخابات میں حصہ لے کر اس موقع کا استعمال اپنے حق میں کرنا چاہیے۔ مہاتما گاندھی کے ذریعہ مولانا آزاد کی حمایت کیے جانے پر کانگریس نے چناؤ میں حصہ لینا منظور کر لیا (۶۳)۔ ۲۷ تا ۲۹؍ اپریل ۱۹۳۶ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی واردھا بیٹھک میں پنڈت گووند ولبھ پنت کی صدارت میں ۱۹۳۵ء کے اجلاس کے مطابق مستقبل میں ہونے والے انتخابات کے انتظامات کے لیے سات ممبران کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی (۶۴)۔ کانگریس نے یہ دستور پوری طرح منظور نہیں کیا تھا اور دسمبر ۱۹۳۶ء کے فیض پور اجلاس میں بھی راجندر پرشاد اور مدن موہن مالویہ وغیرہ نے نئے دستور کی نامنظوری سے متعلق بیان دیے تھے (۶۵)۔ فروری ۱۹۳۷ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک تجویز کے ذریعہ ملکی عوام سے یکم اپریل، جس دن دستور لاگو ہونے والا تھا، کو سارے ملک میں دستور مخالف دن منانے کی اپیل کی تھی۔ خود مولانا آزاد بھی اس دستور کے صوبائی نظم و نسق والے حصے پر عمل کرنا نہیں چاہتے تھے اور قانون کے مطابق ہندوستان میں فیڈریشن قائم کیے جانے کے حق میں نہیں تھے۔ انھوں نے ۲۹؍ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو کانگریس مجلس عاملہ کی کلکتہ بیٹھک میں اس سلسلے میں ایک تجویز بھی پیش کی تھی (۶۶)۔

کانگریس ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے نظم و نسق والی شق تسلیم کر چکی تھی۔ اس لیے اس نے ملکی مفاد کے پیش نظر ۱۹۳۷ء میں چناؤ لڑنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ ۲۲؍ اگست ۱۹۳۶ء کو جاری کیے گئے مینی فیسٹو میں کانگریس نے غریبی، بے روزگاری اور کاشتکاری سے متعلق مسائل کی طرف خاص توجہ دی تھی (۶۷)۔ آئندہ کے پروگراموں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ۲۱؍ مارچ ۱۹۳۷ء کی مجلس عاملہ نے صوبائی کانگریس پارٹیوں کو وقت کے موافق مشورہ دینے کے لیے ایک سب کمیٹی تشکیل دی تھی۔ اس میں سردار ولبھ بھائی پٹیل کو صدر اور مولانا ابوالکلام آزاد و ڈاکٹر راجندر پرشاد کو ممبر مقرر کیا گیا تھا۔ اس کمیٹی کے فیصلوں کی بنیاد پر سارے ملک سے کانگریس امیدواروں کو منتخب کیا گیا تھا (۶۸)۔ حکومت کانگریس کی مقبولیت سے متفکر تھی لہٰذا حکومت کی طرف سے الیکشن میں کانگریس کی مخالفت کی حتی الامکان کوششیں کی جا رہی تھیں (۶۹)۔ اس کے باوجود کانگریس نے عوامی کثرتِ رائے کی عظیم الشان حمایت حاصل کرتے ہوئے الیکشن میں خلاف امید جیت درج کرائی۔ انتخاب کے بعد جب کابینہ کی تشکیل کا سوال کانگریس کے سامنے آیا تو اس پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں دو گروپ ہو گئے تھے۔ ایک گروپ سرکار بنانے کا حمایتی تھا، جب کہ دوسرا اس کی مخالفت کر رہا تھا۔ مخالف گروپ سماجوادی کانگریسوں کا

تھا۔ اس میں جے پرکاش نارائن کا کہنا تھا کہ موجودہ دستور کے تحت حقیقی اقتدار حاصل ہوئے بغیر ذمہ داری قبول کرنے سے کانگریس کابینہ اسی ظلم و جبر کی ذمہ دار ہو جائے گی جو کسی شہنشاہیت پسند (سامراج وادی) حکومت کا خاصہ ہے اور پھر کانگریس اس وجہ کر عوام کی نظروں سے گر جائے گی۔ کانگریس کی مجلس عاملہ کی بیٹھک میں آچاریہ نریندر دیو نے بھی سرکار بنانے کی مخالفت کی تھی (۷۰)۔ سرکاریں بنانے اور اسے چلانے میں گورنروں کی مداخلت کے اندیشے کی وجہ کر یہ مخالفت کی جا رہی تھی۔ گاندھی جی نے ایک تجویز کے ذریعہ اس مشکل کو دور کر دیا۔ ان کی تجویز کے مطابق سرکار بنانے کے لیے کابینہ کے کاموں میں گورنروں کے ذریعہ مداخلت نہ کرنے کی مانگ کی گئی (۷۱)۔ ملک کے موجودہ سکریٹری لارڈ جٹ لینڈ نے ہاؤس آف لارڈ میں اقلیتوں کے جائز مفادات کی حفاظت کے نام پر اس مانگ کو نامنظور کر دیا جب کہ رُکن پارلیامنٹ لارڈ اسنیل نے ہندوستانیوں کے جذبات و احساسات کو بطور جواز سامنے رکھ کر اس سلسلے میں انھیں کچھ اطمینان دلانے کی حمایت کی تھی (۷۲)۔ وائسرائے نے ۲۲ر جون کو ایک بیان دیا کہ گورنر عام طور سے اپنے حقوق کے استعمال میں وزیر کے مشورے کی پابندی کرے گا اور وزیر پارلیامنٹ کے سامنے نہیں، اپنے صوبائی منتظمین کے سامنے جوابدہ ہوں گے (۷۳)۔ اس بیان پر غور وخوض کرنے کے لیے واردھا میں کانگریس مجلس منتظمہ کی بیٹھک ہوئی۔ مولانا آزاد کے مطابق صدر کانگریس جواہرلال نہرو بھی سرکاریں بنانے پر متفق نہیں تھے۔ مولانا آزاد نے اس میں تجویز رکھی کہ کانگریس کو سرکار بنانے کی بات قبول کر لینی چاہیے۔ تھوڑی دیر کی بحث کے بعد گاندھی جی نے یہ بات مان لی اور انھوں نے مولانا آزاد کی تائید کی (۷۴)۔ ۷ر جولائی کو کانگریس نے طے کیا کہ وہ نئے دستور کی مخالفت کرنے اور تعمیری پروگرام پورا کرنے کے لیے کثرت رائے والی ریاستوں میں سرکار بنائے گی (۷۵)۔

مولانا آزاد اور سرکاروں کی تشکیل

کانگریس نے صوبائی اسمبلیوں کی کانگریسی جماعتوں کو مشورہ دینے کے لیے جو پارلیامانی ذیلی کمیٹی بنائی تھی، اس میں سردار پٹیل کو سندھ، بمبئی، مدراس اور مدھیہ پردیش، ڈاکٹر راجندر پرشاد کو اڑیسہ، بہار اور آسام، اور مولانا آزاد کو بنگال، یوپی، شمال مغربی سرحدی

صوبہ اور پنجاب کے کاموں کے نظم و انصرام کی ذمہ داری سونپی گئی تھی (۷۶)۔ انتخاب میں مدراس، بہار، مدھیہ پردیش، یوپی اور اڑیسہ میں کانگریس کو واضح اکثریت حاصل ہوئی تھی اور بنگال، بمبئی، آسام اور سرحدی ریاستوں میں وہ سب سے بڑی پارٹی کی شکل میں اُبھر کر سامنے آئی تھی۔ بنگال کو چھوڑ کر بقیہ سبھی ریاستوں میں کانگریس نے سرکاریں بنالی تھیں (۷۷)۔

سرکاروں کی تشکیل میں مولانا آزاد چاہتے تھے کہ اگر لیگ کانگریس کے اسمبلی پروگرام اور ڈسپلن کو مان لے تو پھر ہر صوبے کی وزارت کے لیے لیگ کے ممبر لے لیے جائیں (۷۸)۔ کانگریس مجلس منتظمہ نے جولائی کے پہلے ہفتے میں سرکاریں بنانے کا فیصلہ لیا تھا۔ ۱۲ر جولائی کو مولانا آزاد نے یوپی کے لیگی لیڈر چودھری خلیق الزماں سے یوپی میں سرکار بنانے کے لیے گفتگو شروع کر دی۔ اس گفتگو میں چودھری خلیق الزماں نے یہ قبول کیا کہ اگر لیگ مشترکہ حکومت میں شامل ہوگی تو کانگریس کے ذریعہ کسی بھی معاملے پر ایوان چھوڑنے اور استعفیٰ کا فیصلہ لینے پر کانگریس کا ساتھ دینا لیگ کی اخلاقی ذمہ دار ہوگی۔ دوران گفتگو چودھری خلیق الزماں کے مسلم لیگ کے کسی دوسرے رُکن کے ساتھ کابینہ میں شامل کرنے کے سوال پر بھی غور ہوا۔ مولانا آزاد نے حافظ محمد ابراہیم کا نام پیش کیا لیکن چودھری صاحب نے ان کی جگہ پر نواب اسماعیل خاں کو لینے کا فیصلہ کیا۔ ۱۵ر جولائی کو مولانا آزاد نے یوپی اسمبلی میں کانگریس کے لیڈر گووند ولبھ پنت کے ساتھ چودھری خلیق الزماں سے ملاقات کی اور کانگریس کی سرکار میں شامل ہونے کے لیے ان کے سامنے درج ذیل شرائط پیش کیے:

(۱) لیگی گروپ متحدہ ریاست کے لیجسلیچر میں الگ گروپ کی شکل میں کام کرنا بند کر دے۔

(۲) لیگی اراکین کانگریس میں شامل ہو کر کانگریسی اراکین کی طرح دیگر تمام سہولتوں کا استعمال کریں۔

(۳) لیگ کے اراکین کانگریس کی مجلس عاملہ کے ذریعہ بنائے گئے قواعد وضوابط کی بجاآوری کریں گے۔

(۴) صوبہ متحدہ میں لیگ کا پارلیمانی بورڈ تحلیل کر دیا جائے۔ آگے آنے والے ضمنی

انتخاب میں وہ کوئی اُمیدوار طے نہیں کرے گا نیز سبھی ممبران کو کانگریس بورڈ کے
ذریعہ طے شدہ اُمیدوار کی حمایت کرنا ہوگی۔

(۵) جب کانگریسی کابینہ استعفیٰ دینے کا فیصلہ کرے گی تو لیگی اراکین بھی ان کے ساتھ
مل کر ویسا ہی کریں گے(۸۰)۔

چودھری خلیق الزماں نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ ۲۴ر جولائی کو مولانا
آزاد نے چودھری صاحب کو اپنے یہاں بلا کر پھر وہی شرطیں دہرائیں۔ چودھری صاحب
نے نواب اسماعیل خاں سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد مولانا سے ٹیلی فون پر پوچھا کہ کیا
ان شرطوں کے ساتھ وہ یہ جملہ جوڑ سکتے ہیں کہ یوپی قانون ساز اسمبلی کے مسلم لیگی ممبران
فرقہ وارانہ معاملوں پر اپنے ضمیر کے مطابق رائے دینے کے لیے آزاد ہوں گے۔ مولانا نے
رائے مشورہ کرنے کے بعد اس کا جواب دینے کو کہا۔ اسی دن شام کو پنڈت گووند ولبھ پنت
کے ذریعہ ٹیلی فون پر فرقہ وارانہ معاملوں کی وضاحت کرنے کے لیے کہنے پر چودھری خلیق
الزماں نے کہا کہ اس کا مطلب مذہب، مذہبی تقاریب، زبان، تہذیب، نوکری وغیرہ سے
ہے۔ اگلے دن چودھری خلیق الزماں و نواب اسماعیل خاں نے پنڈت جی کے گھر جا کر وہ
شرائط نامہ واپس کر دیا اور کانگریس کے حزب مخالف بیٹھنے کا اپنا فیصلہ انھیں سنا دیا(۸۱)۔
اس طرح یوپی میں کانگریس و لیگ کی مشترکہ حکومت بنانے کی کوشش ناکام ہوگئی۔

بمبئی میں وزارت سازی کے سوال پر لیگ نے مطالبہ کیا کہ یہاں کے دو مسلمان
کابینہ میں لے لیے جائیں۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اس سلسلے میں مولانا آزاد سے مشورہ
کیا تو انھوں نے رائے دی کہ اگر وہ کانگریس کا پروگرام منظور کریں تو انھیں کابینہ میں رکھ لیا
جائے۔ مسٹر جناح اس بات پر راضی نہیں ہوئے لہٰذا انھیں شامل نہیں کیا گیا(۸۲)۔ مولانا
آزاد کا خیال تھا کہ جب کسی صوبے میں مکمل اکثریت حاصل ہو تو وہاں سرکار بنانا چاہیے۔
اس کے لیے وہ غیر کانگریسی ایم. ایل. اے. کو کانگریس کی پارٹی ڈسپلن اور لیجسلیچر سے متعلق
پروگرام ماننے پر ہی اپنے ساتھ لینے کے لیے تیار تھے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ چاہتے تھے کہ
اقلیت میں ہونے پر کانگریس سرکاروں کی تشکیل نہ کرے۔ اسی وجہ سے انھوں نے آسام
میں مکمل اکثریت حاصل نہ ہونے پر وزارت سازی کی مخالفت کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ''ہم
نے وزارتیں بنانے کا ٹھیکہ نہیں لیا۔ ہم نے وزارتیں ایک پروگرام کے تحت قبول کی ہیں۔

آئین کو ہر قیمت پر چلانا ہمارے پیش نظر نہیں''۔ اسی نظریے سے انھوں نے سندھ میں لگان
بڑھانے پر کانگریس کے ذریعہ ''اللہ بخش سرکار'' کو حمایت دینے کی مخالفت کی تھی جب کہ
سردار پٹیل حمایت دینے کے حق میں تھے(۸۳)۔ مولانا کے خیال سے سرکاریں اقتدار کے
نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ لڑائی کے تقاضوں کے نظریے سے بنائی گئی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اس
وقت لڑائی کے میدان میں ہمارا حربہ یہی ہونا چاہیے۔ اس پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے
ہی ان کا خیال تھا کہ ''دوسرے لوگوں کو لینے پر اگر جنگ کا محاذ بدلنا پڑا تو پھر یہ لوگ
(سرکار میں شامل ہونے والے دوسری پارٹیوں کے لوگ) ہمارے راستے میں بڑی رکاوٹ
ثابت ہوں گے''(۸۴) لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مشترکہ سرکاروں میں بالکل ہی
یقین نہیں رکھتے تھے، کیوں کہ جب ستمبر ۱۹۳۹ء میں سرحدی صوبے میں عبدالقیوم سرکار کا
زوال ہوا تو وہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ساتھ وہاں گئے اور آٹھ غیر کانگریسی ممبران کے ساتھ
کانگریس سرکار بنانے کا سمجھوتہ کرایا(۸۵)۔

پنجاب میں بھی سرکار بنانے میں کچھ ممبر کم تھے۔ یونینسٹ پارٹی کے کچھ ممبر مسٹر
جناح کے ساتھ جڑے تھے لیکن مولانا یونینسٹ پارٹی کو کانگریس کے ساتھ مل کر سرکار بنانے
کے لیے راضی کرنے میں کامیاب رہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اس کی مخالفت کر رہے تھے
لیکن گاندھی جی کے ذریعہ مولانا آزاد کی تائید کرنے پر نہرو جی نے بھی اس بات کو قبول کر
لیا(۸۶)۔ محمد سعد اللہ خاں کی حکومت کے زوال کے بعد آسام میں کانگریس کی مشترکہ
حکومت کا قیام مولانا آزاد کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا(۸۷)۔ وہ مجلسِ وزارت بنانے میں یہ
خیال بھی رکھنا چاہتے تھے کہ مسلمان پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ ۱۹۳۹ء میں اڑیسہ کی کابینہ
میں وہ ایک مسلمان کو صرف اس لیے شامل کرنا چاہتے تھے کہ ''اس کا پولی ٹیکل اثر اور اخلاقی
اثر جو سارے ملک پر پڑے گا وہ نہایت قیمتی ہوگا۔ ہمارا سخت سے سخت مخالف بھی یہ دیکھ
لے گا کہ ایسا کرنے کے لیے ہمیں اب کوئی مجبوری نہ تھی لیکن فیاضانہ اسپرٹ تھی جس نے
ہمیں اس پر آمادہ کر دیا''(۸۸)۔ ان سب کے باوجود وہ لیگ کے ساتھ سرکاروں کے
معاملے میں کوئی سمجھوتہ کر لینے کے خواہش مند تھے۔ اس کے لیے انھوں نے لیگ کے
صوبائی لیڈروں، سرسکندر حیات خاں اور سید عبدالرؤف شاہ سے ان کی ریاستوں، علی الترتیب
پنجاب اور سنٹرل پراونس کی منسٹری کے سلسلے میں بات بھی چلائی تھی۔ انھوں نے سی. پی. کی

لیگ پارٹی کو کانگریس کا ساتھ دینے کے لیے تیار کر لیا تھا لیکن مسٹر جناح ایسا نہیں ہونے دینا چاہتے تھے(۸۹)۔ پنجاب میں سر سکندر حیات خاں سے مولانا آزاد جب سمجھوتے کی بات کر رہے تھے تب بھی مسٹر جناح اسے برداشت نہیں کر سکے تھے(۹۰)۔ انھوں نے بمبئی میں لیگ کی مجلس عاملہ کی ایک میٹنگ کے بعد ایک بیان شائع کیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ کوئی ریاست کانگریس کے ساتھ اس سلسلے میں خود سے گفتگو نہیں کرے گی بلکہ ان معاملوں میں لیگ کے صدر یا ورکنگ کمیٹی سے بات کی جائے(۹۱)۔

سرکاریں اور کانگریس کے مقاصد کی تکمیل

۱۹۳۷ء کے انتخابات میں فاتح ہونے کے بعد کانگریس نے صوبوں کا نظم ونسق چلانا شروع کر دیا تھا۔ جیسا کہ پہلے سے اندیشہ تھا، ہندوستان کی برٹش حکومت کے گورنروں کی طرف سے کانگریسی سرکاروں کے سامنے کچھ مشکلات پیدا کی گئیں۔ گورنروں کی مداخلت کا مسئلہ یوپی اور بہار میں بڑے پیمانے پر سامنے آیا۔ کانگریس کے انتخابی مینی فیسٹو میں سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کی بات کہی گئی تھی، لیکن گورنر اس بات کو منظور کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مولانا آزاد نے پٹنہ جا کر اس مسئلے پر بات چیت کی۔ اس کے بعد وہ مہاتما گاندھی اور سردار پٹیل سے ملے۔ سبھوں کا یہ فیصلہ تھا کہ اگر گورنر سیاسی قیدیوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوں تو کانگریسی سرکاروں کو استعفیٰ دے دینا چاہیے۔ یوپی اور بہار کی کابینہ کے پوری طرح زور لگانے پر بھی گورنر اس بات سے متفق نہیں ہوئے، لہٰذا کانگریس کے ہری پور اجلاس سے قبل ان کے وزرائے اعظم نے دونوں ریاستوں میں اپنے اپنے گورنر کو اپنی اپنی کابینہ کا استعفیٰ سونپ دیا(۹۲)۔ مولانا آزاد کی نظر میں عہدۂ وزارت حاصل کرنا قومی تحریک کی آخری منزل نہیں تھی(۹۳)۔ انھوں نے مجلس وزراء کے مستعفی ہونے پر اپنا ردعمل ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا ''قیدیوں کے سوال پر منسٹروں کا مستعفی ہو جانا بہت بہتر ہوا ... دنیا نے دیکھ لیا کہ ورکنگ کمیٹی اور منسٹروں کا طریقہ کیا ہے''(۹۴)۔ بعد میں گورنروں کے ذریعہ کابینہ کی بات منظور کر لی گئی تھی اور اس نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا تھا۔

۱۹۳۸ء کے انتخابات میں کانگریس نے اپنے مینی فیسٹو میں کاشتکاروں کے مسائل سلجھانے نیز ان کے حالات سدھارنے پر زور دیا تھا۔ اس وقت سارے ملک میں سرکار اور

زمینداروں کی من مانی لگان پالیسی کی مخالفت ہو رہی تھی۔ کسانوں سے متعلق مسائل کا پہلا اور پیچیدہ سوال بہار میں سامنے آیا۔ لگان کی دَر، کاشت کی زمین کی ملکیت، زمین سے بے دخلی وغیرہ جیسے کئی سوالوں پر سوامی سہجانند کسان سبھا نامی تنظیم کی وساطت سے کسانوں کی وکالت کر رہے تھے۔ زمیندار بھی چاہتے تھے کہ اس سلسلے میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں زمینداروں کا ایک نمائندہ وفد ڈاکٹر راجندر پرشاد سے ملا(۹۵)۔ مولانا آزاد کانگریس کی پارلیمانی بورڈ کے ممبر تھے، لہٰذا زمینداروں نے ان سے بھی اس سلسلے میں ملاقات کی۔ اس طرح راجندر بابو اور مولانا دونوں ہی زمینداروں کے نمائندوں سے ان مسائل کے حل پر باتیں کرنے لگے(۹٦)۔ مولانا آزاد اور راجندر بابو نے زمینداروں کو سمجھایا کہ کسانوں کو سہولت دینے کے لیے ٹیکسوں کا بوجھ کم کرنا ضروری ہے۔ کانگریس سرکار اور زمینداروں کے خیالات میں مطابقت قائم کیے بغیر کسانوں کے مسائل کا حل نہیں ہو سکتا تھا، لہٰذا مولانا آزاد نے زمینداروں کے سامنے کچھ شرائط سمجھوتے کے لیے پیش کیے۔ مولانا آزاد کی تجویز کو زمینداروں نے قبول کر لیا۔ اس کے مطابق درج ذیل باتیں طے ہوئیں:

(۱) زمین کے کرائے اوسطاً ۲۵ فیصد کم ہو گئے۔ کچھ معاملوں میں یہ کمی ۴۰ فیصد سے ۵۰ فیصد تھی۔

(۲) کسانوں کو کاشتکاری کا عملی حق حاصل ہوا۔ اب وہ صرف کرائے دار مانے گئے۔

(۳) لگان کے بدلے ان کی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد کی نیلامی نہیں ہو سکتی تھی۔ اناج کا بھی اتنا ہی حصہ بیچا جا سکتا تھا جتنے میں لگان پورا ہو جائے۔

(۴) وہ اپنا مال اپنی مرضی کے مطابق خواہش مند شخص کو بیچنے کے لیے آزاد کر دیے گئے۔

(۵) اگر وہ فروخت شدہ و غیر فروخت شدہ مال پر لگان بانٹنا چاہتے تو زمیندار کو کچھ قیمت دے کر ایسا کر سکتے تھے۔

(٦) زمیندار سارے بندوبست کو منظور کرنے کے لیے مجبور تھے۔

(۷) کسان اب اپنی کاشت کی زمین میں گھر بنا سکتا تھا نیز کنواں کھود سکتا تھا۔

(۸) لگان باقی رہنے کی وجہ کر وہ بے دخل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عملاً اب کسان صرف کم کیا گیا لگان دے کر اپنی زمین کے مالک بن گئے تھے۔

ان شرطوں کے طے ہونے کے بعد بہار سرکار اور زمینداروں میں اختلاف پیدا

ہوگیا۔ اختلاف یہ طے کرنے پر تھا کہ کس کسان کو وعدے پر روپیہ نہ چکانے کا عادی مجرم مانا جائے۔ سرکار کا کہنا تھا کہ جس کسان نے لگاتار چار سال تک لگان نہ دیا ہو اور زمیندار کہتے تھے کہ جس نے لگاتار دو سال تک لگان نہ دیا ہو(۹۸)۔ مولانا آزاد اس مسئلے کے حل کے لیے بہار گئے۔ انھوں نے زمینداروں سے بات کی تو زمینداروں نے سارا فیصلہ انھی پر چھوڑ دیا(۹۹)۔ مولانا نے زمینداروں سے سرکار کی بات مان لینے کی تجویز رکھی۔ زمینداروں نے ان کی اپیل پر یہی بات منظور کر لی(۱۰۰)۔

بہار سرکار اور زمیندار - کسان تعلقات کا بحران زمینداروں اور سرکار کے درمیان باہمی رضامندی کی بنیاد پر ہی حل ہو سکتا تھا۔ یہ رضامندی حاصل کر لینا مولانا کی اپنی قابلیت و صلاحیت نیز حالات کی مناسبت کو مدنظر رکھتے ہوئے دو مخالف ترین طرز فکر میں توازن پیدا کرنے کی اہلیت کی وجہ کر ہی ممکن ہو سکا تھا، جس نے نہ صرف بہار میں کانگریس کو کسانوں کے تعلق سے کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے میں مدد دی بلکہ سرکار کی شان و شوکت بڑھانے کے ساتھ عوام کی تکالیف کو بھی دور کیا۔

اقتدار قبول کرنے یا نہ کرنے کو لے کر کانگریس کے اندر جو اختلاف رائے پیدا ہوا تھا اس میں سوشلسٹ طرز فکر کے حامل کانگریسیوں کا اہم رول رہا تھا۔ انھوں نے ہی کانگریس کو سرکار نہ بنانے کا مشورہ دیا تھا۔ جب بہار میں زمیندار- کسان تعلقات کا سوال اٹھا تو ان لوگوں نے کسانوں کو راحت نہ پہنچا پانے کو لے کر سرکار سے استعفیٰ کی مانگ کی تھی جس کی وجہ سے ریاستی کانگریس میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے(۱۰۱)۔ مولانا آزاد محسوس کرتے تھے کہ اس طرح سرکار کی تنقید ہونے سے سرکاروں کے لیے اچھی طرح کام کرنا ممکن نہ ہوگا۔ انھوں نے سوشلسٹوں سے بات چیت کرنے کا فیصلہ کیا۔ بمبئی اور ہری پور میں انھوں نے جواہر لال نہرو اور جے پرکاش نارائن سے بات چیت کی اور انھیں احساس دلایا کہ ان کی پچھلی روش غلط تھی۔ چنانچہ ان لوگوں نے اسے بند کرنا قبول کر لیا(۱۰۲)۔ اور اس طرح کانگریس کا یہ اندرونی اختلاف رائے ختم ہو گیا۔

ریاستی سرکاروں کے مسائل

۱۹۳۰ء کے بعد کی دو دہائیوں میں برٹش حکمراں طبقہ فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے میں اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ اس سے علیحدگی پسند عناصر کو پھلنے پھولنے کا مزید موقع ملا تھا۔ کانگریس پارٹی مسلم لیگ کو مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کا نمائندہ تسلیم نہیں کرتی تھی، جس کا جواز اس بات سے ثابت ہوتا تھا کہ مسلم آبادی کے تناسب میں لیگ کو بہت تھوڑے مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی(۱۰۳)۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں بری طرح شکست کھانے کے بعد بھی لیگ کانگریس کے خلاف قدم اٹھانے کا کوئی موقع کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اگست ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر انصاری کے بھتیجے مسٹر انصاری کی قیادت میں آسام میں لیگ نے اپنی طاقت مضبوط بنانے کی مہم چلائی۔ وہاں کانگریس اقلیت میں تھی، اس لیے لیگ اپنی طاقت بڑھا کر سرکار بنانا چاہتی تھی، لیکن اس وقت قانون ساز اسمبلی میں کامرس کانسٹی چوئنسی کے ممبر بابو کیدارمل کی مدد اور کانگریس حامی قوم پرست مسلمان ایم. ایل. اے. مسٹر فخر الدین علی احمد کے ذریعہ لیگی مہم کی زبردست مخالفت نے حالات کو بگڑنے سے بچالیا(۱۰۴)۔ آسام میں جب مسلم وزراء کی تقرری کا سوال اٹھا تو موجودہ کانگریس صدر مسٹر سبھاش چندر بوس کے ساتھ ایک مشترکہ بیان جاری کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا تھا کہ کانگریس کا کاؤنسل پروگرام اور پالیسی منظور کرنے پر دوسری جماعتوں کے مسلمان ممبروں کو وزارت میں لیا جا سکتا ہے(۱۰۵)۔ وہ اس بات پر اٹل تھے کہ مشترکہ سرکار تبھی بنائی جاسکتی ہے جب کہ کانگریس کو ایوان میں اکثریت حاصل ہو جائے۔ اکثریت حاصل ہونے پر وہ اس حد تک جانے کے لیے بھی تیار تھے کہ مشترکہ سرکار میں صرف کانگریس پارٹی کا لیڈر ہی واحد کانگریسی ہو اور بقیہ سبھی ممبران غیر کانگریسی ہوں(۱۰۶)۔

مولانا آزاد کانگریسی دورِ حکومت میں ہر طرح کے فرقہ وارانہ اختلافات دور کر دینا چاہتے تھے۔ صوبہ متحدہ میں ۱۹۳۸ء میں شیعہ و سنّی فرقوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ شیعوں میں تبرّا اور سنّیوں میں مدحِ صحابہ کی تحریک چل پڑی تھی(۱۰۷)۔ نتیجتاً دونوں فرقوں میں خون ریزی ہونے لگی اور گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ کوئی سمجھوتہ نہ ہونے پر مولانا خود لکھنؤ گئے اور وہاں جا کر دونوں فریقوں سے بات چیت کی اور اس ایجی ٹیشن کو بند کرایا۔ مسائل کا مکمل حل تو فوراً نہیں ہو سکا لیکن مولانا کی کوششوں سے ماحول میں امن و امان ضرور قائم ہو گیا(۱۰۸)۔ مولانا آزاد کا خیال تھا کہ اقتدار میں آنے کے بعد کانگریس کو چاہیے کہ فرقہ وارانہ اختلافات مٹانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دے۔

صوبہ بہار میں مقامی بورڈوں میں مسلمانوں کے لیے جگہ محفوظ کرنے کے سوال پر کانگریس مخالف ماحول پیدا ہونے پر انھوں نے ڈاکٹر راجندر پرشاد کو مشورہ دیا تھا کہ ''ایک باضابطہ کانفرنس کر کے مسلمانوں سے گفتگو کر لی جائے اور یہ اثر پیدا کیا جائے کہ اس بارے میں ہر معقول تجویز پر ہم غور کرنے کے لیے تیار ہیں۔ صرف اتنی سی بات کر دینے سے اس کا جو اثر پیدا ہوگا وہ ہمارے لیے معقولیت اور مضبوطی حاصل کرے گا۔ میں ان تمام باتوں کو دوسری نظر سے دیکھتا ہوں۔ خود ان مسائل میں دھرا کچھ نہیں ہے لیکن جو آب و ہوا پیدا ہو گئی ہے وہ یقیناً بہت کچھ اہمیت رکھتی ہے اور ہمیں چاہیے کہ اب اور وقت نہ دیں اور فوراً اس ہوا کو اپنے حق میں پلٹ دیں'' (١٠٩)۔ خود مولانا آزاد نے ڈاکٹر محمود کے یہاں ایک گھنٹے تک کچھ مسلمانوں سے بات چیت میں یہ پوچھا تھا کہ انھیں تین ماہ کے اندر کانگریسی حکومت میں کیا مشکلات پیش آئی تھیں اور اگر پیش آئی تھیں تو وہ کانگریس کی طرف سے انھیں معلوم کر کے ان کو دور کرنا چاہتے ہیں (١١٠)۔ بہار میں اردو رسم الخط کا معاملہ اٹھنے پر وہ خوش نہیں تھے۔ ان کی رائے میں یہ کانگریس کے لیے نیا اُلجھاؤ تھا اور وہ اسے قانونی طریقے سے حل کرنے کی جگہ پر آپسی سمجھوتے سے حل کرنا چاہتے تھے (١١١)۔ بہار سرکار نے اس موضوع پر ایک کمیٹی تشکیل دی تھی اور مولانا آزاد کو اس کا صدر مقرر کیا تھا (١١٢)۔

مولانا آزاد چاہتے تھے کہ عام بول چال کی زبان میں سادہ زبان بولی جانی چاہیے اور دیوناگری یا فارسی رسم الخط کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندی یا اردو رسم الخط کو کسی پر زبردستی تھوپا جائے۔ جب صوبۂ سرحد میں عبدالقیوم کی سرکار نے اردو رسم الخط کو اسکولوں میں لازمی قرار دیا تھا تو انھوں نے مخالفت میں انھیں ایک خط لکھا تھا (١١٣)۔ انھوں نے عبدالقیوم کی حمایت کرنے والوں سے بہت ہی سخت طریقے سے اپنی ناراضگی ظاہر کی تھی اور ان لوگوں سے کہا تھا کہ ''کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ اس معاملے کو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت تصور کرتے ہیں ... اگر ٹھیک انھیں دلائل کی بناء پر کل کو بہار، یوپی، مدراس اور بمبئی میں ہندو اکثریت نے دیوناگری رسم الخط کو سرکاری قرار دے دیا اور اردو رسم الخط والے اسکولوں کو سرکاری اعانت سے محروم کر دیا تو ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے؟ اردو کی مخالفت میں جو کام اردو کے سخت سے سخت مخالف نہیں کر سکتے تھے وہ اس اسلامی صوبے نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ انجام دیا ہے'' (١١٤)۔

کل ہند کانگریس کمیٹی کے ممبر ڈاکٹر اشرف نے ٢٦/ دسمبر ١٩٣٨ء کو کمیٹی کی بیٹھک میں زبان کے جھگڑے سے متعلق کانگریس کی پالیسی واضح کرنے اور اس سلسلے میں ایک کمیٹی بنانے کی مانگ کرتے ہوئے ایک تجویز رکھی تھی تو مولانا آزاد نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''اس پر انڈین نیشنل کانگریس کا فیصلہ بالکل صاف ہے۔ اس میں کسی قسم کی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے''۔ کمیٹی بنانے کی مانگ کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ''بہار سرکار اس پر ایک کمیٹی بنا چکی ہے، جس میں میرا نام بھی شامل ہے اس لیے میں کسی کمیٹی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ جب کمیٹی اپنا کام ختم کر لے گی اور کسی نتیجے پر پہنچ جائے گی تو ایک معیار قائم ہو جائے گا اور اس کے مطابق ہر جگہ کے لیے ایک سی پالیسی اختیار کی جائے گی ... اگر کوئی شخص وقتی جذبات میں آکر ایسا (اپنی تقریر میں ہندی کے موٹے موٹے لفظ کا استعمال) کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کانگریس کی پالیسی میں کوئی فرق آگیا ہے، جن لوگوں کے متعلق مجھ سے شکایتیں کی گئی ہیں، اگر انھوں نے ایسا کیا ہے تو سخت غلطی کی ہے۔ تحقیقات کے بعد ایسے لوگوں کی تنبیہ کی جائے گی اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ میرے نزدیک ہندوستان کی مشترکہ زبان کے متعلق ہندوستانی کے سوا کوئی دوسرا لفظ استعمال کرنا بالکل غلط ہے۔ ہندوستانی کے مسئلے پر آجکل بلا وجہ کے اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ ہندی دیوناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی زبان سمجھی جاتی ہے۔ کانگریس ہندوستانی سے وہ زبان مراد لیتی ہے جو شمالی ہند میں عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے، فارسی اور سنسکرت کے موٹے موٹے الفاظ سے پاک ہے اور جس کے نمونے کے لیے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس اجلاس میں تین دن سے جو زبان استعمال کی جا رہی ہے وہی ہندوستانی کا صحیح نمونہ ہے، جو اس کے خلاف کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں'' (١١٥)۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اردو اور ہندی کو ایک مانتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندی اور اردو کا فرق برابر بنا رہنا چاہیے اور دونوں کو الگ الگ ترقی کرنے دینا چاہیے۔ ان کی نظر میں دونوں کا الگ الگ رہنا ضروری تھا۔ اسی لیے یوپی اسمبلی میں ڈاکٹر سمپورنا نند کے ذریعہ تعلیم، کلچر و تہذیب کے معاملے میں ہندو مسلمان کا امتیاز نہ دیکھنے کی بات کہنے پر مولانا نے کہا تھا کہ ''اگر انھوں نے یہ کہا ہے تو یقیناً انھوں نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا نہ

ہی کانگریس کا یہ مقصد ہے اور نہ مسلمان ہی قیامت تک متفق ہو سکتے ہیں کہ ہندوستان
سے مسلم تعلیم، مسلم کلچر، مسلم تہذیب کے امتیازی اوصاف فنا ہو جائیں اور وہ ہندوستان کی
متحدہ قومیت میں جذب ہو کر جرمن یا انگریز کی طرح ہندوستانی قوم کے سوا کچھ نہ
رہیں'' (۱۱۶)۔ کانگریس کی زبان سے متعلق پالیسی سے کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ نہ اٹھ کھڑا ہو
یہ فکر ان کو لگی رہتی تھی اور اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ کانگریس اردو ہندی دونوں کو استعمال
کی زبان مانے اور دونوں ہی رسم الخط میں کام کرے۔ انھوں نے رام گڑھ اجلاس سے
پہلے اس خیال کو ڈاکٹر راجندر پرساد کے سامنے رکھا تھا۔ انھوں نے لکھا کہ ''اگر ان مسائل
نے کمیونل رنگ نہ پکڑ لیا ہوتا اور باہم بے اعتمادیاں نہ ہوئی ہوتیں تو کوئی مضائقہ نہ تھا کہ
سب کام ایک ہی رسم الخط میں ہوتا، اس سے کام میں آسانی ہو جاتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے
آب و ہوا دوسری ہو رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان باتوں کو دور دور تک لے جایا جاتا ہے کہ
کانگریس نے اردو کو بھی تسلیم کر لیا ہے لیکن اس کا رخ اس طرف ہے کہ اردو کو قومی زندگی
کے میدان میں بالکل نظرانداز کر دیا جائے'' (۱۱۷)۔ اس خیال کو دور کرنے کے لیے
انھوں نے یہ مشورہ دیا کہ ''کانگریس کے آل انڈیا سالانہ جلسے میں سائن بورڈ دونوں خطوں
میں ہونا چاہیے۔

اردو میں انگریزی ناموں کا ترجمہ نہ کریں بلکہ انگریزی ناموں کے الفاظ ویسے ہی
رہنے دیے جائیں اور ریسپشن کمیٹی جتنے بھی اعلانات شائع کرے وہ دونوں رسم الخط میں
چھپنے چاہئیں'' (۱۱۸)۔

صوبۂ سندھ میں اللہ بخش وزارت کے سامنے زمین سے متعلق مسائل پیدا ہونے
پر مولانا آزاد نے ہی کانگریس اور اللہ بخش حکومت کو کسانوں پر آبپاشی ٹیکس بڑھانے سے
روکا تھا جب کہ سندھ کے کانگریسی یہ نہیں چاہتے تھے۔ بعد میں جب سندھ کے کانگریسیوں
نے اس بات پر ناراض ہو کر اپنے ہی صوبے کے وزراء کے خلاف مظاہرہ کرنا چاہا تھا تو
مولانا آزاد نے مظاہرے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا (۱۱۹)۔

مسلم لیگ سے تعلقات

مولانا آزاد کانگریس اور لیگ کے جھگڑے کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے لیگ
کے لیڈروں کے سامنے تجویز رکھی تھی کہ لیگ اگر تین باتیں منظور کر لے تو لیگ اور کانگریس
کا سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ وہ تین باتیں اس طرح تھیں:

(۱) لیگ مکمل آزادی کی بات تسلیم کرے۔

(۲) اس کے حصول کے لیے کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرے۔

(۳) مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے مسلم لیگ ایک الگ تنظیم کی حیثیت سے قائم رہے (۱۲۰)۔

لیکن لیگ نے یہ منظور نہیں کیا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ ''اصل سوال نصب العین
کا نہیں، جدوجہد کا ہے اور جب تک مسٹر جناح موجود ہیں مسلم لیگ کبھی بھی جدوجہد کے
اس طریقے کو پسند نہیں کر سکتی'' (۱۲۱)۔ صوبوں میں کانگریس کی سرکار بنانے کے بعد لیگ
اور کانگریس کے تعلقات میں لگاتار تلخی بڑھتی چلی گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد لیگ کو فرقہ وارانہ
تنظیم مانتے تھے۔ بہار کانگریس کے کچھ مسلمانوں نے مولانا سے یہ شکایت کی تھی کہ ایک
شخص ایک ہی وقت میں ہندو مہا سبھا اور کانگریس کا ممبر کیسے ہو سکتا ہے جب کہ کانگریس
کے مسلمان لیگ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے؟ اس پر مولانا آزاد نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ
''یہ بات ہمارے لیے بالکل صاف ہونی چاہیے کہ ہماری کمیٹیوں کے عہدے دار بیک وقت
کانگریس اور ہندو مہا سبھا سے بندھے رہیں۔ خود کانگریس کا کانسٹی ٹیوشن اس بارے میں
صاف ہے البتہ ہم نے کمیونل جماعتوں کی فہرست ابھی تک شائع نہیں کی ہے تاہم جہاں
تک ہندو مہا سبھا اور مسلم لیگ کا تعلق ہے ہمیں قلم لگانے میں ذرا بھی تامل نہیں ہو سکتا
(یعنی وہ کمیونل ہیں)'' (۱۲۲)۔ بہار میں لیگ کے بڑھتے اثرات کو روکنے کے لیے وہ
دوسری پارٹیوں سے سمجھوتہ کرنے کے لیے بھی تیار تھے۔ یہاں ہونے والے ضمنی انتخابات
میں چھوٹا ناگپور کی ایک سیٹ کے بارے میں انھوں نے راجندر بابو کو لکھا تھا کہ ''زیادہ بہتر
یہ تھا کہ انڈپنڈنٹ پارٹی سے بات ہو جاتی اور وہ اپنا آدمی کھڑا کر دیتے'' (۱۲۳)۔ فرقہ وارانہ
اثرات دور کرنے کے لیے اور مسلمانوں میں اعتماد پیدا کرنے کے لیے مولانا آزاد چاہتے
تھے کہ کانگریسی مسلمانوں کی شکایتیں دور کی جائیں۔ کسی شخص کے لیگ اور کانگریس اور ہندو
مہا سبھا کا ایک ساتھ ممبر نہ ہونے کے بارے میں اعلان کیا جائے اور ہندو و مسلمان لیڈر
علاقے میں ایک ساتھ دورہ کریں اور دوسری پارٹیوں کو بھی ساتھ لے کر چلا جائے (۱۲۴)۔

جب انھوں نے اڑیسہ میں بنا کسی ضرورت کے سرکار میں ایک مسلم ممبر بڑھانے کی رائے دی تھی تو ان کا مقصد یہی تھا کہ ایسا کرنے سے کانگریس کی فراخدلی کی وجہ کر لیگی اثر گھٹ جائے گا(۱۲۵)۔ اس کے ساتھ ہی وہ بنگال لیگ کے لیڈر سر سکندر حیات خاں کے ساتھ ایک سمجھوتے کی گفتگو بھی کر رہے تھے۔ انھوں نے راجندر بابو کو اس کی اطلاع دیتے وقت لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر زور دیا تھا(۱۲۶)۔

مارچ ۱۹۳۷ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے عوام سے رابطہ بڑھانے کے لیے صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو ہدایت دی تھی(۱۲۷)۔ اسی ماہ میں انھوں نے مسلمانوں سے رابطۂ قائم کرنے کے لیے کانگریس کمیٹی کے ذریعہ ایک الگ شعبہ قائم کرنے کا اعلان کیا تھا(۱۲۸)۔ مولانا آزاد بھی مسلمانوں کو کانگریس کی حمایت میں لانا چاہتے تھے۔ ان کی ہر کوشش اسی مقصد کے تحت ہوتی تھی کہ لیگ کے اثرات کم ہوں اور کانگریس کا اثر بڑھے۔ مثال کے طور پر یوپی میں ضمنی انتخابات کے وقت لیگ، جمعیۃ العلماء کے اثر سے مسلمانوں کو اپنی حمایت میں کر لینا چاہتی تھی۔ اسی کوشش میں مرادآباد کے ایک زمیندار عبدالسلام کے مکان پر ۵/مئی ۱۹۳۷ء کو جمعیۃ العلماء کی ایک نشست ہوئی تھی، جس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ مستقبل کے لیے کانگریس سے گارنٹی حاصل کیے بغیر کانگریس میں جانے سے انکار کیا جائے۔ مولانا آزاد اس طرح کانگریس کے خلاف لیگ کو طاقت ور ہوتے دیکھ کر خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے، لہٰذا انھوں نے ۱۲/مئی ۱۹۳۷ء کو الہ آباد میں جمعیۃ العلماء کی ایک نشست بلا کر علماء کو اس بات کے لیے راضی کر لیا کہ وہ بغیر کسی شرط کے لیگ کے پارلیمانی بورڈ سے رشتہ توڑ کر کانگریس میں شامل ہو جائیں گے(۱۲۹)۔ ایسا کر پانا مولانا کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ مولانا آزاد نے ''مسلم ماس کنٹیکٹ'' یا مسلم عوامی رابطہ پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے ''مسلمان اور کانگریس'' کے نام سے ایک کتاب لکھ کر قومی کاموں اور کانگریس کے لیے سازگار ماحول بنانے میں تعاون کیا(۱۳۰)۔ اس کتاب میں انھوں نے لکھا تھا کہ ''جس طرح ایک ہندو فخر کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں''(۱۳۱)۔ مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے کی دعوت دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ''مسلمان دیکھیں کہ یہ کیا بدبختی ہے کہ ملک کی ترقی و فلاح کا مسئلہ ہی سرے

سے ہندو مسئلہ ہوگیا۔ ہاؤس آف کامنس میں بحث آئے یا کانگریس کے اسٹیج پر، مسئلۂ ہند کے معنی ہندو مسئلہ ہے۔ حالانکہ ملک کی ترقی کی ذمہ داری اگر ہندوؤں پر ملک کی طرف سے تھی تو اپنے تئیں بھولنے والے، تمھارے سر تو خدائے ذوالجلال کی طرف سے تھی۔ دنیا میں صداقت کے لیے جہاد اور انسانوں کو غلامی سے نجات دلانا تو اسلام کا قدرتی مشن ہے۔ تم تھے کہ تم کو خدا آگے بڑھانا چاہتا تھا لیکن افسوس کہ تم نے پہلے خدا پھر اپنے آپ کو بھلا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پیچھے کی صفوں میں بھی تمھارے لیے جگہ نہیں''(۱۳۴)۔ مسلمانوں میں ہندوؤں کے دباؤ کی جو غلط فہمی پھیلی ہوئی تھی اس کو دور کرنے کے لیے مولانا نے لکھا تھا کہ 'ہندو اکثریت کے عفریت کا خوف بھی دل سے نکال دیجیے ... طاقت محض تعداد پر نہیں بلکہ اور باتوں پر موقوف ہے۔ اصل شے قوموں کی معنوی طاقت ہے، جو اس کے اخلاق، اس کے کیرکٹر، اس کے اتحاد سے پیدا ہوتی ہے۔ اسلام کی طاقت کبھی وابستہ تعداد کثرت و قلت سے نہیں رہی اور اب بھی جن دلوں میں اسلام ہو وہاں اکثریت بالکل بے اثر ہے''۔ انھوں نے کانگریس کے ساتھ مل کر ملک کی آزادی کے لیے کام کرنے کو مذہبی فریضہ بتاتے ہوئے کہا کہ ''آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق و صداقت اور انسانی بند، استبداد و غلامی کے توڑنے کے لیے کی جائے۔ پس اٹھ کھڑے ہو، خدا تم کو اٹھانا چاہتا ہے اس کی یہی مرضی ہے کہ مسلمان کہیں بھی ہوں بیدار ہوں اور اپنے فراموش کردہ فرض جہاد کو زندہ کریں۔ ہندوستان میں تم نے کچھ نہیں کیا حالانکہ اب تمھارا خدا چاہتا ہے کہ تم یہاں بھی وہی سب کرو جو تم کو ہر جگہ کرنا چاہیے''(۱۳۳)۔ مسٹر جناح کانگریس کے ''مسلم ماس کانٹیکٹ پروگرام'' کو ''مسلم میسکر کانٹیکٹ پروگرام'' (Muslim Massacre Contact Programme) کہا کرتے تھے(۱۳۴)۔ لیگی حلقوں میں اس پروگرام کے خلاف سخت ردِّعمل ہوتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ ''کانگریس چاہتی ہے کہ وہ مسلم سیٹوں پر بھی قبضہ کر لے اور منسٹری بنانے کے وقت مسلمانوں کی دوسری پارٹی اسمبلی میں نہ ہو اور پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ صحیح معنوں میں اسمبلی میں قائم ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں مسلمان وزیر کانگریس کے رحم و کرم پر رہیں گے''(۱۳۵)۔

لیگ کے پاس کوئی اقتصادی پروگرام نہیں تھا اور نہ لیگ عوامی سطح کی تنظیم

تھی۔ ۱۹۳۷ء میں مشہور شاعر علامہ اقبال نے مسٹر جناح کو اس سلسلے میں ایک خط لکھ کر اس جانب سے خبردار بھی کیا تھا کہ اگر لیگ اس طرف کوئی کام نہ کر سکی تو اسے عوام کی حمایت و تعاون نہیں ملے گا (۱۳۶) لیکن لیگ کے پاس کوئی پروگرام نہیں مہیا ہو سکا۔ اس لیے اسے فرقہ وارانہ مسئلوں کو نیا رنگ دینا شروع کر دیا۔ اتنا ہی نہیں اس نے سماجی اور سیاسی مسئلوں کو بھی فرقہ وارانہ شکل میں پیش کرنا شروع کر دیا اور کانگریسی حکومت کو بدنام کرنے کے لیے بھڑکانے والا رویہ اختیار کر لیا۔ لیگ نے کہنا شروع کر دیا کہ ''ہندوؤں کو مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں پر حاکمانہ غلبہ حاصل ہو گیا ہے اور ان کی جان، مال، آزادی و عزت ہر چیز خطرے میں ہے'' (۱۳۷)۔ بہار اور یوپی میں اس طرح کا ماحول تیار کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی جس میں کانگریس سرکاروں کو بری سے بری شکل میں عوام کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ مدھیہ پردیش میں ناگپور کا اردو اخبار ''جدو جہد'' فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے میں اہم رول ادا کر رہا تھا (۱۳۸)۔ کانگریس کے خلاف لگائے جانے والے الزامات کا عوام کے بیچ پروپیگنڈہ کرنے کے لیے بڑی تعداد میں لٹریچر چھاپا جا رہا تھا (۱۳۹)۔ لیگ کی پالیسی دوسری جنگ عظیم کے زمانے کے حکمراں ''ہٹلر'' کے وزیر پروپیگنڈہ ''گوئبلس'' جیسی تھی کہ ایک جھوٹ کو سو بار سچ کہا جائے تو وہ سچ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو کے لفظوں میں ''لیگی پروپیگنڈوں کی بنیاد بار بار دہرانے پر رکھی جاتی تھی۔ خاص واقعات کبھی بیان نہیں کیے جاتے۔ صفائی کے لیے جو مطالبہ اٹھایا جاتا ہے، وہ ٹال دیا جاتا ہے۔ صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ ''اسلام خطرے میں ہے'' کی لگاتار پکار ہوتی رہے، یہ چنگاری کا کام کرتی ہے۔ جذبات اُبھرتے ہیں، غصہ بھڑکتا ہے اور فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ جاتی ہے اور یوں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے'' (۱۴۰)۔ لیگی لیڈران بھی اس کام میں پیچھے نہیں تھے۔ ۲۰؍ جولائی ۱۹۳۷ء کو مسٹر فضل الحق نے اسمبلی کے ممبران کو ایک خط لکھ کر اس میں کانگریس کو ''ہندو مہا سبھا کے ذریعہ کنٹرول شدہ'' اور ''فرقہ وارانہ تنظیم'' کا نام دیا تھا (۱۴۱)۔ لیگی الزامات کے کھوکھلے پن کی حیثیت اس بات سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ جب کبھی لیگ کا کوئی ممبر صحیح بات کہنے کی کوشش کرتا تھا تو اسے پارٹی سے نکال دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ مدراس سرکار کے وزیر مسٹر یعقوب حسین کے ذریعہ کانگریس کے ہاتھوں میں اقلیتوں کے حقوق محفوظ بتانے پر انھیں لیگ سے نکال دیا گیا تھا (۱۴۲)۔ خود

مسٹر جناح بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں تھے۔ انھوں نے ''آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن'' کے کلکتہ اجلاس میں دسمبر ۱۹۳۷ء میں کہا تھا کہ میرے ہندو دوست جو قوم پرستی، آزادی اور خود مختاری کی بات کرتے ہیں وہ مسلمانوں کو اس کے حلقے سے باہر نکال دیتے ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبا سے انھوں نے کہا تھا کہ کانگریس نے مسلمانوں کے اندر اختلافات کو بڑھاوا دیا ہے (۱۴۳)۔ دوسری طرف چٹگاؤں کے مسلمان وکیلوں، تاجروں وغیرہ نے اس طرح کے اشتہار تقسیم کیے تھے کہ ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلم مخالف قانون پاس کیے جا رہے ہیں۔ مسٹر فضل الحق نے بھی اپنی کچھ تقریروں میں ہندو صوبوں میں مسلمانوں پر ظلم ہونے کا ذکر کیا تھا اور اپنے صوبے میں اس کا بدلہ لینے کی بات کہی تھی (۱۴۴)۔ کانگریس کی جانب سے لیگی الزامات کی تردید کرنے کے لیے مولانا آزاد نے مسٹر فضل الحق سے مانگ کی تھی کہ وہ ان واقعات کے بارے میں بتائیں۔ یا تو انھیں درست کیا جائے گا یا کانگریس سرکار استعفیٰ دے دے گی (۱۴۵)۔ لیگ مولانا کے چیلنج کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ مولانا کے چیلنج سے لیگی اتنے چڑھ گئے تھے کہ وہ ان کے خلاف بھدّے قسم کا پروپیگنڈہ کرنے لگے کہ مولانا کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھنا چاہیے کیوں کہ یہ کانگریسی ہیں۔ اتنا ہی نہیں لیگ سے متاثر خلافت کمیٹی نے کلکتہ میں مولانا آزاد کی جگہ پر نیا امام مقرر کرنے کے لیے اپنی کارروائیاں بھی شروع کر دی تھیں (۱۴۶)۔ ان باتوں کے باوجود مولانا اپنے فرائض سے متزلزل نہیں ہوئے۔ انھوں نے کانگریس پارلیمانی بورڈ کے ممبر کے ناطے لیگ کے ذریعہ عائد کردہ الزامات سے متعلق واقعات کی جانچ کرنا شروع کر دیا۔ وزارتی سطح پر جانچ کرنے پر انھوں نے الزامات کو غلط پایا۔ مکمل تشفی نہ ہونے پر انھوں نے بہار کے واقعات کے لیے ڈاکٹر محمود سے جانچ کروائی لیکن واقعات بالکل ہی بے بنیاد اور غیر حقیقی پائے گئے (۱۴۷)۔ پھر بھی لیگ نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ کانگریسی صوبوں میں مظالم ہوئے ہیں، ۲۰؍ مارچ ۱۹۳۸ء کو پیرپور کے راجہ سید محمد مہدی کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی، جس نے ۱۵؍ نومبر ۱۹۳۸ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی (۱۴۸)۔ پیرپور کمیٹی رپورٹ میں جو واقعات کانگریسی سرکاروں کے مبینہ مظالم کی شکل میں بتائے گئے ان میں کئی ایسی باتیں کہی گئی تھیں جو اپنے آپ میں یا تو غیر اہم تھیں یا بالکل معمولی تھیں لیکن انھیں لیگ نے زبردستی فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی

تھی(۱۴۹)۔ مولانا آزاد نے پیرپور میں لگائے گئے الزامات کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''مدھیہ پردیش کے کچھ اخباروں نے ضلع چھندواڑہ کے ایک دیہاتی اسکول میں پڑھائی سے پہلے سرسوتی پوجا ہونے اور اس میں مسلم طلبا کو شامل کرنے کی خبر چھاپی تھی۔ میں نے حکومت سی. پی. سے اس معاملے کی تحقیقات کروائی۔ محکمۂ تعلیم کے سکریٹری نے بتایا کہ تمام ضلعوں میں اس نام کا کوئی گاؤں نہیں تھا۔ کچھ اردو اخباروں نے ایک ضلع بورڈ کے ذریعہ اردو اسکول توڑنے کی خبر چھاپی تھی۔ جانچ پر پتہ لگا کہ اسے توڑا نہیں گیا تھا بلکہ ایک دوسرے اسکول میں ملا دیا گیا تھا۔ پارلیامنٹری سب کمیٹی نے سی. پی. کے وزیر اعظم کو اردو اسکول کو الگ کرنے کے لیے لکھا اور انھوں نے ضروری کارروائی کے احکامات جاری کر دیے۔ اسمبلی کے کچھ مسلمان ممبروں کی مانگ تھی کہ وہاں کی اسمبلی میں ہونے والی تقریریں اردو رسم الخط میں چھاپی جایا کریں، جب کہ سی. پی. کی ہندوستانی کی تقریریں ہمیشہ ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں چھپتی ہیں''۔ ودّیا مندروں کے نام پر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے کہا کہ ''اس کا مطلب ہے ''تعلیم حاصل کرنے کا گھر''، جن لوگوں نے اس کا نام بدلنے کی شکایت پر زور دیا ہے وہ اس بات سے بھی ناواقف نہیں ہوں گے کہ حکومت سی. پی. نے ''ودّیا مندر'' کے ساتھ ''بیت العلوم'' کا نام بھی تسلیم کر لیا ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ دونوں نام استعمال کیے جا سکتے ہیں''(۱۵۰)۔ لیگ کے سارے الزامات اور کانگریس مخالف پروپیگنڈے کے بارے میں مولانا آزاد کا کہنا تھا کہ ''مسلم لیگ کا سارا شور وغوغا وزارت حاصل کرنے کا ہے۔ اگر لیگ کو وزارتیں مل جائیں تو آج جن شکایتوں کے خلاف غل مچایا جا رہا ہے، ان سے دس گنا شکایتیں ہوئی ہوتیں، تب بھی کوئی آواز نہ اُٹھتی، بلکہ لیگ کے یہ افراد وزارت کی کرسیوں پر بیٹھ کر ان شکایتوں کی وہ تاویلیں کرتے جو آج ہمارے ذہن میں بھی نہیں آتیں''(۱۵۱)۔

لیگ کا اصل مقصد تو کانگریس کو بدنام کرنا تھا(۱۵۲)۔ کانگریس نے مسلمانوں پر ظلم کیے ہوں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی(۱۵۳)۔ جب کہ کانگریس کی حکومت میں مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے ہندوؤں پر نامناسب اور غیر ضروری پابندیاں لگائی گئی تھیں۔ کانگریس کے نظم حکومت کی صفائی اور غیر جانبداری اس سے خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ کانگریسی وزرا کے کہنے پر بھی گورنروں نے اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے اپنے

حقوق خاص کا استعمال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی تھی(۱۵۴)۔ خود مسٹر جناح صحافی جان گنتھر کو کانگریسی مظالم کی کوئی مثال نہیں بتا سکے تھے(۱۵۵)۔ اس کا سب سے زبردست ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ یوپی کے موجودہ گورنر مسٹر ہیری ہیگ نے لندن کے کیکسٹن ہال میں تقریر کرتے وقت کانگریسی حکومت کی غیر جانبداری کو تسلیم کیا تھا(۱۵۶)۔ انھوں نے مشہور صحافی مسٹر درگا داس سے صاف طور پر کہا تھا کہ پیرپور رپورٹ میں کانگریس پر جو الزام لگائے گئے ہیں وہ سراسر غلط ہیں(۱۵۷)۔ خود مولانا آزاد نے کانگریس مجلس عاملہ کی اپریل ۱۹۴۰ء کی بیٹھک میں ڈاکٹر سید محمود کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں کانگریس پارلیمانی بورڈ کے ایک ممبر کے ناطے اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ کانگریس سرکاروں کی طرف سے مسلمانوں پر کوئی ظلم نہیں کیا گیا(۱۵۸) لیکن لیگ کی طرف سے کانگریس کی مخالفت کبھی بند نہیں ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے پر وائسرائے کے ذریعہ کانگریسی سرکاروں سے مشورہ کیے بغیر ہندوستان کے جنگ میں شامل ہونے کا اعلان کر دینے کی وجہ سے جب کانگریسی سرکاروں نے استعفیٰ دیا تو مسٹر جناح نے مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ کانگریسی سرکاروں کے خاتمے پر ۲۲ر دسمبر کو خوشی منائی جائے(۱۵۹)۔ مولانا آزاد نے مسٹر جناح کے اس اعلان کی مذمت کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس کانگریس نے اقتدار کے مقابلے میں فرائض کو فوقیت دے کر نہ صرف ہندوستان کی آزادی بلکہ مشرق کے تمام دبے کچلے لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے عہدہ چھوڑ دیا ہے، مسٹر جناح اس کانگریس کی حکومت ختم ہو جانے پر مسلمانوں سے اپیل کر رہے ہیں کہ مسجدوں میں جا کر خدا کا شکر ادا کریں۔ یہ تصور کرنا بھی محال ہے کہ مسلمانوں کی کوئی بھی جماعت، چاہے اس کا کانگریس سے کتنا بھی اختلاف کیوں نہ ہو، وہ دنیا کے سامنے اس رنگ میں پیش ہونا پسند کرے گی(۱۶۰)۔

خلاصہ

قومی جدوجہد آزادی کے گاندھیائی دور میں جو مسائل کانگریس کے سامنے آئے تھے ان سبھی کے حل میں مولانا آزاد نے نہایت ہی اہم کردار نبھایا تھا۔ مہاتما گاندھی کی عدم تشدد پر مبنی سول نافرمانی کی تحریک میں انھوں نے اقلیتوں کی حفاظت کے نام پر ہندوستان

میں فرقہ وارانہ منافرت بڑھانے کی برٹش سرکار کی پالیسی کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ہی لیڈرشپ میں ایک ساتھ کام کرنے کے لیے تیار کرنے کی جی توڑ کوششیں کی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اسمبلی سیٹوں کا بٹوارہ یا کابینہ کی تشکیل یا فرقہ وارانہ فساد، کسی بھی سوال پر ان دونوں فرقوں کے اتحاد کی بنیاد کبھی کمزور نہیں ہونی چاہیے۔ وہ اپنی کوششوں میں کسی طرح کی ڈھیل نہیں آنے دیتے تھے خواہ انھیں کتنی ہی بے عزتی کیوں نہ برداشت کرنی پڑے۔ لیگی لیڈران انھیں کافر کہہ کر ان کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا چاہتے تھے(۱۶۱)۔ لیکن مولانا کے قدم فرض کی راہ سے متزلزل نہیں ہوئے۔ کانگریس کے اندرونی نظم ونسق میں بھی وہ نہایت استحکام کے ساتھ ڈسپلن برتنے کے حق میں تھے۔ فرقہ پرست تنظیموں سے منسلک لوگوں کا کانگریس میں شامل ہونا انھیں بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ پارٹی ڈسپلن توڑنے والے ہر شخص سے ڈسپلن کی کارروائی پر عمل کرانا چاہتے تھے خواہ اس سے متعلق شخص کتنا ہی معزز کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ بنگال صوبائی کانگریس کمیٹی کی اندرونی کھینچ تان میں انھوں نے محسوس کیا تھا کہ اگر سبھاش چندر بوس اپنے سخت رُخ پر قائم رہتے ہیں تو بنگال کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دے دیں اور کانگریس ان پر ضابطے کی کارروائی کرے(۱۶۲)۔ ۱۹۲۷ء میں مدن موہن مالویہ کے ذریعہ پنجاب کے الیکشن میں کانگریس کی مخالفت کرنے والے دو امیدواروں کی حمایت کرنے پر مولانا آزاد نے اس بات پر زور دیا تھا کہ مالویہ جی کے خلاف ضابطے کی کارروائی کی جانی چاہیے جب کہ شنکر راؤ دیو، بھولا بھائی دیسائی، سردار پٹیل اور اچیوت پٹوردھن اس کے حق میں نہیں تھے(۱۶۳)۔ اسی طرح وہ مدھیہ پردیش کے وزیر اعظیم ڈاکٹر نارائن بھاسکر کھرے اور دوارکا پرشاد مشر کے آپسی تنازع میں ڈاکٹر کھرے کے ذریعہ کانگریس کی پارلیمانی کمیٹی سے مشورہ کیے بغیر پرانے وزیر ہٹا کر نئے وزیر بنا لینے کی کارروائی کو غلط مانتے تھے اور چاہتے تھے کہ ڈاکٹر کھرے اپنی سرکار کا استعفیٰ پیش کریں اور دوبارہ قیادت کے لیے چناؤ میں کھڑے نہ ہوں(۱۶۴)۔ کانگریس کی طاقت بڑھانے اور لیگ کی قوت گھٹانے کے لیے وہ دوسری پارٹیوں کے ساتھ تعاون کرنے میں بھی کوئی برائی نہیں سمجھتے تھے۔ لیگ کی سیاسی قوت ختم کرنے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ کانگریس کے ذریعہ اقتدار چھوڑنے کے بعد بھی وہ بہار میں لیگ کے خلاف ایک طاقتور پارٹی کھڑی کرنا چاہتے تھے اور بہار کے مشہور مسلم سیاست داں مسٹر محمد یونس کو اس کام کے

لیے برابر ترغیب دیتے رہتے تھے۔ اس مسئلے پر ڈاکٹر راجندر پرشاد بھی مولانا آزاد سے متفق تھے(۱۶۵)۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لیگ کو پوری طرح ختم کر دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے صوبۂ متحدہ کی سرکار کی تشکیل کے وقت لیگ کے سامنے جو تجاویز رکھے تھے وہ صرف سیاسی سمجھوتے کے نظریے سے ہی رکھے گئے تھے۔ ان تجاویز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سماجی اور دیگر حلقوں سے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے لیگ کا قائم رہنا ضروری سمجھتے تھے اور اسی لیے وہ کچھ لوگوں کے لیگ میں شامل ہو کر کام کرنے کو برا نہیں گردانتے تھے۔ ہاں! وہ اتنا ضرور چاہتے تھے کہ لیگ سے رجعت پسندانہ اثرات دور ہو کر ترقی کی راہ اپنانے والوں کا اثر آنا چاہیے(۱۶۶)۔ مولانا آزاد سیاسی حلقے میں لیگ کے طریقۂ کار کو صحیح نہیں مانتے تھے کیوں کہ اس کی بنیاد فرقہ وارانہ تھی اور کانگریس قوم پرست تنظیم تھی۔ اسی لیے ان کی ساری قوت قوم پرستی کو بڑھاوا دینے نیز اسے طاقتور و مضبوط بنانے میں لگی رہی۔ انھیں عہدے کی لالچ نہیں، کام کی لگن تھی۔ اس لیے انھوں نے ۱۹۳۹ء کے لیے صدر کانگریس کا چناؤ لڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ کانگریس کا کام اچھی طرح چلنے میں تعاون کرنے کے لیے ہی انھوں نے ۱۹۳۹ء میں سبھاش چندر بوس کی مجلس عاملہ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ یہ ان کی صلاحیت، لگن اور عمل کا ہی نتیجہ تھا کہ سبھاش بابو کے بیمار ہونے پر انھوں نے صدر کانگریس کی ذمہ داری سنبھالی تھی(۱۶۷)۔ ان کی یہ لگن، اہلیت، صلاحیت، کارکردگی نیز ذہانت اور زاویۂ نگاہ آگے آنے والی قومی تحریک میں مزید صحت مند اور مضبوط ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس دور میں ان کے ذریعہ کیے گئے کاموں کا جتنا اثر قومی تحریک پڑا انھی کی بنیاد پر مستقبل میں چلنے والی تحریکوں کا خاکہ ترتیب دینے میں مدد ملی۔ ان کے زبردست قومی خیالات اور کردار وعمل نے ہی انھیں آگے چل کر کانگریس مجلس عاملہ کے اندر نہایت بلند و بالا مقام پانے کا حقدار بنایا تھا۔

---

(۷)

جنگِ عظیم کا زمانہ

(۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء)

یورپ میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوتے ہی ہندوستانی سیاست میں بھی اُتھل پتھل شروع ہوگئی تھی۔ کانگریس جابر و ظالم اور شہنشاہیت پسند طاقتوں کے اشاروں پر ناچنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ مولانا آزاد دوسری جنگ عظیم کے آغاز سے بہت قبل ہی شہنشاہیت پسند طاقتوں کی ممکنہ جنگ میں ہندوستان کے استیصال کے امکانات پر نظر رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۳۶ء میں کانگریس کی سبجیکٹ کمیٹی میں انہوں نے جو تجویز رکھی تھی، اس میں ملک کو اس خطرے کے تعلق سے آگاہ کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ کانگریس کسی بھی شہنشاہیت پسند جنگ میں ہندوستان کی شمولیت کی مخالفت کرتی ہے(۱)۔ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جنگ عظیم شروع ہوگئی تھی۔ ۳ر ستمبر کو شہنشاہ انگلستان نے شہنشاہیت کے نام پیغام دیا۔ اس کے بعد ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے ہندوستان کے ذریعہ جنگ میں مدد کرنے کی امید ظاہر کی اور گاندھی جی کو گفتگو کے لیے بلایا۔ گاندھی جی نے ذاتی طور پر برطانیہ کو اخلاقی تعاون دینے کی بات کہہ دی، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ مکمل طور پر عدم تعاون کا حامی ہونے کے ناطے اس معاملے میں وہ خود قومی طرز فکر کے نمائندہ نہیں ہو سکتے تھے(۲)۔

جنگ عظیم اور مولانا آزاد

۱۴ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو مسئلہ جنگ اور برطانیہ کو تعاون دینے سے متعلق کانگریس مجلس عاملہ کی ایک بیٹھک واردھا میں ہوئی۔ اس میں گاندھی جی کا کہنا تھا کہ انگریزوں کے لیے ہمیں اپنی اخلاقی حمایت دینی چاہیے اور کابینہ کو اپنا کام کرتے رہنا چاہیے(۳) لیکن مولانا

آزاد کی نظر میں صرف ہندوستان کی آزادی کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام مشرقی ممالک کے دبے کچلے لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے نظریے سے بھی استعفیٰ دینا ضروری تھا(۴)۔

کانگریس نے واردھا میں جنگ سے متعلق فیصلوں کے لیے جواہر لال نہرو کی صدارت میں ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی۔ سردار پٹیل اور مولانا آزاد کو اس کا ممبر بنایا گیا تھا(۵)۔ اس کمیٹی نے ۱۶ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو واردھا میں لیے گئے فیصلے کا اعلان کیا۔ اس میں ہندوستانی عوام سے مشورہ کیے بغیر ہندوستان کو جنگ میں جھونکنے کے عذر کو دہراتے ہوئے کہا گیا کہ ہندوستان کے لیے جنگ اور امن کا مسئلہ ایسا ہے، جس کا فیصلہ ہندوستان کے عوام کو ہی کرنا چاہیے۔ کوئی بھی بیرونی طاقت اس کے اوپر یہ فیصلہ نہیں تھوپ سکتی ... اگر گریٹ برطانیہ جمہوریت کی حفاظت اور نشر و اشاعت کے لیے لڑتا ہے تو اسے اپنی کالونیوں میں شہنشاہیت کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ ہندوستان میں مکمل جمہوریت قائم کرنی ہوگی اور ہندوستان کے لوگوں کو یہ اختیار دینا ہوگا کہ وہ اپنا دستور تیار کریں اور اس طرح اپنے بارے میں خود فیصلہ کرسکیں نیز اپنی پالیسی متعین کرسکیں۔ آزاد جمہوریۂ ہند حملے کے خلاف باہمی دفاع اور مالی تعاون کے لیے خوشی سے دوسرے آزاد ملکوں کا ساتھ دے گا... مجلس عاملہ برٹش سرکار سے یہ توقع رکھتی ہے کہ وہ صاف صاف لفظوں میں یہ بتائے گی کہ جمہوریت اور شہنشاہیت کے سلسلے میں اس کی جنگی پالیسی کیا ہے اور کس نئے نظام کا اس نے تصور کر رکھا ہے۔ خاص طور سے وہ یہ بتائے کہ کیا یہ پالیسی ہندوستان پر لاگو کی جائے گی اور موجودہ حالات میں اس پر کس طرح عمل ہوگا۔ کیا اس پالیسی میں شہنشاہیت کا خاتمہ اور ہندوستان کے ساتھ ایک آزاد ملک جیسا سلوک کرنا بھی شامل ہے تاکہ اس کی پالیسی اس کے اپنے لوگوں کی خواہش کے مطابق متعین ہو ... مجلس عاملہ صدق دل سے ہندوستانی عوام سے اپیل کرتی ہے کہ وہ سبھی باہمی اختلافات اور جھگڑوں کا خاتمہ کر دیں اور خطرے کی اس نازک گھڑی میں ایک منظم قوم کی طرح تیار رہیں نیز اتحاد قائم کریں۔ اپنے مطالب پر جمے رہیں اور دنیا پر محیط آزادی کے اندر ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کے لیے مصمم ارادہ کریں(۶)۔

۱۷ر اکتوبر کو وائسرائے نے اعلان کیا کہ جنگ کے بعد آئین پر پھر سے غور و خوض کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت کانگریس کے ذریعہ اٹھائے گئے سوالوں کو نظرانداز کر دینا چاہتی تھی اور نئے سوالات اٹھا کر بنیادی مسائل پر فیصلہ دینے سے کترانے

کا راستہ نکال رہی تھی۔ وائسرائے کے اعلان پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد نے ایک بیان جاری کر کے کہا کہ ''اگر برٹش سرکار کا ہندوستانی عوام کے لیے آخری جواب یہی ہے تو دونوں کے آپسی تعاون کی اب کوئی یکساں بنیاد نہیں رہ گئی ہے۔ ہمارا راستہ اب پوری طرح الگ ہے۔ قومی و بین الاقوامی نظریے سے ہندوستان جن باتوں کے لیے کھڑا ہے، انہیں وائسرائے نے پوری طرح سے رد کر دیا ہے۔ اس اعلان میں آزادی، خود مختاری، حق خود ارادی یا جمہوری طرز حکومت کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ ہندوستانی عوام سے بغیر کوئی ذکر کیے ہوئے انہیں جنگ میں شامل کرنے اور جو ان کے اپنے نہیں ہیں، ان مقاصد کے لیے لڑنے یا لڑنے کو مجبور کرنے کے جواز کو ثابت کرنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ برٹش سرکار جو زمانۂ ماضی میں رہ رہی ہے، کیسے کسی خوددار ہندوستانی سے تعاون کی امید رکھتی ہے'' (۷)۔

برطانیہ کے ممبر پارلیمنٹ مسٹر اسٹیفرڈ کرپس اور مسٹر کیمبل اسٹیفن نے بھی ہاؤس آف کامن میں دیے گئے اپنے بیانات میں ان لیڈروں کے نقطۂ نظر سے مطابقت رکھنے والے خیالات ظاہر کیے تھے۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ انگریزوں کے ساتھ کوئی تعاون نہ کیا جائے۔ لکھنؤ میں شیعہ کانفرنس میں انھوں نے کہا تھا کہ واردھا کا اعلان موجودہ حالات میں سب سے بہتر ہے۔ تعاون اور عدم تعاون کے درمیان کوئی بیچ کا راستہ نہیں ہو سکتا (۹)۔ جیسا کہ مسٹر مانویندر ناتھ رائے مانتے تھے کہ جنگ سے پہلے ہمیں آزادی ملنی چاہیے (۱۰)۔ اسی طرح مولانا آزاد بھی پہلے آزادی چاہتے تھے، بعد میں وہ جنگ کے سلسلے میں غور کر سکتے تھے۔

۱۹۴۰ء میں صدر کانگریس کا سالانہ انتخاب ہونے کا وقت نزدیک آ رہا تھا۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ مولانا آزاد اس عہدے پر منتخب ہوں۔ انھوں نے ۳ر فروری ۱۹۴۰ء کو ناگپور میں اخباری نمائندوں کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''موجودہ حالات میں میرے نزدیک مولانا آزاد آئندہ سال کے لیے سب سے اچھے صدر ہوں گے'' (۱۱)۔ عہدۂ صدارت کے لیے صرف دو ہی اُمیدوار تھے۔ ایک مولانا ابو الکلام آزاد اور دوسرے مسٹر مانویندر ناتھ رائے۔ ۱۵ر فروری کو انتخاب ہوا۔ اس میں مولانا آزاد کو ۱۸۵۴ اور مسٹر رائے کو ۱۶۳ ووٹ حاصل ہوئے اور اس طرح مولانا آزاد صدر کانگریس چن لیے گئے (۱۲)۔

مولانا کے چن لیے جانے سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ برٹش سرکار کو سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مولانا آزاد نے اخباری نمائندوں سے ایک ملاقات میں کہا تھا کہ رام گڑھ کانگریس اجلاس کے بعد عدم تعاون کی لڑائی چھیڑ دی جائے گی۔ ۱۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کے رام گڑھ اجلاس میں کرسیٔ صدارت سے انھوں نے زوردار الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ ''ہندوستان لڑائی میں صرف اسی حالت میں حصہ لے سکتا ہے جب کہ اسے اپنی آزاد مرضی اور پسند سے فیصلہ کرنے کی حیثیت حاصل ہو۔ وہ ''نازی واد'' اور ''فاشی واد'' سے بیزار ہے مگر اس سے بھی زیادہ برطانوی شہنشاہیت سے بیزار ہے۔ اگر ہندوستان اپنی آزادی کے قدرتی حق سے محروم رہتا ہے تو اس کے صاف معنی ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت اپنی تمام روایتی خصوصیتوں کے ساتھ زندہ موجود ہے اور ہندوستانی کسی حالت میں تیار نہیں کہ برطانوی شہنشاہیت کی فتح مندیوں کے لیے مدد دیں'' (۱۴)۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ کانگریس کے اس نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لیے کچھ لوگوں کو یورپ بھیجا جانا چاہیے۔ وہ جواہر لال کی اس بات سے متفق تھے کہ مسٹر کرشنا مینن کو اس کام کے لیے یورپ بھیجا جائے (۱۵)۔ انگلینڈ جنگ میں ہندوستان کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مولانا آزاد اس کی اس مجبوری کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ انہیں اس میں ہندوستان کا مفاد نظر آتا تھا لیکن مہاتما گاندھی کی طرح جواہر لال نہرو بھی انگلینڈ کی مجبوری کا فائدہ اٹھانے کے حق میں نہیں تھے۔ لہٰذا انھوں نے مسٹر آصف علی کے ذریعہ برطانیہ کی مدد کرنے کے حق میں دیے گئے بیان (جسے مولانا آزاد نے قابل اعتراض مانا تھا) کی طرح لکھنؤ میں ایک بیان دیا۔ انھوں نے کہا کہ ''یہ بات ہندوستان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ انگلینڈ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس وقت ستیہ گرہ شروع کر دے'' (۱۶)۔ اس پر مولانا آزاد نے جواہر لال نہرو کو لکھا کہ ''میں نہیں جانتا کہ ہندوستان کی شان کیا ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہمارے سامنے مسئلہ کیا ہے اور ہمیں کہاں لے جائے گا۔ ہم اندھے آدمی کی طرح اندھیرے میں نہیں بھٹک سکتے، ہمیں کھلی آنکھوں سے ایک راستہ بنانا چاہیے۔ ایک راستہ اپنا کر اس پر چلنے سے انکار کرنے سے برا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم نے انگلینڈ کو پورا موقع دیا کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے لے، پر اس نے ضدی پن میں ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ ہم نے مجبور ہو کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم اس لڑائی میں حصہ نہیں لیں گے۔ اگر ہمارا نقطۂ نظر ہندوستان کی شان کے خلاف یا گاندھی جی کے مطابق

برطانیہ کو پریشان کرنے یا مشکل میں ڈالنے والا ہے تو پھر اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ہم اس کے لیے ذمہ نہیں ہیں، اس کی ذمہ داری برطانیہ کی ناعاقبت اندیشانہ غرور نفس پر ہے۔ آپ کہتے ہیں ہمیں اس موقع پر ستیہ گرہ شروع نہیں کرنا چاہیے لیکن ستیہ گرہ سے آپ کی مراد کیا ہے؟ کیا وہ لڑائی کا ایسا نیا اعلان ہوگا کہ جسے کانگریس کو ابھی طے کرنا ہے؟ کانگریس کی لڑائی اور کچھ نہیں بس لڑائی میں کوئی مدد دینے سے روکنے کی ہے۔ ہم اب تک اس کام میں ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھے ہیں لیکن مستقبل میں ہمیں لازمی طور سے آگے بڑھنا ہوگا۔ اپنے آپ کو گرفتار کرانے اور لڑائی کے آرڈی نینسوں کے مارے اس کی شکل اپنے آپ سول نافرمانی کی ہو جائے گی۔ اگر آپ کے اخلاقی فلسفے کو ہندوستان کی شان کو خیال میں رکھتے ہوئے درست سمجھ لیا جائے تو اس کا ایک ہی مطلب نکلے گا یعنی رام گڑھ کانگریس کا فیصلہ ہندوستان کی شان اور عزت کے بالکل خلاف تھا۔ میں نہیں سمجھ پاتا کہ اتنا اُلجھن بھرا اور بے تکا خیال آپ کے دماغ میں کہاں سے گھس گیا۔ کم سے کم آپ سے تو یہ امید نہیں کی جاتی تھی کہ آپ اس طرح سوچیں گے" (۱۷)۔ مولانا کے اس خط سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ انگلینڈ سے آزادی کا وعدہ لے کر ہی اسے کوئی رعایت دے سکتے تھے و گرنہ وہ کوئی چھوٹ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ انگلینڈ کو مدد بہم پہنچا کر زمانہ جنگ میں ہی آزادی لینے کے لیے تیار تھے۔ بشرطیکہ وہ حقیقی ہو۔ انہوں نے ۱۹۳۹ء میں مسٹر کرپس سے کہا تھا کہ اگر ہندوستان کو آزادی دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے تو گاندھی جی کے خیالات کے برخلاف سارا ہندوستان جنگ میں مدد کرنے میں میرا ساتھ دے گا (۱۸)۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد اور گاندھی جی کے درمیان اختلاف رائے ۱۸ر جون ۱۹۴۰ء کی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں کھلکر سامنے آیا۔ کانگریس مجلس عاملہ نے اس میٹنگ میں تجویز رکھی کہ اگر انگلینڈ فوری طور پر بھارت میں قومی حکومت قائم کرنے اور جنگ کے بعد مکمل حصول آزادی کا ہندوستانی دعویٰ قبول کرے تو ہندوستان اسے تعاون دے سکتا ہے۔ گاندھی جی اس بات سے متفق نہیں تھے، لہٰذا انہوں نے کانگریس سے خود کو الگ کر لیا (۱۹)۔ اب کانگریس اس سے کم کچھ بھی قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ جولائی ۱۹۴۰ء میں پونے میں کانگریس مجلس عاملہ کی میٹنگ میں مولانا آزاد نے اس پالیسی کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ گاندھی جی نے دنیا کو عدم تشدد کا پیغام دیا ہے اس لیے اس کی تشہیر کرنا ان کا فرض ہے۔ نیشنل کانگریس کی میٹنگ

میں ہمیں ہندوستانی قوم کے نمائندے کی حیثیت سے غور کرنا ہے۔ کانگریس ملک کے حصول آزادی کا حلف لینے والی سیاسی تنظیم ہے۔ امن عالم کا انتظام کرنے والی تنظیم نہیں۔ ایمانداری سے ہم وہاں تک نہیں جا سکتے، جہاں تک گاندھی جی چاہتے ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ہماری کمزوری ہے لیکن انسانیت کے ناطے ہم اس میں حصہ دار ہیں۔ ہمیں اپنے ملک کے سامنے درپیش ہر مسائل کا ازالہ کرنا ہے۔ ہمیں گاندھی جی کے کانگریس سے الگ ہو جانے کی حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے اور بہادری سے اس کا سامنا کرنا چاہیے (۲۰)۔ مہاتما گاندھی نے کانگریس سے اختلاف ہونے پر عدم تشدد میں یقین رکھنے والے اپنے پیروکاروں سے اپیل کی تھی کہ اکثریت رکھنے والوں کے کاموں میں خلل اندازی کے پیش نظر کانگریس سے باہر آجائیں (۲۱)۔ اس پر اپنا ردِّ عمل ظاہر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا کہ ہم گاندھی جی کی لیڈر شپ بنائے رکھنے میں ناکام رہے۔ اگر گاندھی جی کی قیادت حاصل نہ ہو سکے تو کانگریس کو اگلے جنگ کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لینی چاہیے۔ ہم بے عمل بنے نہیں رہ سکتے اور غیر معینہ مدت تک انتظار بھی نہیں کر سکتے، جو لوگ عدم تشدد میں یقین رکھتے ہیں ان کے لیے کانگریس سے الگ ہونا ضروری ہے۔ گاندھی جی کے الگ ہو جانے پر اتحاد کی اور بھی سخت ضرورت ہے (۲۲)۔ کانگریس کے اس نظریے کا ہی نتیجہ تھا کہ ہندوستان کے سکریٹری مسٹر ایمری نے بلیک پول میں ہندوستان کو اپنا قانون تیار کرنے دینے پر اس وقت سمجھوتے میں رکاوٹ نہ آنے کی خواہش ظاہر کی تھی (۲۳)۔

اگست تجاویز

پونہ میں کانگریس نے قومی حکومت کی تشکیل اور جنگ کے بعد آزادی دینے کے وعدے کے بدلے انگلینڈ کو جنگ میں تعاون دینے کی تجویز رکھی تھی۔ اس پر وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے ۸ر اگست ۱۹۴۰ء کو ایک اعلان کے ذریعہ کانگریس کے سامنے کچھ سیاسی تبدیلیوں کی پیشکش کی، جو اس طرح ہیں:

(۱) مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈران سے بات چیت اور شاہی حکومت کے مشورے سے ان کے کچھ نمائندوں کو اپنی سرکاری کونسل میں شامل ہونے کی دعوت دینا۔

(۲) جنگ سے متعلق ایک کاؤنسل کی تشکیل کرنا۔

(۳) کچھ ذمہ داریاں پوری کرنے کے بعد ہندوستانیوں کے ذریعہ اپنا قانون بنانے کی خواہش کی تکمیل کا وعدہ۔

لیکن اقلیتوں کو خوش کرنے کے لیے یہ بھی صاف طور پر کہا گیا کہ برٹش سرکار کسی ایسی پارٹی کو اقتدار نہیں سونپ سکتی، جسے ملک کے بڑے بڑے اور سرکردہ افراد ماننے کو تیار نہ ہوں اور ان افراد کو کسی طرح حکومت میں شامل ہونے پر مجبور نہ کیا جاسکے(۲۴)۔

اس تجویز کی ایک پیشگی نقل وائسرائے نے ۴/ اگست ۱۹۴۰ء کو مولانا کو بھیج کر ۲۸/ اگست کے لگ بھگ انھیں ملاقات کی دعوت بھی دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کانگریس کے ذریعہ کوئی باقاعدہ جواب بھیجنے سے پہلے صدر کانگریس ان سے کہیں بھی کسی کے ساتھ مل لیں۔ انھوں نے لکھا کہ میرا خیال اگست کے آخر یا ستمبر کے وسط تک ان اداروں میں شامل کیے جانے والے نمائندوں کے نام کا اعلان کر دینے کا ہے۔ اس پر مولانا آزاد نے ان سے پوچھا کہ جب حکومت نے پہلے سے ایک پروگرام پر عمل کر لینے کا تہیہ کر لیا ہے تو بات چیت کرنے سے کیا فائدہ ہوگا؟ جواب میں انہوں نے اسے شاہی حکومت کی پالیسی بتاتے ہوئے کانگریس کے ان کاؤنسلوں میں شامل ہونے کی اُمید کے ساتھ قطعی جواب بھیجنے سے پہلے ملاقات کی دعوت دی(۲۵)۔ جواب میں مولانا آزاد نے انھیں ایک خط میں لکھا کہ حکومت برطانیہ کے اعلان اور آپ کے خط سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان تجاویز کے ڈھانچے میں کوئی بھی گفتگو فائدہ مند نہیں ہوگی(۲۶)۔ ان تجاویز کو مولانا نے اس لیے ٹھکرا دیا کہ اعلان میں قومی حکومت بنانے کا کوئی ذکر نہیں تھا(۲۷)۔ اگر کانگریس وائسرائے کی انتظامی کاؤنسل میں شامل ہو جاتی ہے تو پھر کانگریس کی ''پہلے ہندوستان کی پوزیشن کی وضاحت پھر جنگ میں تعاون'' کی پالیسی کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ لہٰذا ۲۲/ اگست کو واردھا میں مجلس عاملہ نے بھی ان تجاویز کو نامنظور کر دیا۔ وائسرائے کی ۸/ اگست کی تجویز اور ہندوستانی وزیر ایمری کی ۱۴/ اگست کو پارلیمنٹ کے اعلان، دونوں سے واضح ہوگیا کہ برٹش سرکار، جب تک اس کا بس چلے گا اقتدار حوالے نہیں کرے گی(۲۸)۔ اس لیے کانگریس کو ایک نیا پروگرام اپنانا ضروری ہوگیا تھا۔

مہاتما گاندھی کے چلے جانے سے کانگریس میں انتشار پیدا ہوگیا تھا۔ اسے دور کر کے گاندھی جی کو ساتھ لینے کی کوشش چل رہی تھی۔ برٹش سرکار کے ذریعہ پونہ تجویز کے نامنظور کیے جانے سے اس بات کی ضرورت اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس تجویز کے منظور نہ ہونے سے حکومت برطانیہ سے اب کسی طرح کی اُمید نہیں رہ گئی تھی۔ لہٰذا ستمبر ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی بیٹھک میں ''پونہ تجویز'' کو ردّ کر دیا گیا۔ اس میں مولانا آزاد نے کہا تھا کہ مسٹر راج گوپال آچاریہ کی وجہ کر پونہ تجویز پاس ہوئی تھی، آج وہی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اسے ردّ کیا ہے۔ مہاتما گاندھی اور کانگریس کا اختلاف نہیں رہا ہے، وہ کانگریس میں آگئے ہیں(۲۹)۔ یہاں آکر مولانا آزاد اور گاندھی جی کا راستہ پھر ایک ہو گیا۔ مولانا نے گاندھی جی کے شامل ہو جانے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان جنگ میں گھسیٹ لیا گیا۔ اپنی رائے ظاہر کرنے کا اسے ذرا بھی موقع نہ دیا گیا۔ پچھلے ۱۳ مہینے ہم نے لگاتار کوشش کی کہ جنگ میں جبراً گھسیٹنے کی جگہ اسے جنگ میں شامل ہونے دیا جائے، پر ہماری سبھی کوششوں کو ٹھکرا دیا گیا۔ اب ہمارے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہم جنگ کے سلسلے میں اپنے فیصلے کا اعلان کر دیں۔ میں گاندھی جی کے تاریخی لفظوں میں کہوں گا کہ اگر کانگریس کو مرنا ہی ہے تو ہندوستان کے حق خود ارادی کا اعلان کرتے ہوئے مرمٹے(۳۰)۔

انفرادی ستیہ گرہ

ستمبر ۱۹۴۰ء میں کانگریس مجلس عاملہ نے مہاتما گاندھی کو قیادت سونپ کر اپنے لیے ایک نئی راہ ہموار کرنے کا نظم کر لیا تھا۔ اس بیٹھک میں گاندھی جی کی ہدایت کی بنیاد پر انفرادی ستیہ گرہ کے سلسلے میں ایک تجویز پاس کی گئی تھی۔ اس کے مطابق، صرف جنگ میں ہندوستان کو اس کی خواہش کے برعکس شامل کیے جانے کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرنے نیز اس کی تشہیر کرنے کے لیے ستیہ گرہ شروع کیا جانا طے کیا گیا(۳۱)۔ ۱۶/ ستمبر کو مجلس عاملہ نے مولانا آزاد کی صدارت میں ایک تجویز پاس کر کے مہاتما گاندھی سے ستیہ گرہ کی قیادت کرنے کی التجا کی۔ انہوں نے اسے قبول کر لیا اور ونوبا بھاوے کو پہلا ستیہ گرہی منتخب کیا، جنھوں نے ۱۷/ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو اپنی قیام گاہ پونار میں یہ عہد دہرا کر کہ طاقت یا دولت سے برطانیہ کی جنگی مہمات میں مدد دینا غلط ہے، جنگ کا واحد علاج محض جنگ کی غیر متشددانہ مزاحمت ہے، ستیہ گرہ شروع کر دیا(۳۲)۔ مولانا آزاد ستیہ گرہ کو

صحیح مانتے تھے اور چاہتے تھے کہ اسے چلتے رہنا چاہیے۔ نومبر کے پہلے ہفتے میں ورکنگ کمیٹی
کی بیٹھک کے بعد ایسوسی ایٹیڈ پریس کے رپورٹر کے ذریعہ ستیہ گرہ کے ایک ماہ گزر جانے
کے سلسلے میں سوال پوچھے جانے پر بتایا کہ گاندھی جی کے حسب ہدایت نیز ان کی رہنمائی
میں چلنے والا یہ ستیہ گرہ قائم رہے گا (۳۳)۔ وہ برطانوی حکومت کی ہٹ دھرمی کا جواب
دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ کانگریس کی موجودہ کارروائی وزیر ہند لارڈ ایمری کے
ذریعہ پارلیمنٹ میں دیے گئے بیان کا معقول جواب ہے (۳۴)۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ
ستیہ گرہ آندولن صرف کانگریس تک ہی محدود نہ رہے بلکہ سارے ملک میں پھیل جائے۔
الہ آباد کے پرشوتم داس پارک میں ۱۳؍دسمبر ۱۹۴۰ء کو ایک تقریر کرتے وقت انھوں نے کہا تھا
کہ کانگریس کے سرکردہ لیڈران اور ان کے بعد عام ممبران کی گرفتاری کے بعد آندولن میں
حصہ لینے کے لیے غیر کانگریسیوں کے واسطے بھی دروازہ کھلا رہے گا لیکن شرط یہ ہے کہ
انھیں کانگریس کی ڈسپلن ماننی ہوگی (۳۵)۔ ستیہ گرہ کی یہ جنگ مخالف تحریک نہ صرف عوام
کے دلوں میں رچ بس گئی تھی بلکہ ان کے رگ وپے میں بھی سرایت کر گئی تھی۔ لوگوں میں
اتنا حوصلہ و اُمنگ نیز جوش وخروش تھا کہ انھوں نے جنگ میں مدد نہ دینے کی پالیسی کے
تعلق سے ایک نعرہ بنالیا تھا ''نہ ایک پائی نہ ایک بھائی'' (۳۶)۔

الہ آباد میں ۱۳؍دسمبر کی مذکورہ تقریر میں عوام سے سول نافرمانی کرنے اور حکومت
کو جنگی مہمات میں تعاون نہ دینے کی تلقین کرنے کے جرم میں ۳۱؍دسمبر ۱۹۴۰ء کو مولانا
آزاد کو گرفتار کرلیا گیا۔ ۳؍جنوری ۱۹۴۱ء کو انھیں ۱۸ مہینے کی قید کی سزا سنائی گئی (۳۷)۔
مولانا آزاد نے پچھلی سول نافرمانی تحریکات کی طرح اس بار کسی کو اپنا جانشین نامزد نہیں کیا
تھا، لہٰذا انفرادی ستیہ گرہ کے بانی مہاتما گاندھی نے ان الفاظ میں عوام کو ہدایت دی کہ ہر
کانگریسی اپنے آپ کو اپنا صدر مان کر کام کرے (۳۸)۔ صدر کانگریس کی گرفتاری کے بعد
ملک میں آندولن کی سرگرمیاں اور تیز ہوگئیں۔ آندولن اتنے وسیع پیمانے پر اور اتنی تیز رفتاری
سے چلا کہ کچھ ہی ماہ میں جیلیں بھر گئیں اور سرکار کو گرفتاریاں بند کرنی پڑیں۔

۱۹۴۱ء میں دورانِ جنگ انگلینڈ کمزور پڑنے لگا تھا۔ ۷؍دسمبر کو جاپان نے بھی
محوری طاقتوں کی حمایت میں امریکہ کے پرل ہاربر اور مشرقی ایشیا کے کئی حصوں پر قبضہ کر
لیا۔ سرکار اس وقت ہندوستانی لیڈروں کا تعاون حاصل کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ ہندوستانی

لیڈران کو مطمئن کرنے نیز ان کا تعاون پانے کی غرض سے ۳؍دسمبر کو انھیں رہا کرنے کا
اعلان کردیا گیا۔

۴؍دسمبر ۱۹۴۱ء کو مولانا آزاد نینی جیل سے رہا کردیے گئے (۳۹)۔ اس کے بعد
آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کی بارڈولی میٹنگ میں خود گاندھی جی کی خواہش کے
مطابق انھیں ایک بار پھر کانگریس کی قیادت سے آزاد کردیا گیا۔

گرچہ کانگریس نے انفرادی ستیہ گرہ آندولن ملتوی کردیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ
نہیں تھا کہ مولانا آزاد نے سرکار سے عدم تعاون کی پالیسی بدل لیا ہو (۴۰)۔ فاشسٹ
طاقتوں کے خلاف اور حصول آزادی کی تکمیل کے لیے برطانوی حکومت سے کسی بھی طرح
کے عدم تعاون کی پالیسی پر وہ ابھی بھی اتنے ہی مستحکم تھے جتنے کہ جنگ عظیم کے آغاز کے
وقت تھے۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں جب آسام لیجسلیچر میں کانگریس کے لیڈر مسٹر گوپی ناتھ باردولوئی
نے سعد اللہ سرکار کو گرانے کے لیے انگلستان حامی ایم۔ ایل۔ اے۔ مسٹر روہنی چودھری کے
ساتھ اس شرط پر سمجھوتہ کرلیا کہ کانگریس جنگی مہمات میں مدد دے گی اور اس سمجھوتے کے
لیے مولانا آزاد سے رسمی منظوری طلب کی تو مولانا آزاد نے صاف طور پر کہا کہ کانگریس
ایسا نہیں کرسکتی کیوں کہ ایسا کرنا کانگریس کے فیصلوں کے خلاف ہوگا (۴۱)۔

۱۵؍جنوری ۱۹۴۲ء کو مولانا نے کانگریس کی ایک بیٹھک میں کہا تھا کہ ہم اپنے
ملک کی سرکار پر کنٹرول چاہتے تھے۔ ہم جنگ یا امن کسی بھی زمانے میں آزادی یا خود
مختاری چاہتے تھے۔ کانگریس آج بھی اسی پوزیشن میں ہے، جس میں ۱۶ ماہ پہلے تھی۔ وہ آج
بھی عدم تعاون اور جنگ میں حصہ نہ لینے کی پالیسی پر قائم ہے (۴۲)۔

مولانا چاہتے تھے کہ کانگریس اور زیادہ مضبوط بنے، اس لیے انھوں نے ڈاکٹر
راجندر پرشاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کو لکھا تھا کہ زمانۂ جنگ میں مجلس عاملہ کا کوئی بھی ممبر
حکومت برطانیہ کے کسی بیان وغیرہ پر اپنا ردِّعمل ظاہر نہ کرے۔ اگر کسی بات پر اختلاف ہو
تو اسے مجلس عاملہ میں ہی اپنا خیال ظاہر کرنا چاہیے۔ مجلس عاملہ جو فیصلہ کرے وہی سب کا
فیصلہ ہونا چاہیے (۴۳)۔ وہ اس بات کی جانب سے بھی چوکنے تھے کہ انگریزوں کی مخالفت
کرنے کی پالیسی کو کہیں محوری طاقتوں کی حمایت نہ سمجھ لیا جائے۔ اس لیے وہ جاپانی حملے کی
مخالفت کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ ۲۹؍اپریل ۱۹۴۲ء کو انھوں نے الہ آباد میں کانگریس

کی ایک میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ غلامی سے بھرا ہوا دماغ ہی یہ سوچ سکتا ہے کہ جاپان ہمیں آزادی دے گا۔ اگر کوئی ہندوستانی یہ کہے کہ ہم جاپانیوں کا استقبال کریں گے تو میں یہ کہوں گا کہ اس کی غلامی سے بھری ہوئی ذہنیت ہے جو حاکموں کی تبدیلی میں یقین کرتی ہے لیکن جذبہ آزادی کے مطالب پر کبھی یقین نہیں کرتی۔ اگر ہمارا انگریزوں سے اختلاف ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ہم جاپانیوں یا کسی دوسرے حملہ ور کا اپنے ملک میں استقبال کریں (۴۴)۔ ان کا کہنا تھا کہ برطانیہ نے ہمارے لیے اپنے ہی ملک کی حفاظت کرنا ناممکن کر دیا ہے لیکن ہمیں جاپانی حملے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ یہ میرا مستحکم یقین ہے کہ غلام ملک کا واحد مذہب قوم پرستی ہوتی ہے (۴۵)۔ مولانا آزاد کے انگریزوں کی مخالفت کا دائرہ صرف جنگ، مظاہرے یا جلسیں بھرنے تک ہی محدود نہیں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ انگریزی حکومت کو کسی بھی طرح کی حمایت یا تعاون نہ دیا جائے۔ جب وائسرائے نے یوم چین منانے کے لیے ۳/ مارچ ۱۹۴۲ء کا دن مقرر کیا تھا تو مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو سے کلکتہ ریڈیو نے اس دن کے لیے پیغامات مانگے۔ اس پر مولانا آزاد نے جواہر لال نہرو کو لکھا کہ ''کلکتہ ریڈیو نے مجھے اطلاع دی ہے کہ آپ نے انہیں کوئی پیغام اس سلسلے میں دیا ہے، وہ میرا بھی پیغام ریکارڈ کرنا چاہتے ہیں۔ چین سے ہماری ہمدردی کسی وضاحت کی ضرورت نہیں رکھتی، لیکن کیا وائسرائے کے ذریعہ اس کے اپنے مقاصد کے پیش نظر منائے جا رہے یوم چین میں شریک ہونا اپنے نصب العین کے اظہار کا صحیح طریقہ ہے؟ میں ایسا نہیں سوچتا اس لیے میں ایسا کوئی پیغام نہیں دے سکتا (۴۶)۔ جنگ عظیم کے دوران ۱۴/ فروری ۱۹۴۲ء کو انہوں نے لاہور کے ایک جلسے میں کہا تھا کہ ''ہمارا رجحان اس کی طرف ہوسکتا ہے جو جمہوریت کا حامی ہو۔ اس لیے ہم نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ ہم ہندوستان کی حفاظت کرنے پر آمادہ ہیں لیکن ہمیں یہ بتایا جائے کہ ہم کس پوزیشن میں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے گھر کو خطرہ ہے لیکن ہمیں پہلے یہ تو معلوم ہوسکتا کہ واقعی ہمارا گھر ہے اور ہمیں اس میں آزادانہ طور پر رہنے کا حق ہے۔ اس وقت تک ہم نے برٹش سرکار کو کئی مواقع دیئے مگر ہمیں ٹال دیا گیا... اس وقت تک برٹش گورنمنٹ پر ایسے لوگوں کا تسلط ہے، جن کے دل میں ہندوستان کے لیے کوئی ہمدردی نہیں ہے'' (۴۷)۔

کرپس تجاویز

دوسری جنگ عظیم کے حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کا مستقبل بھی کروٹیں بدل رہا تھا۔ جرمنی و جاپان کی حالت مضبوط و مستحکم ہونے سے انگلینڈ کی پارلیمنٹ میں ہندوستان کا سوال اٹھتا رہتا تھا۔ انگلینڈ کے مانچسٹر گارجین جیسے اخبار ہندوستانی مسائل کے حل کے لیے دباؤ ڈالنے لگے تھے (۴۸)۔ ہندوستان کے مسئلے کو لے کر برٹش پارلیمنٹ میں ایک مرتبہ گرما گرم بحث و مباحثہ ہو چکا تھا۔ ۲۷/ جنوری ۱۹۴۲ء کو لارڈ پیتھک لارنس نے ہندوستان کو نو آبادیاتی خود مختاری دینے کی سفارش کی تھی اور ۳/ فروری کو لیبر پارٹی کے ممبر لارڈ فیرنگٹن نے حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان کو اسی وقت خود مختاری دینے کا اعلان کیا جائے (۴۹)۔ دنیا کے دیگر ممالک بھی ہندوستان کے مسائل کے تعلق سے بیدار تھے۔ ۹/ فروری کو ہندوستان کے دورے پر آنے والے چینی لیڈر جنرل چیانگ کائی شیک نے کلکتہ ریڈیو سے ۲۱/ فروری کو ہندوستانی عوام کے نام اپنا پیغام دیتے ہوئے برطانیہ کے ذریعہ ہندوستانیوں کے مطالبے کا انتظار کیے بغیر انہیں جلد از جلد حقیقی سیاسی قوت بخش دینے کی اُمید ظاہر کی تھی (۵۰)۔ خود مسٹر کرپس کا مشورہ تھا کہ جنگ کے فوراً بعد ہندوستان کو آزادی دے دینی چاہیے (۵۱)۔

متذکرہ بالا پس منظر کے پیش نظر ۱۱/ مارچ ۱۹۴۲ء کو برطانوی وزیر اعظم مسٹر چرچل نے مسٹر کرپس کو ہندوستان بھیجنے کا اعلان کیا (۵۲)۔ مولانا آزاد نے اس پر اپنا ردّعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ وہ دوست کی طرح مسٹر کرپس کا استقبال کریں گے (۵۳)۔ مسٹر کرپس کے ہندوستان آنے پر مولانا آزاد کو ان سے ملنے کی دعوت دی گئی۔ مولانا نے ابتدائی گفتگو کے لیے ملنا منظور کر لیا (۵۴)۔ ۲۵/ مارچ کو مولانا آزاد نے مسٹر کرپس سے گفتگو کی۔ انہوں نے مسٹر کرپس سے کہا کہ کانگریس کے خیال سے ہندوستانی فوج کی مؤثر کارکردگی کے لیے ہندوستانیوں کو ان کے ملک کی دفاع کا کنٹرول سونپنا ضروری ہے۔ مسٹر کرپس نے اس کے جواب میں جنگی کاؤنسل میں ہندوستان کی نمائندگی پر زور دیا تو مولانا نے وزارت دفاع کے قومیانے پر زور دیا تھا (۵۵)۔ اس بات چیت میں مسٹر کرپس نے مولانا آزاد سے کہا تھا کہ قومی حکومت کے ساتھ وائسرائے کا تعلق ویسا ہی ہوگا جیسا کہ

شہنشاہ کا برطانیہ کی مجلس وزارت سے ہوتا ہے(۵۶)۔ اسی بنیاد پر مولانا۔ کرپس تجاویز کو منظور کرنے کے لیے تیار تھے۔ دوسری مرتبہ کی گفتگو میں مولانا آزاد نے ہندوستانی فوج پر ہندوستانی نگرانی کا سوال پھر اٹھایا لیکن کرپس نے تکنیکی مشکلات بتا کر مجبوری ظاہر کی، جس سے مولانا آزاد مطمئن نہیں ہو سکے(۵۷)۔ ۲۹/ مارچ کو جواہر لال نہرو بھی اس گفتگو میں شامل ہو گئے۔ اس مرتبہ کرپس سے چار باتوں کی وضاحت کرائی گئی۔ پہلی تجاویز میں شامل لفظ ''نوآبادی'' کی دوسری ''ملکی ریاستوں کے انتظام کی'' تیسری ''اقلیتوں کے انتظامات کی'' اور چوتھی ''دفاعی نظم ونسق'' کے بارے میں تھیں۔ مسٹر کرپس کے مطابق لفظ ''نوآبادی'' خود مختاری کے خلاف نہیں تھا بلکہ یہ ہاؤس آف کامن اور دیگر ''نوآبادیوں'' کے اعتراض سے بچنے کے لیے رکھا گیا تھا۔ ''ملکی ریاستی انتظام'' ان کے مطابق ریاستوں کو متحدہ ہندوستان میں لانے کا واحد راستہ تھا(۵۸)۔ یکم اپریل کو مسٹر کرپس نے مولانا آزاد کو صلاح دی کہ وہ دفاعی نظم ونسق کے سوال پر سپہ سالار اعظم سر کلارڈ آچن لیک سے ملاقات کریں(۵۹)۔ ۲/ اپریل کو مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو پھر مسٹر کرپس سے ملے۔ اس ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ تجاویز میں خود مختاری کے واضح نہ ہونے کی وجہ کر ان کا قبول کیا جانا بہت مشکل ہے۔ پنڈت نہرو نے بتایا کہ انڈین کانگریس برابر ملکی حکمرانوں کی بہ نسبت ملکی ریاستوں کے عوام کی اہمیت پر زور دیتی رہی ہے۔ اس بنیاد پر بھی تجویز کا منظور کیا جانا مشکل ہے۔ اقلیتوں کے بارے میں پنڈت نہرو اور مولانا آزاد مسلمانوں کو حق خود ارادی کی اجازت دینے کو تو تیار تھے لیکن ان کا کہنا تھا کہ تجاویز کے نظم نے لیگ اور کانگریس کے درمیان اس مسئلے کے تعلق سے ہو سکنے والے نیز بہتر سمجھوتے میں مشکل پیدا کر دی ہے۔ انہوں نے ایسا ہونے پر تقسیم ہند کا اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ متحدہ ہندوستان کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہیں(۶۰)۔ کانگریس مجلس عاملہ نے کرپس تجاویز پر غور وخوض کیا اور انہیں نامنظور کر دیا۔ ۳/ اپریل کو مولانا آزاد اور پنڈت نہرو نے اس نامنظوری کی اطلاع مسٹر کرپس کو دے دی۔ بات چیت میں آزاد اور نہرو اس بات پر متفق تھے کہ دفاعی نظم ونسق کی ان کی مانگ پوری ہونے پر وہ دیگر معاملوں پر اختلاف نہیں کریں گے(۶۱)۔ مولانا کا کہنا تھا کہ دفاع کا با اثر کنٹرول حکومت ہند کے پاس رہنا چاہیے(۶۲)۔ اس مسئلے کے حل کے لیے مسٹر کرپس نے ۷/ اپریل ۱۹۴۲ء کو ایک خط مولانا آزاد کے نام لکھ کر وائسرائے کی

حکومتی کاؤنسل میں وزیر اعظم کے جنگی مشیر کی حیثیت سے بنے رہنے اور حکومتی کاؤنسل کے محکمۂ دفاع میں بھی ایک ہندوستانی مشیر کے رہنے کا دوہرا منصوبہ پیش کیا(۶۳)۔ کانگریس مجلس عاملہ نے ۷/ اپریل کو اس پر غور کر کے اس کی نامنظوری کی اطلاع مسٹر کرپس کو دے دی۔ بعد میں کرنل جانسن نے اس سلسلے میں کچھ نئے مشورے دیئے(۶۴)۔ اس کے باوجود کانگریس اور کرپس کے درمیان دفاعی نظم ونسق کے سوال پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا کیوں کہ کانگریس وائسرائے کی انتظامی کاؤنسل کی تبدیل شدہ ہیئت کی جگہ پر ایک مضبوط و مستحکم مجلس وزراء والی حکومت کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اس کے برعکس مسٹر کرپس پہلے ہی دفاعی معاملات ہندوستانیوں کو کسی بھی حالت میں نہ سونپنے کا اعلان کرتے ہوئے کہہ چکے تھے کہ ہز ہائی نس کی حکومت میں لازماً ہندوستان کی دفاعی ذمہ داری حکومت برطانیہ پر جاتی ہے جیسا کہ مولانا نے اپنے ۱۰/ اپریل ۱۹۴۲ء کے خط میں مسٹر کرپس کو مطلع کر دیا تھا۔

اپنے تجاویز کی نامنظوری پر مسٹر کرپس اتنے مشتعل ہوئے کہ انہوں نے ۱۰/ تاریخ کی شام کو ہی مسٹر جناح سے ملاقات کی اور ۱۱/ اپریل ۱۹۴۲ء کو مولانا آزاد کے نام ایک خط بھیج کر کانگریس پر اقلیتوں کے اوپر حکومت کرنے کے ارادے کا الزام لگاتے ہوئے قومی حکومت میں لیگ کی نسبت خود اکثریت حاصل کرنے کی خواہش سے متعلق کچھ ایسے معاملے اٹھائے، جس کا کوئی ذکر اب تک کی بات چیت میں نہیں آیا تھا(۶۶)۔ مولانا آزاد نے اس کے جواب میں لکھا کہ محکمۂ دفاع کے معاملے میں ہماری اور حکومت برطانیہ کے نظریات میں کافی اختلاف ہے... اپنی پہلی ملاقات میں آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک قومی حکومت بنے گی، جو مجلس وزراء (کابینہ) کی طرح کام کرے گی اور جو پوزیشن انگلینڈ کی کابینہ میں شہنشاہ کی ہوتی ہے، وہی پوزیشن وائسرائے کی ہوگی۔ اب اس سے انکار کیا جا رہا ہے یا اس کی دوسری تشریح کی جا رہی ہے... اس سوال کے تحت ہمارا رویہ یہی رہا ہے کہ ایک ملی جلی کابینہ بنے اور وہ آپسی تعاون سے کام کرے۔ کابینہ کیسے بنے اور کیسے کام کرے یہ تو ایسا سوال تھا، جس پر خصوصی سوال طے کرنے کے بعد غور کیا جا سکتا تھا اور خصوصی سوال یہ تھا کہ برٹش سرکار ہندوستانی عوام کو کتنا اقتدار سونپے۔ اس لیے اس معاملے پر آپ سے کبھی گفتگو نہ کی، اس کا ذکر بھی نہیں کیا(۶۷)۔ کرپس تجاویز کے سلسلے میں چلنے والی گفتگو ۱۱/ اپریل کو ناکام ہو کر ختم ہوگئی۔ اسی دن شام کو مولانا آزاد نے ایک پریس کانفرنس میں اس کی ناکامی

کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ پہلی مرتبہ کی ملاقات میں جو اُمیدیں اُبھری تھیں، ۹ر تاریخ کی رات تک وہ سب دُھندلی ہوگئیں اور آخرکار ہم دوستوں کی طرح الگ ہو گئے (۶۸)۔

کرپس گفتگو کی ناکامی پر انہوں نے الہ آباد میں کانگریس مجلس عاملہ کی ایک بیٹھک میں کہا تھا کہ کرپس سے بڑی اُمیدیں تھیں۔ ایک رجائیت پسند شخص کی شہرت کے ساتھ وہ یہاں آئے تھے لیکن بڑے یاس پسند ثابت ہوئے۔ انہوں نے حالات کو اور بگاڑ دیا۔ یہاں یہ کہہ دینا نامناسب نہ ہوگا کہ ۱۰راپریل ۱۹۴۲ء کی شام کو کانگریس کے ذریعہ تجاویز کو باضابطہ نامنظور کیے جانے کے بعد مسٹر کرپس کا فوراً مسٹر جناح سے جاکر ملنا اور اسکے اگلے دن ہی ایک خط میں کانگریس پر مذکورہ الزام لگانا کرپس اور لیگ کی بیجا سانٹھ گانٹھ کے شبہات ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ ان تجاویز کو منظور نہ کرنے میں کانگریس کا کوئی قصور نہیں مانا جاسکتا۔ کہا جاسکتا ہے کہ سرکاری نظام ہی ان کی کامیابی کا خواہش مند نہیں تھا جیسا کہ مسٹر لنلتھگو خود کانگریس کو کوئی سہولت مہیا کرانے کے حق میں نہ تھے اور ان کا مطالبہ منظور کرنے کے لیے کرپس تجاویز میں تبدیلی کیے جانے پر انہوں نے استعفیٰ دینے کی دھمکی دے کر اپنی مخالفت ظاہر کر دی تھی (۷۰)۔

بھارت چھوڑو تحریک

مارچ ۱۹۴۰ء میں منعقدہ رام گڑھ اجلاس میں کانگریس نے نوآبادیاتی خود مختاری سے متعلق اپنی نامنظوری اور مکمل آزادی کے تعلق سے اپنی بے چینی واضح کر دی تھی لیکن بسلسلۂ جنگ عظیم برٹش حکومت ہندوستان کی پوزیشن کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کر رہی تھی۔ ایسی حالت میں کانگریس یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کیا پالیسی اپنائی جائے لیکن اس وقت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ کرپس تجاویز کی ناکامی سے مستقبل کے پروگرام کا سوال پھر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ کرپس تجاویز سے کانگریس کو انگریز کی نیک نیتی پر شک ہوگیا تھا۔ انگلینڈ کی سرکار اپنا طریقہ بدلنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایسی حالت میں کانگریس میں حکومت برطانیہ کے خلاف پالیسی منظور کرنے کے سلسلے میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ سخت بحث و مباحثے کے بعد اپریل ۔مئی ۱۹۴۲ء میں الہ آباد میں اعلیٰ کمیٹی کی میٹنگ میں مہاتما گاندھی کی ایک تجویز کی بنیاد پر باتفاق رائے ایک قرارداد پاس کی گئی۔ اس کے

مطابق جاپان کی حملہ ور فوج کی مخالفت کرنے کے لیے غیر متشدد عدم تعاون کا رُخ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا (۷۱)۔ مولانا آزاد صرف عدم تشدد کی پالیسی کو بھی پوری طرح تسلیم نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے بنگال کے کانگریسی کارکنان سے کہا تھا کہ نئے پروگرام میں جنگی حالات کے مطابق تبدیلی نیز ترمیم و اضافہ کیا جاسکتا ہے (۷۲)۔ مولانا سوچتے تھے کہ تحریک کا غیر متشددانہ طور سے چل پانا ممکن نہیں ہوگا۔ انہیں کے لفظوں میں ''موجودہ حالات میں عدم تشدد پر مبنی تحریک نہ شروع کی جاسکتی تھی، نہ چلائی جاسکتی تھی۔ تحریک تشدد سے مبرّا تبھی رہ سکتی ہے جب اس کے قائد موجود رہیں اور ہر قدم پر راستہ دکھاتے چلیں اور مجھے یقین تھا کہ تحریک کا ذرا بھی اشارہ ملتے ہی سبھی قائد گرفتار کر لیے جائیں گے۔ لیکن ہاں اگر کانگریس عدم تشدد کو ترک کر دے تو تحریک کی گنجائش ہوسکتی ہے۔ کوئی قائد نہ ہونے پر بھی لوگ مواصلاتی نظام درہم برہم کر سکتے ہیں، ذخیروں اور گوداموں میں آگ لگا سکتے ہیں اور سیکڑوں دوسرے طریقوں سے جنگی مسائی پر پانی پھیر سکتے ہیں۔ میں یہ بھی مانتا تھا کہ اگر ایسی زبردست الٹ پلٹ ہوتو شاید تعطل پیدا ہو جائے اور انگریزوں کو لاچار ہوکر سمجھوتہ کرنا پڑے'' (۷۳)۔

اس وقت مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی دونوں کے نظریات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ گاندھی جی نے ۷ر جولائی کو مولانا کو ایک خط لکھا تھا کہ اگر کانگریس چاہتی ہے کہ میں قیادت کروں تو آپ کو صدارت سے استعفیٰ دے دینا چاہیے اور مجلس عاملہ سے بھی ہٹ جانا چاہیے اور جواہر لال نہرو کو بھی یہی کرنا چاہیے لیکن سردار پٹیل کے سمجھانے سے گاندھی جی نے اپنی بات واپس لے لی اور مولانا کا صدر بنے رہنا منظور کر لیا (۷۴)۔ زمانۂ جنگ میں ہندوستانی عوام اور کانگریس کی پالیسی کے سوال پر غور وخوض کرنے کے لیے ۷ر سے ۱۴ر جولائی ۱۹۴۲ء تک واردھا میں مجلس عاملہ کی میٹنگ ہوئی۔ مسٹر کرپلانی کے مطابق اس میٹنگ میں مولانا آزاد، جواہر لال نہرو، پنڈت گووند ولبھ پنت، ڈاکٹر سید محمود اور آصف علی نے ستیہ گرہ کے پروگرام کی مخالفت کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ انگریز اس پروگرام کی بنیاد پر کانگریس کو محوری طاقتوں کا حمایتی کہہ کر ان کے خلاف پروپیگنڈا کریں گے (۷۵)۔ ان لوگوں کا ایسا کہنا بالکل صحیح تھا کیوں کہ انگریز اپنے کانگریس مخالف پروپیگنڈہ مہم کے تحت امریکہ میں کانگریس کو محوری طاقتوں کا حمایتی کہہ کر بدنام کر رہے

تھے(۷۶)۔ مجلس عاملہ نے ۱۴؍ جولائی کو ایک تجویز منظور کر کے ہندوستان سے برطانوی اقتدار ہٹا لیے جانے کی مانگ کرتے ہوئے کہا کہ اگر یہ اپیل بیکار گئی تو اس حالت میں کانگریس کو اپنی تمام تر عدم تشدد پر مبنی طاقت کا جو ۱۹۲۰ء میں (جب کہ اس نے سیاسی حقوق اور آزادی کی حمایت کے لیے عدم تشدد کو اپنی پالیسی کے ایک جزو کی شکل میں قبول کیا تھا) مجتمع کی گئی ہے، با دلِ ناخواستہ استعمال کرنے کو مجبور ہونا پڑے گا(۷۷)۔ مسٹر مہادیو دیسائی کے مشورے پر مس سلیڈ (میرا بہن) نے تجویز کا خلاصہ سمجھانے کے لیے وائسرائے سے ملنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا(۷۸)۔ اب مولانا حکومت کو اور موقع دینا نہیں چاہتے تھے۔ ۲۰؍ جولائی ۱۹۴۲ء کو ایسوسی ایٹیڈ پریس کے نمائندے نے ان سے پوچھا کہ کیا کانگریس حکومت سے بات چیت کرنے کے لیے تیار ہے تو انہوں نے کہا تھا کہ اس تجویز کا تعلق ہندوستان کی آزادی سے ہے۔ اس میں بات چیت کی گنجائش کہاں ہے؟(۷۹)۔ وہ یہ منظور کر سکتے تھے کہ ہندوستان کی آزادی کے اعلان کے بدلے زمانۂ جنگ تک کے لیے کوئی نظم کر لیا جائے۔ اخباری نمائندے کے ذریعہ یہ پوچھے جانے پر کہ اگر ہندوستان کی آزادی کی گارنٹی دیتے ہوئے ایک اعلان کر دیا گیا تو کیا آپ اتنے سے مطمئن ہو جائیں گے؟ اس پر مولانا نے کہا تھا کہ یہ تو اعلان کے خد و خال پر منحصر کرتا ہے، پھر بھی میں یقین دلاتا ہوں کہ جس طرح کے اعلان کی بات آپ کرتے ہیں اس پر کوئی وجہ نہیں کہ کانگریس پوری طرح غور نہ کرے(۸۰) لیکن حکومت سے ایسی اُمید رکھنا بیکار ہی تھا۔

۷؍ اور ۸؍ اگست ۱۹۴۲ء کو کل ہند کانگریس اعلیٰ کمان کے بمبئی اجلاس میں واردھا تجویز کی توثیق کی گئی اور اسے منظور کر لیا گیا۔ یہاں پاس کیے گئے تجاویز میں ہندوستان کی آزادی و خودمختاری کے مکمل حقوق کی حمایت کرنے کے مقصد سے عدم تشدد کے طریقۂ کار کو اپناتے ہوئے زیادہ سے زیادہ وسیع نتائج پر مبنی ایک بڑی لڑائی شروع کرنے کا مصمم ارادہ کیا گیا۔ برطانیہ کو ہندوستان کا مطالبہ قبول کرنے کے لیے وقت دینے کے حوالے سے اس میں کوئی بھی تاریخ متعین نہیں کی گئی تھی لیکن مستقبل کے اندیشوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ ایسا وقت آ سکتا ہے کہ ہدایت دینا یا ہدایتوں کا ہماری عوام تک پہنچنا ممکن نہ ہوگا اور جب کوئی بھی کانگریس کمیٹی کارروائی نہیں کر سکے گی، ایسا ہونے پر اس تحریک میں حصہ لینے والے ہر ایک مرد و زن کو عام ہدایات کی حد میں رہتے ہوئے

اپنے آپ کام کرنا چاہیے(۸۱)۔ مولانا آزاد آگے آنے والی تحریک کی ذمہ داری حکومت برطانیہ کے سر منڈھتے تھے۔ انھوں نے ۷؍ اگست کو اعلیٰ کمیٹی کی میٹنگ میں کہا تھا کہ ہندوستان پر غیر ملکی حملے کا خطرہ تھا جو کچھ مہینے قبل دور تھا، اب تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ مصیبت کی اس گھڑی میں لوگوں کو سست و بے عمل چھوڑ دینا خطرناک ہوگا۔ کانگریس دیکھنا چاہتی ہے کہ ہر ایک ہندوستانی حملے کو روکنے میں حصہ لے۔ اگر باشندگان ہند اس میں تعاون نہیں دیتے ہیں تو اس کی ذمہ داری برٹش سرکار کی ہوگی۔ بھارت چھوڑنے کے مطالبے کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ اس کا مطلب برطانیہ کو مادّی طور سے بھگانا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب ہے ہندوستانیوں کے ہاتھ میں سیاسی طاقت کا تبادلہ(۸۲)۔ اس تبادلے کے لیے چھیڑی گئی تحریک کی صحیح شکل وصورت کو دنیا کے سامنے رکھنا ضروری تھا اور یہ بھی ضروری تھا کہ بین الاقوامی سطح پر ہندوستان کی آزادی کے لیے جو لوگ کوشش کر رہے تھے انہیں بھی یہ جانکاری دی جائے اور اس سب کے ساتھ عوام کو مستقبل کے لیے ہدایت دی جائے۔ ان ساری باتوں کو مولانا نے کمیٹی کی ۸؍ اگست کی بیٹھک میں ان الفاظ میں واضح کیا تھا کہ میں صدر روزویلٹ اور چین ولندن میں واقع روسی سفارت خانے کو تجویز کی نقل بھیجنے جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہماری سبھی کوششیں ناکام ہو جائیں گی تبھی ہندوستانی کوئی مستحکم قدم اٹھائیں گے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے، اپنی جدوجہد میں ڈوب جائیں یا تیر کر کنارے لگیں، فاتح ہوں یا مفتوح، ہندوستانیوں کو اپنی جدوجہد چلانی ہی ہے(۸۳)۔

اس طرح ۱۹۳۹ء میں سبھاش چندر بوس نے کانگریس کو ''انگریزوں کو بھارت چھوڑنے کا الٹی میٹم دینے'' کی جو رائے دی تھی اب اس کا فیصلہ کر کے کانگریس نے قومی خودمختاری کی تحریک کو ایک نیا اور مؤثر نتیجوں والا موڑ دے دیا(۸۴)۔ تحریک کا فیصلہ کرنے کے بعد گاندھی جی فوراً ہی اسے شروع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وائسرائے کو اس سلسلے میں ایک خط لکھ کر اس کا جواب آنے تک انتظار کر لیا جائے(۸۵) لیکن سرکار کانگریس سے اس قدر خوفزدہ ہو چکی تھی کہ اس نے کانگریس کو کوئی موقع نہیں دیا۔ سرکار تجویز پاس ہونے کے پانچ گھنٹے کے اندر ہی یعنی صبح تین بجے تک سبھی لیڈروں کو جیل میں ٹھونس دینا چاہتی تھی(۸۶)۔ ہندوستان میں حکومت محکمۂ اطلاعات ونشریات کے موجودہ

سکریٹری مسٹر فریڈرک پیکل نے سبھی صوبائی حکومتوں کے سکریٹریوں کے نام گشتی خطوط جاری کر کے تحریک کو کچلنے کے مقصد سے رائے عامہ کو کانگریس کی پالیسی کے خلاف اپنی حمایت میں تبدیلی کرنے کے احکام دے دیئے تھے (۸۷)۔ لیڈروں کی گرفتاری کی اس ملک گیر مہم میں علی الصباح ۴ بجے مولانا کو گرفتار کرنے کے لیے بمبئی کے ڈپٹی کمشنر آف پولس اور ان کے ساتھ دو سپاہی مولانا کے جائے قیام پر پہنچ گئے۔ سرکار اتنی جلدی کام کر رہی تھی کہ ۹ اگست کی صبح ۵:۴۵ بجے گرفتار کرنے کے بعد دو پہر ۲:۱۵ بجے مولانا آزاد اور دیگر کئی لیڈروں کو احمد نگر کے قلعے میں بند کر دیا گیا (۸۸)۔ گرفتاریوں کو چھپانے کی تمام کوششوں کو عوام کے سامنے اُجاگر ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ۹/اگست کو محترمہ ارونا آصف علی نے بمبئی کے عوام کو ان گرفتاریوں کی اطلاع دے دی (۸۹)۔

لیڈران کی اس بڑے پیمانے پر گرفتاری کا مقصد یہ تھا کہ عوام کو ہدایت نہ مل سکے اور تحریک اپنے ابتدائی دور میں داخل ہونے کے قبل ہی ختم ہو جائے۔ مہاتما گاندھی نے عوام کو "کرو یا مرو" کا جنگی نعرہ عطا کیا تھا۔ عوام کسی بڑے، وسیع اور طویل عرصے تک چلنے والی تحریک کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی کہ حکومت کے ذریعہ لیڈران کی اچانک گرفتاریوں نے سارے ملک میں ہلچل مچا دی۔ لیڈروں کے قید ہونے کی جگہ کا بھی عوام کو علم نہیں تھا۔ عوام خود کو ایک ایسی حالت میں پا رہی تھی، جس میں کوئی فیصلہ لینے کے لیے سمت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس سے بے چین ہو کر عوام نے اچانک ہی بغاوت کا راستہ اپنا لیا۔ مولانا آزاد کو قبل ہی سے ایسے حالات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ وہ اس مرتبہ تحریک واپس لیے جانے کے حق میں نہیں تھے اور حکومت کو پہلے ہی اس کا اشارہ دے چکے تھے کہ عوام کے پُرتشدد ہو جانے پر بھی تحریک واپس نہیں لی جائے گی۔ واردھا کے فیصلے کے بعد دلّی میں کانگریس کارکنان کی ایک بیٹھک میں یہ پوچھے جانے پر کہ کیا چوری چورا جیسی واردات ہو جانے پر تحریک واپس لے لی جائے گی؟ مولانا نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ عوام کے تشدد پر آمادہ ہو اٹھنے کے لیے ہم ذمہ دار نہیں ہوں گے (۹۰)۔ باغی عوام نے سارے ملک کو جنگ کے میدان میں تبدیل کر دیا۔ حکومت نے کانگریس کو غیر قانونی تنظیم قرار دے دیا۔ مظاہرے اور ہڑتالیں ممنوع قرار دے دی گئیں لیکن عوام قابو سے باہر ہو گئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کو چھوڑ کر دلّی سے ڈھاکہ اور لاہور سے مدراس تک کے سبھی تعلیمی ادارے بند ہو

گئے۔ لوگوں کی بھیڑ چلتی ریلوں پر پتھر برسانے لگی، گاڑیوں و کاروں کو نقصان پہنچانے لگی، ریلوے اسٹیشن میں توڑ پھوڑ کرنے لگی اور سرکاری املاک کو آگ لگا کر برباد کرنے لگی۔ علاوہ ازیں ٹیلی فون کے تار کاٹے جانے لگے اور ریل کی پٹریوں کو نقصان پہنچایا جانے لگا (۹۱)۔ سرکار تحریک کو کچلنے پر آمادہ تھی۔ اس کا نقطۂ نظر انتہا پسندانہ اور غیر معاہدانہ بنا ہوا تھا۔ عوامی تحریک کو دبانے کے لیے ملک میں جگہ جگہ پر سرکاری احکامات کے تحت گولیاں چلائی گئیں۔ ہوائی جہازوں سے مشین گن چلا کر لوگوں کو دہشت زدہ کر کے ان کی حوصلہ شکنی کی بھی کوشش کی گئی۔ سرکاری مظالم و جبر کے خلاف مرکزی حکومت کے محکمۂ اطلاعات و نشریات کے ممبر سر سی. پی. راماسوامی نے بطور احتجاج اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا (۹۲)۔ سرکار کی سخت ترین پالیسی سے متاثر ہو کر مسٹر کے. ایم. منشی نے مختلف جماعتوں کے قائدین کا ایک کل ہند اجلاس طلب کیا۔ اس ملک کے ہر ایک طبقوں اور تنظیموں کے قائد بلائے گئے۔ شرکت کرنے والوں میں مسٹر راج گوپال آچاری، مسٹر ایم. آر. جیکر، مسٹر بی. ٹی. رندیوے، محترمہ سرلا دیوی چودھرانی، پنڈت ہردے ناتھ کنجرو، جناب سلیمان قاسم مٹھا، زمیندار لیڈر مہاراج کمار وجے نگرم، عیسائی مشنری لیڈر ڈاکٹر جان میکینزی، جمعیۃ العلماء کے مولانا احمد سعید صاحب، مزدور لیڈر ایم. ایم. جوشی وغیرہ شامل تھے۔ سر تیج بہادر سپرو نے اس جلسے کی صدارت کی تھی۔ اجلاس نے سرکار سے فراخدلی پر مبنی پالیسی اپنانے اور جیل میں بھوک ہڑتال کر رہے مہاتما گاندھی کو رہا کرنے کی مانگ کی۔ سرکاری رویّے کی مخالفت میں سرکار کے سپلائی ممبر مسٹر ہومی مودی، تجارتی ممبر مسٹر این. آر. سرکار اور محکمۂ خارجہ کے ممبر مسٹر ایم. ایس. آنے نے وائسرائے کی مجلس منتظمہ سے استعفیٰ دے دیا (۹۳)۔

اس تحریک سے برطانوی شہنشاہیت کی جڑیں ہل گئیں۔ چین، امریکہ اور انگلینڈ میں کانگریس کی حمایت میں ردِ عمل ہوئے۔ انگلینڈ کے مشہور فلسفی برٹینڈ رسل نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے یونائیٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندے سے کہا کہ برٹش سرکار کو ہندوستان کو ایک مقررہ تاریخ پر آزادی دینے کے سلسلے میں ایک بیان جاری کرنا چاہیے اور اگر وہ جنگی مساعی میں رکاوٹ نہ بنیں تو سارے قیدیوں کو رہا کر دینا چاہیے (۹۴)۔ چین کے مشہور مصنف مسٹر لن یوتانگ نے ہندوستان کو فوراً آزاد کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ مشہور امریکی مصنفہ پرل بک نے ہندوستان کو آزادی دینے کی حمایت کی (۹۵)۔ ان سب کے باوجود

حکومت برطانیہ کی پالیسی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کانگریس کو کوئی رعایت دینے کی جگہ پر اپنے مظالم کو نظر انداز کرتے ہوئے وائسرائے مسٹر لنلتھگو نے کانگریس پر الزام لگایا کہ وہ ملک میں پھیلے تشدد کے لیے ذمہ دار ہے۔ ایسا الزام لگائے جانے پر مولانا آزاد نے احمد نگر قلعے سے وائسرائے کو ایک خط لکھ کر اپنی مخالفت ظاہر کی۔ انھوں نے لکھا کہ نظربندی میں رہتے ہوئے عموماً ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے کیوں کہ ہم اپنے لوگوں اور باہری دنیا سے بالکل کٹے ہوئے ہیں۔ انفرادی طور پر یا تنظیم کے تحت اپنی مشترکہ قوت کی شکل میں جہاں تک آپ کے الزامات کا تعلق ہے کہ کانگریس نے پوشیدہ طور سے تشدد پر مبنی تحریک کی ایک تنظیم بنا رکھی ہے، وہ بالکل جھوٹ اور بے بنیاد ہیں(۹۶)۔ ان سب کے باوجود سرکار کا نقطۂ نظر نہیں بدلا۔ کانگریس کی عدم تشدد پر مبنی تحریک کے ساتھ ہندوستانی عوام کی امید، حوصلہ، طاقت اور اہلیت کا پورا زور لگا ہوا تھا۔ اس سے انکار کرتے ہوئے برطانوی وزیراعظم مسٹر ونسٹن چرچل کا کہنا تھا کہ ہندوستان کی ۳۹ کروڑ آبادی میں ساڑھے تیئس کروڑ لوگ اس تحریک کے خلاف تھے(۹۷)۔ مسٹر چرچل کی پالیسی یہی بنی رہی کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے اسے ہم اپنے قبضے سے باہر نہیں جانے دیں گے(۹۸)۔

ویول پلان

لارڈ لنلتھگو کے جانے کے بعد لارڈ ویول ہندوستان کے وائسرائے ہوئے۔ یہاں آنے کے بعد ایک لمبے عرصے تک ہندوستان کی سیاسی ہلچلوں پر انہوں نے کوئی بیان نہیں دیا۔ ۲۰؍ستمبر ۱۹۴۳ء کو کلکتہ میں ایسوسی ایٹیڈ چیمبرس آف کامرس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے سیاسی تعطل حل کرنے کے لیے مناسب حالات پیدا کرنے کا اشارہ دیا تھا(۹۹)۔

یورپ میں جنگ عظیم کے دوران مورچوں پر دوست ممالک کی حالت سُدھرتی جا رہی تھی۔ ۱۲؍فروری ۱۹۴۳ء کو اسٹالن گراڈ میں جرمن افواج نے ہتھیار ڈال دیے۔ ۴؍جون ۱۹۴۴ء کو روم پر امریکی فوج کا قبضہ ہوگیا۔ جرمنی کی شکست سے جرمنی میں ہی ہٹلر کی مخالفت بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ ۲۰؍جولائی ۱۹۴۴ء کو کرنل کاؤنٹ کلوسوان اسٹافن برگ اور ان کے دوستوں نے ہٹلر کے قتل کی بھی کوشش کی تھی۔ اس کے ناکامیاب رہنے کے باوجود اس واقعے سے حلیف ممالک کو ایک اخلاقی قوت ضرور حاصل ہوئی تھی۔ ۸؍مئی ۱۹۴۵ء کو جرمنی دوست ممالک کے سامنے خودسپردگی کر چکا تھا(۱۰۰)۔ ۱۴؍جون ۱۹۴۵ء کو لندن میں ہندوستانی وزیر نے ایک بیان دے کر ہندوستانی مسائل کے حل کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے کچھ تجویز رکھی اور وائسرائے کو ان کے مطابق ہی کام کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کی بنیاد پر وائسرائے نے ۱۴؍جون کو ہندوستانی عوام کے نام ریڈیو سے ایک پیغام نشر کیا۔ دونوں کے بیانات کا مقصد ایک ہی منصوبہ پیش کرنا تھا۔ اس منصوبے کی خاص باتیں درج ذیل ہیں:

(۱) وائسرائے منتخب لوگوں کا ایک اجلاس بلائیں، جس میں نئی حکمراں کاؤنسل کے اراکین کی ایک فہرست تیار کی جاسکے۔ فہرست میں ایسی شخصیتوں کے نام شامل کیے جائیں، جو جاپان کے خلاف جنگ کر کے شکست دینے کو عوامی طور سے منظور کر سکیں۔

(۲) اس کاؤنسل میں (اچھوتوں کو چھوڑ کر) ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہوگی۔

(۳) کاموں کی انجام دہی پرانے قانون کے مطابق یعنی ہندوستانی وزیر اور گورنر جنرل کی نگرانی میں ہوگی(۱۰۱)۔

۱۵؍جون ۱۹۴۵ء کو کانگریس مجلس عاملہ کے سبھی اراکین کو رہا کر دیا گیا۔ اس اعلان پر ردّعمل ظاہر کرتے ہوئے صدر کانگریس مولانا آزاد نے کہا کہ ایکزیکیٹو کاؤنسل کے ممبروں کے انتخاب کے بارے میں وائسرائے نے کچھ نہیں کہا ہے(۱۰۲)۔ ۲۱؍جون ۱۹۴۵ء کو یعنی تقریباً ۳ سال کے بعد کانگریس مجلس عاملہ کی ایک بیٹھک بمبئی میں ہوئی۔ اس کا مقصد لارڈ ویول کے ذریعہ مجوزہ شملہ اجلاس میں حصہ لینے پر غور و خوض کرنا تھا۔ مجلس عاملہ نے گاندھی جی و مولانا آزاد کو اجلاس میں پیدا ہونے والے حالات سے نپٹنے کے لیے نامزد کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ مجلس عاملہ بھی ضروری مشورے کے لیے شملہ میں ہی موجود رہے گی(۱۰۳)۔ ۱۴؍جون کے اعلان میں جس اجلاس کے بلائے جانے کی تجویز رکھی گئی تھی، لارڈ ویول نے ۲۵؍جون کو شملہ میں اس کی بیٹھک بلانے کا اعلان کیا۔ اس میں گیارہ ریاستوں کے وزرائے اعظم، مرکزی قانون ساز اسمبلی اور قانون ساز کونسل میں کانگریس پارٹی کے لیڈر مرکزی قانون ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کے ڈپٹی لیڈر اور صوبائی کاؤنسل میں لیگ کے لیڈر، مرکزی قانون ساز اسمبلی کے نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر، اسی

ایوان کے یورپین پارٹی کے لیڈر، سکھوں اور اچھوتوں کا ایک ایک نمائندہ، کانگریس کے قائد کی حیثیت سے مولانا آزاد اور لیگ کے قائد کی حیثیت سے مسٹر جناح شامل ہوئے (۱۰۴)۔

۲۴؍جون کو شملہ میں کانگریس مجلس عاملہ میں طے کیا گیا کہ اس اجلاس میں کانگریس ان باتوں پر زور دے گی:

(۱) وائسرائے کو اپنی مجلس عاملہ سے تعلقات کا واضح اعلان کرنا چاہیے۔ اگر مجلس عاملہ کسی موضوع پر ہم خیال ہو تو وہ فیصلہ وائسرائے کو ماننا ہوگا یا اسے اس پر ویٹو کا حق ہوگا۔

(۲) فوج کی پوزیشن کی وضاحت ہو جانی چاہیے۔ پہلے عوام اور فوج کے درمیان دیواریں کھڑی تھیں اب ان حالات کو بدلنا ہے، جن سے ہندوستانی لیڈر ہندوستانی فوج کے رابطے میں آسکیں۔

(۳) اگر اب کوئی سمجھوتہ ہوا اور نئی مجلس عاملہ بنی تو اسے یہ اختیار ہوگا کہ وہ جنگ میں حصہ لینے کا سوال مرکزی قانون ساز اسمبلی کے سامنے رکھ سکے۔ ہندوستان جاپان کے خلاف، انگلینڈ کے فیصلے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے نمائندوں کے فیصلے کی وجہ سے حصہ لے گا (۱۰۵)۔

۲۴؍تاریخ کو ہی مولانا آزاد نے پنڈت گووند ولبھ پنت کے ساتھ وائسرائے سے ملاقات کی۔ انھوں نے وائسرائے پر اس بات کے لیے زور دیا کہ تمام کانگریسی قیدی رہا کیے جائیں۔ انھوں نے کہا کہ کانگریس غیر ہندوؤں کی نمائندگی کے بارے میں فیصلے کا اختیار رکھتی ہے۔ یہ کسی ایک فرقہ پرست تنظیم کے ذریعہ چنے گئے مسلمانوں کے ناموں پر متفق نہیں ہوگی (۱۰۶)۔

اس کے بعد اجلاس شروع ہوا۔ اجلاس میں مولانا آزاد نے ان باتوں پر زور دیا کہ

(۱) یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ انتظام عبوری ہوگا، کانگریس ایسی کسی بات کو منظور نہیں کرے گی، جس سے اس کے قومی کردار پر آنچ آئے یا براہِ راست یا پوشیدہ طور سے فرقہ پرست اداروں کی سطح تک آجائے۔

(۲) کانگریس مجلس عاملہ اجلاس کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرے گی لیکن اس کے فیصلوں کو کل ہند کانگریس کمیٹی کی منظوری حاصل ہونا ضروری ہے (۱۰۷)۔

دو دن کے اجلاس میں اقلیتوں کی نمائندگی، جنگی مسائل میں تعاون اور حکومت ہند کے تحت دوبارہ تشکیل شدہ انتظامی کاؤنسل کا جاری رہنا وغیرہ موضوعات پر اتفاق ہو گیا تھا لیکن انتظامی کاؤنسل کی تشکیل کو لیکر لیگ سے اختلافات ہو گئے (۱۰۸)۔

مولانا آزاد کا کہنا تھا کہ کانگریس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کاؤنسل کے ممبروں کا انتخاب سیاسی بنیاد پر ہونا چاہیے فرقہ وارانہ بنیاد پر نہیں۔ کانگریس مساوات کی تجویز پر اعتراض نہیں کرتی بلکہ یہ ممبروں کے انتخاب کے طریقے پر کڑی نظر رکھتی ہے۔ جناب گووند ولبھ پنت نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس اس سلسلے میں متفکر نہیں ہے کہ کس فرقے کو کتنی سیٹیں کاؤنسل میں حاصل ہوئی ہیں بلکہ وہ اس بات پر غور کرتی ہے کہ یہ ممبر کس پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۲۷؍جون کو مسٹر جناح نے وائسرائے سے ملاقات کی اور کہا کہ وہ اس بات پر متفق نہیں ہوں گے کہ انتظامی کاؤنسل کے مسلم ممبران لیگ کے علاوہ کسی اور پارٹی کے ممبر ہوں (۱۰۹)۔ ۲۷؍سے ۲۹؍تاریخ کے اجلاس میں وائسرائے لارڈ ویول نے یہ تجویز پیش کی کہ سبھی پارٹیوں کے ممبر انتظامی کاؤنسل کے لیے اپنی جانب سے ناموں کی فہرست بنا کر بھیجیں۔ اس کے لیے انھوں نے پارٹیوں کے ممبران کی تعداد مقرر کر دی۔ مولانا آزاد نے کانگریس کی پالیسی کو واضح کرتے ہوئے اجلاس میں کہا کہ کانگریس سبھی فرقوں کے ممبران، خاص طور سے اچھوتوں اور عیسائیوں کو اپنی فہرست میں شامل کرنے کا حق نہیں چھوڑ سکتی۔ مسٹر جناح کے ذریعہ وضاحت کرائے جانے پر انھوں نے کہا کہ مسلم ممبران بھی کانگریس کی فہرست میں شامل کیے جائیں گے۔ مسٹر جناح نے لیگ کی فہرست بھیجے جانے کے سلسلے میں سوال اٹھائے جانے پر کہا کہ وہ اس بارے میں لیگ کی مجلس عاملہ سے مشورہ لینے کے بعد ہی کچھ کریں گے (۱۱۰)۔ ۳؍جولائی کو کانگریس مجلس عاملہ کی میٹنگ شروع ہوئی۔ اس نے ۶؍جولائی تک ناموں کی فہرست سازی کر لی۔ ادھر ۶؍تاریخ کو لیگ کی مجلس عاملہ کی نشست کے بعد ۷؍جولائی کو وائسرائے کو ایک خط لکھ کر مسٹر جناح نے مطلع کیا کہ کاؤنسل کے مسلم ممبران لیگ کے صدر اور وائسرائے کے خفیہ مشوروں کی بنیاد پر لیگ سے ہی چنے جانے چاہئیں۔ مسٹر جناح نے خط میں یہ بھی مانگ کی تھی کہ مسلم مفاد کی حفاظت کے لیے وائسرائے کے ویٹو پاور کے علاوہ اور بھی انتظام کیے جائیں لیکن وائسرائے نے انہیں ممبران کے اس طرح چنے جانے کی گارنٹی دینے سے انکار کر دیا (۱۱۱)۔

لارڈ ویول کے مجوزہ انتظامی کاؤنسل کے ممبروں کی فہرست میں ہندوؤں اور مسلمانوں نیز کانگریس و لیگ کے درمیان برابری قائم کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ ایک غیر لیگی پنجاب کے خضر حیات خاں کو مسلمانوں کی فہرست میں شامل کرنا چاہتے تھے، جس پر مسٹر جناح نے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا تھا۔ جب ۱۱رجولائی کو وائسرائے ان سے ملے تو انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ اس میں سبھی مسلمان لیگ کے ذریعہ نامزد نہیں ہوں گے تو لیگ کوئی تعاون نہیں کرے گی۔ ۲۲رجولائی کو وائسرائے نے مولانا آزاد اور گووند ولبھ پنت کو جب اس بات کی جانکاری دی تو دونوں نے اس پر اپنی ناراضگی ظاہر کی تھی (۱۱۲)۔ مولانا آزاد ویول تجاویز کو منظور کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے وائسرائے سے کہا تھا کہ موجودہ تعطل دور کرنے میں کانگریس مجلس عاملہ ہر ممکن مدد کرنا چاہتی ہے (۱۱۳)۔ ۱۴رجولائی ۱۹۴۵ء کے آخری جلسے میں اجلاس کی ناکامیابی کا اعلان کر دیا گیا۔ وائسرائے نے اس کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے اجلاس ختم کر دی۔ مسٹر جناح نے اس کے خاتمے پر ایک بیان میں کہا کہ لیگ کو ہی مسلم ممبر نامزد کرنے کا پورا اختیار ہونا چاہیے۔ چونکہ لارڈ ویول نے اسے نہیں مانا اس لیے پلان منظور نہیں کیا جاسکا (۱۱۴)۔ مولانا آزاد نے اجلاس کی ناکامیابی کے لیے لیگ کو مجرم ٹھہراتے ہوئے ۱۴رجولائی کو ایک بیان میں کہا کہ مسٹر جناح کی خواہش پوری کرنے کے لیے ہم جتنا کچھ کر سکتے تھے ہم نے کیا لیکن ہم ان کے اس دعوے کو کبھی نہیں مان سکتے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا واحد نمائندہ اور بااختیار ادارہ مسلم لیگ ہی ہے۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں بھی لیگ کی مجلس وزارت نہیں ... اس لیے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ مسلم لیگ تمام مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ دراصل مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے، جس کا لیگ سے کوئی سروکار نہیں (۱۱۵)۔ اجلاس کے آغاز میں ہی مولانا آزاد لیگ کے رویے سے مشکوک تھے۔ انھیں اس کی کامیابی کی اُمید نہیں تھی۔ یہاں ان کی دور اندیشی سمجھ میں آتی ہے، جیسا کہ انھوں نے اجلاس شروع ہونے سے قبل وائسرائے سے کہا تھا کہ لیگ کے ساتھ سمجھوتہ ہونا تو بہت ہی مشکوک ہے۔ لیگ کی باگ ڈور جن کے ہاتھ میں ہے، ان کا خیال تو کچھ ایسا لگتا ہے کہ سرکار ان کے ساتھ ہے اس لیے وہ کوئی بھی مناسب شرط ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں گے (۱۱۶)۔ مولانا آزاد کا یہ شک حرف بہ حرف سچ ثابت ہوا اور لارڈ ویول کا یہ یقین غلط ثابت ہوا کہ کوئی بھی پارٹی اسے

جان بوجھ کر ختم نہ کر سکے گی (۱۱۷)۔ لیگ کے اس رویے پر تبصرہ کرتے ہوئے لندن کے اخبار ''رینالڈس نیوز'' نے لکھا تھا کہ یہ وقت ہندوستان کے بارے میں صاف بولنے کا ہے۔ مسلم لیگ کے چیئرمین مسٹر جناح نے آئینی تعطل دور کرنے کی کوشش کو یہ کہہ کر پھر نقصان پہنچایا ہے کہ لیگ کو ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا نمائندہ تسلیم کیا جائے، جب کہ مسلمان بڑی تعداد میں کانگریس کے جھنڈے کے نیچے کام کر رہے ہیں۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے، جب مسٹر جناح نے ایسا کیا ہے۔ ہم کب تک انہیں ہر اُمید افزا پیش رفت کو زک پہنچانے کی چھوٹ دیتے رہیں گے (۱۱۸)۔ اسی رویے کے بارے میں لارڈ ویول نے مولانا آزاد سے کہا تھا کہ میں لیگ کے رویے کو مناسب نہیں سمجھتا (۱۱۹)۔

لیگ و کانگریس اور مولانا آزاد

جنگ عظیم کے شروع ہونے کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ۱۷را اکتوبر کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے اعلان کیا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ۱۹۳۵ء کے ایکٹ پر دوبارہ غور کیا جائے گا۔ اسی وقت انھوں نے لیگ کا ہندوستانی مسلمانوں کا ترجمان ہونے کا دعویٰ بھی تسلیم کر لیا تھا۔ لیگ کو حکومت کے ذریعہ بڑھاوا دینے کا یہ واضح اشارہ تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرساد کے مطابق ''وہ چاہتے تھے کہ کانگریس کے مقابلے میں وہ ایک دوسری تنظیم کھڑی کر دیں اور ہندوستان سے کہیں کہ جب تک یہ دونوں مل کر ایک مطالبہ پیش نہیں کرتیں، ہم کچھ بھی کرنے سے مجبور ہیں'' (۱۲۰)۔ اس وقت کانگریس اس بات کی کوشش کر رہی تھی کہ لیگ کے ساتھ اس کا کوئی سمجھوتہ ہو جائے اور تعطل دور ہو جائے لیکن مسٹر جناح کا خیال تھا کہ سرکار اور کانگریس کے اختلاف کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جانا چاہیے۔ حکومت برطانیہ کی طرف سے بڑھاوا ملنے کی وجہ کر، لیگ اور کانگریس کے درمیان سمجھوتے کے امکانات سے وہ اور بھی زیادہ دور ہوتے چلے جا رہے تھے (۱۲۱)۔ اس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ ملکی مفاد کے لیے لیگ و کانگریس آپس میں سمجھوتہ کریں اور لیگ مکمل سنجیدگی و سچائی کے ساتھ ملک کی آزادی کو نصب العین بنا کر اس کے لیے سرگرمی کے ساتھ کوئی کام کرنے میں کانگریس کا ساتھ دے۔ لیکن لیگ کانگریس کے خلاف انگریزوں سے فائدہ اٹھانے کی پالیسی پر چل رہی تھی۔ اس وقت مولانا آزاد لیگی اثرات کم کرنے کے لیے

کانگریس و دیگر جماعتوں کے تعاون سے ہندو مسلم اتحاد کے قیام کے ذریعہ لیگ کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کے حق میں تھے، تاکہ مسلمانوں کی نظر لیگ والوں سے ہٹ کر ان کی جانب ہو سکے(۱۲۲) لیکن حکومت لیگ و کانگریس کے بیچ سمجھوتے میں مزاحم تھی۔ ۱۹۴۰ء کے آغاز میں وائسرائے لنلتھگو اور مسٹر جناح میں کئی ملاقاتیں ہوئیں اس میں وائسرائے نے مسٹر جناح سے درخواست کی کہ انھیں منفی رویہ چھوڑ کر ٹھیک اور ٹھوس تجاویز سامنے رکھنے چاہئیں(۱۲۳)۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی مارچ ۱۹۴۰ء میں لیگ نے مشہور لاہور تجویز پاس کر کے پاکستان کی مانگ کو ایک تحریری قوت عطا کر دی تھی لہٰذا اب مسلم لیگ کا نصب العین حصول پاکستان ہو گیا تھا۔ اس تجویز کے پاس ہونے کے بعد بھی مولانا ہندو مسلم تعلقات کو ہموار کر کے لیگ اور کانگریس کے اختلافات دور کرنے میں لگے رہے۔ وہ سر سکندر حیات خاں اور مولوی فضل الحق سے اس سلسلے میں رابطہ بنائے ہوئے تھے اور دلی میں انھوں نے صوبائی وزرائے اعظم کا اجلاس بھی اسی مقصد سے بلایا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلم اکثریتی صوبوں کے وزرائے اعظم تقسیم ہند کا ارادہ بدل دیں اور اس کے عوض میں ہندو صوبوں کے وزرائے اعظم مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا وعدہ کریں(۱۲۴) لیکن لیگ کی طرف سے دوستی یا سمجھوتے کے خلاف ماحول بنایا جا رہا تھا اور وہ اس وقت کانگریس پر الزام لگا رہی تھی کہ کانگریس قوم پرستی کی دشمن ہے اور ہندو مسلم اختلاف کے لیے ذمہ دار ہے۔ وہ مسلمانوں اور حکومت سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتی۔ کانگریس نہ صرف یہ کہ پُرتشدد تیاریاں کر رہی ہے بلکہ وہ ہندو مسلم اتحاد قائم کرنا ہی نہیں چاہتی، نیز اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی حکومت قائم کر کے دوسروں پر، بطور خاص اقلیتوں پر حکمرانی کرنا چاہتی ہے(۱۲۵)۔ گرچہ یہ الزامات غلط تھے لیکن مسلمان لیگی پروپیگنڈے سے متاثر ہو رہے تھے۔ کشمیر کی نیشنل کانفرنس کے صدر شیخ عبداللہ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ پچھلے پچیس سال میں مسلمانوں کی انجمنیں اور ان کے رہنما مسلمانوں کو ڈرانے اور خوفزدہ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں(۱۲۶)۔ مسلمانوں کے ذہن سے یہ خوف نکال کر انہیں کانگریس کے نزدیک لانا ہی مولانا کا مقصد تھا۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو گرفتار ہونے سے قبل مولانا آزاد خود سیوا گرام جا کر مہاتما گاندھی سے فرقہ وارانہ مسئلے کے حل پر گفتگو کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے گرفتار ہو جانے کی وجہ سے اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا جا سکا(۱۲۷)۔ ۱۹۴۱ء میں سر ابراہیم رحمت اللہ نے سر مرزا اسماعیل کے توسط سے گاندھی جی و جناح کے سامنے سمجھوتے کے لیے ایک مشترکہ کمیٹی بنانے کی تجویز رکھی تھی، جسے گاندھی جی نے منظور کر لیا تھا اور انہوں نے لکھا تھا کہ اگر سر تیج بہادر سپرو یا آپ مشترکہ اجلاس بلائیں تو میں ذاتی طور پر تیار ہوں لیکن مسٹر جناح نے اس سے صاف انکار کر دیا(۱۲۸)۔ کرپس تجاویز کے بعد لیگ و کانگریس کی قربت کے امکانات اور بھی کم ہو گئے تھے۔ جیسا کہ خود مولانا نے اپنے نظریے میں کوئی تبدیلی نہیں کی لہٰذا مسٹر جناح کے ذہن میں مولانا آزاد اور کانگریس کے حوالے سے مزید تلخی پیدا ہوتی چلی گئی۔ انھوں نے ۱۹۴۱ء میں لیگ کے ناگپور اجلاس میں مولانا آزاد کو ''کانگریس کا شو بوائے'' کہہ کر انہیں بے عزت کرنے کی مذموم کوشش کی، کیوں کہ مولانا ایک مسلمان ہو کر بھی کانگریس کے صدر تھے اور مسٹر جناح کی نظر میں یہ کانگریس کی ساری قوم کی نمائندگی کرنے کے دعوے کا ثبوت نہیں تھا بلکہ محض دکھاوا تھا(۱۳۰)۔ لیگ کے ساتھ ملک کا عام مسلمان صرف مذہبی نعروں کے ساتھ اور مذہب کے خطرے کے نام پر بھلے ہی کھڑا ہوتا رہا ہو لیکن لیگ زمینداروں اور اونچی سطح کے نام نہاد بڑے لوگوں کی پارٹی تھی۔ چھوٹے طبقے کا کوئی مسلمان لیگ کے کسی عہدے پر فائز نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ملک میں کئی ایسی پارٹیاں تھیں، جو مسلمانوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ اس کے برعکس کانگریس کے کئی لیڈر مسلمان تھے اور بڑی تعداد میں مسلم عوام اس میں شامل تھی(۱۳۱)۔ مولانا آزاد لیگ کی طرح مذہب کے نام پر اُکسا کر کبھی عوام کو ساتھ لینا نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ ایک طے شدہ اصول اور پارٹی پالیسی کی بنیاد پر ملکی اتحاد و خود مختاری کے لیے ملک کی کثرت رائے کی قیادت کرتے ہوئے کام کر رہے تھے۔ مذہبی خدمات میں بہنے والی عوام اور مذہب کی بنیاد پر بھڑکانے والے لیگی قائد مولانا آزاد کی اصول پرستی کی وجہ کر انھیں پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا آزاد سے لیگی لیڈر اور ان کے پیروکار چڑھے ہوئے اور دور رہتے تھے نیز انھیں بے عزت کرنیکی کوشش کرتے تھے(۱۳۲)۔

مولانا آزاد ایسے واقعات سے دل برداشتہ ہونے والے نہیں تھے۔ وہ لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے لیکن کسی مجبوری میں ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ جب ۱۹۴۲ء میں ۲۳ر اپریل کو راجہ جی راج گوپال آچاری کی قیادت میں مدراس قانون ساز اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے ایک تجویز پاس کر کے کانگریس ورکنگ کمیٹی سے اپیل کی کہ وہ لیگ کا

مطالبۂ پاکستان قبول کر کے جنگ عظیم میں برطانیہ کا ساتھ دے کر ملک کو امکانی بحران سے نجات دلانے کے لیے قومی حکومت بنائے تو مولانا آزاد اس تجویز کو منظور کرنے کے لیے تیار نہیں تھے (۱۳۳)۔ انھوں نے اس پر اپنا ردِّعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس بات سے انہیں بہت تعجب اور رنج ہوا ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ممبر ہوتے ہوئے راجہ جی نے ایسا نقطۂ نظر اپنایا ہے۔ اس اپیل کو نامنظور کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ صرف صوبائی کانگریس صوبے کے نظریات کی نمائندگی کر سکتی ہے مجلس قانون سازیہ نہیں۔ اس میں پارٹی کی بیٹھک میں بھی مکمل حاضری نہیں تھی۔ اطلاع کے مطابق دونوں ایوان کے ۱۹۱ اراکین میں سے صرف ۵۲ اراکین ہی موجود تھے اور ان میں سے بھی صرف ۳۶ کا ہی ووٹنگ میں حصہ لینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ صوبے کے کانگریسیوں کی کثرت رائے پر یہ فیصلہ لانا غلط ہوگا (۱۳۴)۔ وہ لیگ اور کانگریس میں سمجھوتہ کرنے کی کوشش اپنے طریقے سے کر رہے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں پھر انھوں نے لیگ سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے بمبئی میں ۷، ۸/ اگست ۱۹۴۲ء کو ہونے والی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں اس بات کا ذکر کیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جائے (۱۳۵)۔ انھوں نے ایک بیان میں کہا تھا کہ کانگریس اپنے لیے نہیں سب کے لیے اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اگر حقیقی اقتدار کانگریس کو منتقل کر دیا جائے تو یہ یقیناً دوسری جماعتوں کے پاس جا کر انھیں سرکار میں شامل ہونے کے لیے کہے گی۔ اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ برطانیہ لیگ یا دیگر کسی پارٹی کے ہاتھوں میں اقتدار سونپ دے، اگر اقتدار حقیقی ہو۔ اس پارٹی کو بھی دوسری پارٹیوں کے پاس جانا پڑے گا کیوں کہ دوسری پارٹیوں کا تعاون لیے بغیر کوئی بھی پارٹی اچھی طرح سے کام نہیں کر سکتی (۱۳۶)۔ مولانا آزاد لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں اپنی ساری طاقت صرف کر دینے کے لیے تیار تھے اور انھیں اپنے اوپر پورا بھروسہ تھا۔ انھوں نے میٹنگ میں کہا تھا کہ اگر لیگ کوئی سمجھوتے کی گفتگو کے لیے خواہش مند ہے تو وہ ۲۴ گھنٹے کے اندر کانگریس کو لیگ کے ساتھ گفتگو کرنے کے لیے تیار کر لیں گے۔ انھوں نے ڈاکٹر عبداللطیف کے توسط سے لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی ایک کوشش بھی کی تھی۔ ۶/ اگست ۱۹۴۲ء کو انھوں نے ڈاکٹر عبداللطیف کو ایک خط کے جواب میں لکھا تھا کہ دونوں کے نمائندوں کے درمیان تبادلۂ خیال کے دوران لیے جانے والے فیصلے دونوں کی تنظیموں کے سامنے توثیق

کے لیے پیش کیے جائیں گے (۱۳۷)۔ لیکن لیگ نے اس معاملے میں ذرا بھی سنجیدگی نہیں دکھائی، جیسا کہ ڈاکٹر عبد اللطیف نے خود ۱۲/ اگست ۱۹۴۲ء کو حیدرآباد میں ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ مسٹر جناح کانگریس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں کبھی سنجیدہ نہیں تھے جب کہ کانگریس سنجیدگی سے اپنے اختلاف دور کرنا چاہتی تھی (۱۳۹)۔ اس بار کی بات چیت بھی پہلی بار کی کوشش کی طرح آگے نہیں بڑھ پائی اور اگست کی گرفتاریوں کی وجہ کر ٹھپ ہوگئی۔

ماہ ستمبر ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی نے مسٹر جناح کے ساتھ پھر گفتگو شروع کی۔ اس وقت مسٹر جناح راجہ جی کی تجویز منظور کرنے کے لیے تیار تھے لیکن مسٹر جناح کا خاص زور اس بات پر تھا کہ پہلے پاکستان کی بات تسلیم کر لی جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ ملک کی تقسیم پہلے ہو اور آپسی مفاد پر معاہدے کی گفتگو بعد میں۔ اس کے علاوہ کئی اور وجوہات تھے، جن کے باعث یہ گفتگو ٹوٹ گئی۔ مولانا آزاد نے مسٹر جناح کی پہلے تقسیم اور بعد میں آپسی مفاد پر معاہدے کی گفتگو کو شادی سے قبل ہی طلاق کا نام دے کر اپنی نامنظوری ظاہر کی تھی (۱۴۰)۔ کانگریس و لیگ کے سمجھوتے کے امکانات کئی بار ٹوٹ چکے تھے، پھر بھی بھولا بھائی ڈیسائی کانگریس اور لیگ کے درمیان سمجھوتے کی کوشش میں لگے رہے اور اپنے دوست اور لیگ کے نائب قائد نواب زادہ لیاقت علی خاں سے مل کر جنگ کے دوران مرکز میں عبوری حکومت قائم ہونے کے امکان پر گورنر جنرل کی وزارتی کاؤنسل کی تشکیل نو کے سلسلے میں بات کی۔ اس کے نتیجے میں ان کے درمیان درج ذیل سمجھوتہ عمل میں آیا۔

کانگریس اور لیگ عبوری حکومت میں حصہ لینے کے لیے راضی ہے۔ اس حکومت کی ساخت اس طرح ہوگی:

(۱) مرکزی وزارتی کاؤنسل میں لیگی و کانگریسی اراکین کی تعداد برابر رہے گی۔ سرکار میں نامزد افراد کا آئینی کاؤنسل کا ممبر ہونا ضروری نہیں۔

(۲) اقلیتوں (خاص کر درج فہرست ذاتوں اور سکھوں) کے نمائندے بھی رہیں گے۔

(۳) سپہ سالار اعظم بھی رہیں گے۔

۱۱/ جنوری ۱۹۴۵ء کو اس پر دونوں نے دستخط کر دیئے لیکن اسے اگست ۱۹۴۵ء تک پوشیدہ رکھا گیا (۱۴۱)۔ گاندھی جی نے اس اعلان کا استقبال کیا تھا، لیکن سرکار نے اسے

نظرانداز کر دیا۔ اُدھر لیاقت علی خاں نے مسٹر جناح سے اس پر منظوری حاصل کر لی تھی اور مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کو یہ بات بتا دی گئی تھی۔ گاندھی جی نے بھولا بھائی ڈیسائی کو اس جانب سے باخبر کر دیا تھا لیکن بعد میں لیاقت علی خاں نے اس سمجھوتے کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ انھوں نے کہا کہ نہ کوئی ایسا سمجھوتہ ہوا ہے، نہ مسٹر جناح سے کوئی مشورہ کیا گیا ہے۔ اس طرح وہ اپنی بات سے مکر گئے (۱۴۲)۔ خود مولانا آزاد بھی اس سمجھوتے سے خوش نہیں تھے (۱۴۳)۔ اس طرح سرکاری بے توجہی اور کانگریس کی داخلی و اصولی اختلاف رائے کی وجہ کر یہ سمجھوتہ ختم ہو گیا اور کانگریس و لیگ کے تعلقات ہموار نہیں ہو سکے۔

۱۹۴۵ء میں مولانا آزاد نے لیگ و کانگریس تعلقات کے حوالے سے ایک نیا منصوبہ پیش کیا۔ ان کا خیال تھا کہ فرقہ وارانہ مسائل کے وجوہات میں الجھنا بیکار ہے۔ مسلمانوں کا خوف صرف ان کو حفظ و امان کا احساس کرانے والا منصوبہ بنا کر ہی دور کیا جاسکتا ہے۔ ملک کی تقسیم مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے۔ لہٰذا انھوں نے تجویز رکھی کہ ہندوستان کا آئندہ دستور وفاقی ہونا چاہیے۔ اکائیاں پوری طرح خود مختار ہونی چاہئیں۔ مرکزی حکومت کے پاس وہ موضوع ہونے چاہئیں جو عالمگیر ہوں اور جن پر اکائیاں ہم خیال ہوں۔ اکائیوں کو فیڈریشن سے باہر جانے کا بھی اختیار ہونا چاہیے۔ سیٹوں کا ریزرویشن اور مختلف ذات برادریوں کی طاقت وقوت کو ظاہر کرنے والے حق رائے دہی کے ساتھ مرکز وصوبے دونوں میں مشترکہ حلقۂ انتخاب ہونے چاہئیں۔ پارٹیوں کے اقتصادی و سیاسی بنیاد پر تشکیل پانے نیز فرقہ وارانہ شک وشبہات ختم ہونے تک مرکزی آئینی کاؤنسل اور مجلس عاملہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو برابر سیٹیں ملنی چاہئیں۔ وفاق ہند کا سربراہ باری باری سے ہندو مسلمان ہونے کی روایت ہونی چاہیے۔ جب آئندہ بننے والے آئین میں مسلمانوں کے مقام کا فیصلہ انھیں پر چھوڑ دیا جائے گا اور وہ اس سے مطمئن ہوں گے کہ فیصلہ ان پر کسی غیر مسلم ایجنسی کے ذریعہ لادا نہیں جا رہا ہے تو وہ تقسیم کا خیال چھوڑ دیں گے اور محسوس کریں گے کہ ایک متحدہ ہندوستان کے ذریعہ ان کے مفاد کی بحسن وخوبی تکمیل ہو رہی ہے (۱۴۴)۔ مولانا کا یہ منصوبہ ان کے پچھلے خیالات کی مکمل ترقی یافتہ شکل تھی۔ ۱۹۳۸ء میں انھوں نے مسلم تہذیب، کلچر، قومیت، زبان وغیرہ کے لحاظ سے ہندوستانی مسلمانوں کے علیحدہ وجود پر زور دیا تھا کہ مسلمان نہیں سوچ سکتے کہ وہ ہندوستان کی متحدہ قومیت میں جذب ہو

جائیں (۱۴۵)۔ ۱۹۴۵ء کے مندرجہ بالا منصوبے کے سامنے آنے کے بعد کانگریس مجلس عاملہ نے ایک تجویز پاس کی تھی کہ فیڈریشن میں فیڈریشن کے ہر دھڑے کو مکمل خود مختاری ہوگی (۱۴۶)۔ ویول منصوبے کی ناکامیابی سے یہ بات پوری طرح ظاہر ہوگئی کہ مسٹر جناح کانگریس کے ساتھ کسی طرح کا کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔

کانگریس نے لیگ کے ساتھ ہمیشہ نیک جذبات کا مظاہرہ کیا تھا لیکن اس کے باوجود لیگ کا کانگریس مخالف پروپیگنڈہ بند نہیں ہوا اور شملہ اجلاس کے بعد بھی لیگ کانگریس کو بدنام کرتی رہی (۱۴۷)۔

خلاصہ

۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء کے دوران مولانا آزاد ایک پختہ مضبوط سیاستداں کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کا واحد مقصد انگلینڈ کی سرکار کو مجبور کر کے ہندوستان کی آزادی حاصل کرنا ہے اور وہ اس کے لیے برطانیہ کو جنگی مساعی میں تعاون دینے کے لیے بھی تیار تھے۔ اپنے حصول مقاصد کے لیے وہ ہر امکانی مواقع کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اپنے نقطۂ نظر کی اشاعت کے نئے قومی و بین الاقوامی منچ کا بھی استعمال کرنا چاہیے تھے اور اس لیے وہ کرشنا مینن کو امریکہ بھیجنے کے حق میں تھے۔ جنگ کے زمانے میں انگلینڈ پر دباؤ نہ ڈالنے کی گاندھی جی کی بات مان کر پیچھے ہٹنے کے لیے وہ تیار نہ تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ جب جنگی پالیسی کو بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے تو مولانا اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ حکومت برطانیہ کو شکست دینے کے لیے سبھوں کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے انھوں نے آگے چل کر مہاتما گاندھی کا نقطۂ نظر صحیح مان کر اسے قبول کر لیا تھا۔ ایک مرتبہ وہ جس پالیسی کو قبول کر لیتے تھے اسے پوری طرح نبھاتے تھے جیسا کہ انھوں نے مہاتما گاندھی کی جنگ سے متعلق پالیسی کو جب قبول کر لیا تو ساری قوت اس پر عمل درآمد کرنے میں لگا دی۔ انفرادی ستیہ گرہ میں جیل کے سفر سے لے کر مسٹر کرپس سے گفتگو تک مولانا کا نقطۂ نظر مسلسل مستحکم ہوتا چلا گیا۔ مہارشی اروند کی طرح سے وہ بھی مسٹر کرپس کی تجاویز کو ہندوستان کے لیے مفید مان کر منظور کرنے کو تیار تھے (۱۴۸)۔ لیکن ان کے سامنے یہ بھی واضح تھا کہ سیاسی گتھیوں کو سلجھائے بغیر منظوری بے

وقعت رہے گی۔ مسٹر کرپس کے ساتھ اپنی بات چیت میں انھوں نے یہ واضح بھی کیا تھا کہ تجاویز میں خود مختاری کی وضاحت نہ ہونے کی وجہ کر انھیں منظور نہیں کیا جاسکتا۔ بھارت چھوڑو آندولن میں مولانا آزاد مہاتما گاندھی کی پیروی کرتے تھے مگر اس سے پہلے وہ مسلح اور پُرتشدد تحریک چلانے کے حق میں تھے (۱۴۹)۔ لیکن ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ عدم تشدد پر مبنی تحریک کے حق میں ہونے پر وہ دل سے اس کے ساتھ ہو گئے۔ اگست ۱۹۴۲ء میں بمبئی تجاویز کے پاس ہوتے ہی مولانا آزاد بھی گرفتار کر کے احمد نگر قلعے میں بند کر دیے گئے۔ اس طویل المیعاد قید کے دوران انھیں انتہائی ذہنی و معاشی تکالیف کے پُر درد دور سے گزرنا پڑا۔ ۹/اپریل ۱۹۴۳ء کو مولانا آزاد کی اہلیہ زبیدہ خاتون کی موت ہوگئی۔ ان کے معالج ڈاکٹر مجمدار کا کہنا تھا کہ مولانا صاحب آجائیں تو وہ اس مصیبت سے کامیابی کے ساتھ گزر سکتی ہیں لیکن حکومت برطانیہ کی جیل میں ہندوستان کی آزادی کے لیے قید کی سزا کاٹتے ہوئے مولانا صاحب نہیں آسکتے تھے۔ مولانا کو دوسری تکلیف ۳۰/دسمبر ۱۹۴۳ء کو بھوپال میں ان کی بہن آبرو بیگم کے انتقال سے پہنچی تھی (۱۵۰)۔ ہندوستان کی آزادی کے مطالبے کے جرم میں قید مولانا پر برٹش سرکار کے مظالم نے انھیں اقتصادی نقصان بھی پہنچایا تھا۔ مولانا آزاد کی قید کا فائدہ اٹھا کر کچھ لوگوں نے ان کی کتاب ترجمان القرآن کو مولانا کی اجازت کے بغیر چھاپ کر بیچنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے انھیں اقتصادی نقصان ہو رہا تھا۔ ایسی حالت میں جب مولانا آزاد نے اپنی کتاب کے اختیار یافتہ ناشر سے خط وکتابت کرنا چاہا تو سرکار نے انھیں اس کی اجازت نہیں دی (۱۵۱)۔ احمد آباد سے رہا ہو کر انھوں نے شملہ کانفرنس میں کانگریس پارٹی آف انڈیا کے نمائندہ وفد کی قیادت کی۔

مولانا آزاد نے شملہ کانفرنس میں کانگریس کی قومی تصویر کو بگاڑنے والی لیگ کی کسی بھی تجویز کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ لیگ سے کانگریس کا سمجھوتہ کرانے کی کوشش کا ہمیشہ استقبال کرتے تھے لیکن کانگریس کی قومی شبیہ کو نقصان پہنچانے والی کسی بھی تجویز یا عمل کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ مانتے تھے کہ مسلم لیگ ایک فرقہ پرست تنظیم ہے لیکن ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ قومی مسئلہ ہے، کانگریس اس مسئلے پر فرقہ وارانہ نظریے سے غور نہیں کر سکتی۔ ۱۹۴۵ء کا سال ختم ہونے تک لیگ اور کانگریس میں سمجھوتہ کرانے کی تمام کوششیں خواہ وہ دونوں جماعتوں میں سیدھی گفتگو سے ہوئی ہوں یا موجودہ حکومت ہند

کی ثالثی سے، ناکام ہو چکی تھیں۔ اس کے باوجود مولانا کانگریس کی قومی شبیہ کو پس پشت ڈال کر کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ قومیت کی بنیاد پر ہی ہندوستان کی آزادی قابل قبول ہو سکتی تھی۔ فرقہ وارانہ افکار و خیالات کا قومی مسائل کے حل میں آڑے آنا یا اس کا اٹھایا جانا انھیں پسند نہ تھا گرچہ وہ اس بات کے لیے تیار تھے کہ قومی سطح پر حکومت کی تشکیل میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے مساوی درجہ دیا جائے اور مسلمانوں میں احساس تحفظ پیدا کرنے کے لیے انتظامات کیے جائیں لیکن وہ چاہتے تھے کہ یہ سب مسلم لیگ کے زور، دباؤ یا مانگ کی بنیاد پر نہ ہو کر خود کانگریس کی جانب سے ہونا چاہیے، جیسا کہ انھوں نے ۱۹۴۵ء میں گاندھی جی کو صلاح دیا تھا۔ ان کا مقصد تھا کہ نظریہ قوم پرستی کے ساتھ چلتے ہوئے ملکی آزادی کے حصول کی کوشش کی جائے۔ اپنے قومی افکار و خیالات کے ذریعہ انھوں نے قوم پرست ہونے کا ثبوت ملک کے سامنے پیش کیا۔ قوم پرستی کی اسی موج کی لہر میں ۱۹۴۵ء کا سال آہستہ آہستہ کھسکنے لگا اور اس کے بعد ہندوستانی قومی تحریک کا نقشہ ہی بدل گیا۔

(۸)

تقسیم کی جانب

(۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۶ء)

ہندوستان کے خلاف انگریزی ڈپلومیسی کی شاطرانہ و بدبختانہ روش کی وجہ کر ہی مسٹر جناح کے ذریعہ ویول منصوبے کو نامنظور کر دیے جانے سے شملہ کانفرنس ناکام ہوگئی تھی اور ہندوستانی سیاست ایک مرتبہ پھر غیریقینی صورت حال سے دوچار ہوگئی تھی۔ اس درمیان انگلینڈ میں ہوئے نئے انتخاب کے نتیجے میں لیبر پارٹی کی حکومت قائم ہوئی اور نئی پارلیمنٹ کے افتتاح کے موقع پر شہنشاہ برطانیہ نے ہندوستانیوں کے ہم خیال لیڈروں سے مل کر ہندوستان میں جلد ہی خودمختار حکومت شروع کرنے کی سمت میں حتی المقدور کوشش کرنے کا خیال ظاہر کیا(۱)۔ لارڈ ویول کو مشورے کے لیے لندن طلب کیا گیا اور ہندوستان میں مرکزی وصوبائی مجالس منتظمہ کے لیے عام انتخاب کرانے کا اعلان کیا گیا(۲)۔ ۱۹ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو لارڈ ویول نے ایک دستور ساز کاؤنسل کا انعقاد کرنے کے لیے انتخابات کے اعلان کے سلسلے میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے لیے نیا دستور تیار کرنے اور اسے عملی شکل دینے کا کام پیچیدہ اور مشکل ہے۔ ہمیں سب سے پہلے انتخاب کرانے چاہئیں، جس سے ہندوستانی انتخاب کنندگان کی خواہش کا پتہ لگ جائے(۳)۔

۱۹۴۵ء کے انتخابات

کل ہند کانگریس کمیٹی نے قوم کی خواہشات کو ظاہر کرنے اور ان کے لیے اقتدار حاصل کرنے کے مقصد سے انتخابات میں حصہ لینے کی تیاری شروع کر دی۔ ۲۱ر سے ۲۳ر ستمبر ۱۹۴۵ء تک بمبئی میں کل ہند کانگریس کمیٹی کی میٹنگ میں انتخابی انتظامات کے لیے ۲۱ر

ستمبر کو سات افراد پر مشتمل، جس میں مولانا ابوالکلام آزاد، سردار ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرساد، پنڈت گووند ولبھ پنت، مسٹر آصف علی، ڈاکٹر پٹابھی سیتا رمیا اور مسٹر شنکر راؤ دیو شامل تھے، ایک ذیلی انتخابی کمیٹی تشکل دی گئی(۴)۔ وائسرائے لارڈ ویول کے ذریعہ انتخابات کے اعلان کیے جانے کے وقت مولانا آزاد صحت یابی کے لیے کشمیر گئے ہوئے تھے۔ آنے والے عام انتخابات میں کانگریس کے حالات پر غور کرتے ہوئے اس کے کارکنان کو جیل سے رہا کرانے کے بارے میں انہوں نے وائسرائے لارڈ ویول کو گلمرگ سے ایک خط لکھا تھا کہ ''میں نے شملہ میں سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ نہیں اٹھایا کیوں کہ یہ اس کا صحیح وقت نہ تھا۔ اب حالات بدل گئے ہیں، لڑائی ختم ہو چکی ہے اور عام انتخابات کا اعلان کیا جا چکا ہے، اسی لیے عام معافی دے دینی چاہیے۔ ہندوستانی عوام اور سرکار دونوں کے مفاد میں یہ ضروری ہے۔ جہاں تک قیدیوں کا سوال ہے تو وہ کئی سال سے جیل میں رہ رہے ہیں اور کچھ مہینے اور بھی رہ سکتے ہیں۔ کچھ وقت اور جیل میں پڑے رہنے سے ان کا کچھ نہ بگڑے گا، مگر سمجھوتے کی امید کم ہو جائے گی۔ اگر سرکار نیا سیاسی ماحول پیدا کرنا چاہتی ہے تو اسے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دینا ہوگا''(۵)۔ لارڈ ویول نے سیاسی قیدیوں کی رہائی کی بات منظور کر لی لیکن عام معافی نہ دی، جس وجہ سے بائیں بازو والے کانگریسی جیل سے باہر نہ آسکے۔ ان میں جے پرکاش نارائن، رام نندن مشر وغیرہ کئی لوگ شامل تھے۔ مولانا آزاد کو اس سے اطمینان نہیں ہوا، لہٰذا ماہ ستمبر میں بمبئی میں کانگریس کی اعلیٰ کمیٹی کی میٹنگ کے بعد انھوں نے پھر لارڈ ویول کو ایک خط میں لکھا تھا کہ اگر اس مٹھی بھر سیاسی قیدیوں کو نہ چھوڑا گیا تو ملک پر اس کے جو برے اثرات مرتب ہوں گے وہ نہایت ہی افسوسناک ہوں گے۔ اگر وہ ملک میں صحیح قسم کا ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں تو انھیں عام معافی دینے کے لیے راضی ہو جانا چاہیے۔ آخرکار لارڈ ویول نے سبھوں کو عام معافی دینا منظور کر لیا اور تمام لوگ رہا کردیے گئے۔ ملک کی آزادی کا حلف لیتے ہوئے ہندوستان کے آئندہ نظام حکومت کی جھلک دیتے ہوئے کانگریس نے ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو ایک انتخابی مینی فیسٹو بھی شائع کر دیا(۷)۔ اس مینی فیسٹو میں ۸ر اگست ۱۹۴۲ء کے تجاویز کی مانگوں اور چیلنجوں کی تائید کرتے ہوئے اس تجویز کو چناؤ کی اصل بنیاد مان کر چناؤ لڑنے کا اعلان کیا گیا تھا(۸)۔

انتخاب میں کانگریس کا ٹکراؤ لیگ سے تھا۔ لیگ کے انتخابی پروپیگنڈے کا لہجہ کانگریس سے انتقام لینے کا لہجہ تھا۔ اس نے عوام میں مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ جذبات اُبھارنے کے لیے بھرپور پروپیگنڈہ کیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد چاہتے تھے کہ کسی طرح سے لیگ کے خلاف کانگریس کو کامیابی حاصل ہونی چاہیے اور اگر ایسا ہو کہ ملک بھر میں کہیں پر کانگریس کے کامیاب ہونے کا امکان نہ ہو تو وہاں لیگ کے علاوہ دوسری پارٹیوں کو کامیاب بنانے کے لیے کانگریس کو پوری کوشش کرنی چاہیے۔ ایسا کرنے کے لیے ان کا خیال تھا کہ لیگ کے علاوہ جو مسلم پارٹیاں ہیں ان کو ملا کر ایک کرنے کی کوشش کانگریس کو کرنی چاہیے اور ان کی متحدہ تنظیم میں سے امیدواروں کو چن کر کانگریس کو ان کی پوری حمایت کرنی چاہیے۔ اس کے لیے انھوں نے خود ہی مسلمانوں کو منظم کرنے کا کام شروع کیا تھا۔ ان کی صدارت میں دلّی میں قوم پرست مسلمانوں کی ایک نشست میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ سیٹوں کا بٹوارہ اس طرح ہونا چاہیے کہ مختلف قوم پرست پارٹیوں کے نمائندوں میں سے ایک فرد مسلم لیگ سے سیدھا مقابلہ کرے(۹)۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک میں لیگ کو شکست سے دوچار کرنے کے لیے ایسی ہی کوششیں کی جانی چاہئیں۔ اس کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ مولانا آزاد نے ڈاکٹر راجندر پرساد کو ایک خط میں صاف لکھا تھا کہ ''بنگال میں جس طرح جوائنٹ بورڈ بنا ہے، بہار میں بھی اسی طرح بنانا چاہیے۔ ''مومن انڈپنڈنٹ پارٹی'' اور ''نیشنلسٹ'' ان کے علاوہ ہیں۔ سب کو ملا کر بورڈ بنانا چاہیے، جس طرح (نیشنلسٹ مسلمانوں کا) سنٹرل بورڈ بنا ہے اور اس کی طرف سے امیدوار کھڑے کرنے چاہئیں۔ جن حلقوں میں مومن برادری کی کثرت ہو وہاں ان میں سے امیدوار چنے جائیں۔ جہاں دوسری جماعت کا اثر ہو وہاں اس جماعت سے اُمیدار چنے جائیں''۔
کانگریس کی کمزور حالت کو سمجھتے ہوئے اور ملک کے موجودہ ماحول کو دیکھتے ہوئے انھوں نے صاف طور پر کہا تھا کہ ''موجودہ آب و ہوا کو دیکھتے ہوئے اس بات کی بہت کم گنجائش ہے کہ مسلمانوں میں ڈائرکٹ کانگریس کا ٹکٹ کامیاب ہو جائے''۔ انھوں نے اس حالت میں جیتنے کا راستہ بتاتے ہوئے لکھا کہ ''صحیح طرز عمل یہی ہوگا کہ نیشنلسٹ بورڈ کی طرف سے امیدوار کھڑے ہوں اور انھیں پوری مالی مدد دی جائے۔ اس الیکشن کا ایشو یہ نہیں ہے کہ کانگریس کے ٹکٹ پر کتنے مسلمان کامیاب ہوئے بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ کتنے غیرلیگی مسلمان کامیاب ہوئے ہیں''۔

انتخابات میں کانگریس کو بنگال، پنجاب اور سندھ کے علاوہ دیگر سبھی صوبوں میں اکثریت حاصل ہوئی۔ بنگال میں لیگ کو اور پارٹیوں کے مقابلے زیادہ سیٹیں ملیں۔ تقریباً آدھی سیٹوں پر اس کا قبضہ ہوا۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی اور لیگ نے لگ بھگ برابر سیٹیں حاصل کیں۔ سندھ میں لیگ بڑی پارٹی کی شکل میں سامنے آئی لیکن اسے اکثریت حاصل نہیں ہوئی۔ ان تینوں صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ شمال مغربی صوبے میں جہاں مسلمانوں کی سب سے زیادہ اکثریت تھی، وہاں لیگ کی ساری کوششیں ناکام رہیں اور وہاں کانگریس کی حکومت بنی(۱۱)۔ پنجاب میں مولانا آزاد نے یونینسٹ پارٹی اور کانگریس کے درمیان گفتگو کرا کر یونینسٹ پارٹی کے لیڈر خضر حیات خاں کے زیر قیادت حکومت سازی میں مدد کی۔ بمبئی کی مجلس عاملہ کی نشست میں پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا کے ذریعہ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کے ساتھ کانگریس کے اشتراک کی مخالفت کی اور یہاں تک کہا کہ انھوں نے (مولانا آزاد نے) کانگریس کے وقار کو مجروح کیا ہے، جب کہ ان (مولانا آزاد) کی کوششوں سے لیگ وہاں الگ تھلگ پڑ گئی تھی اور اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی کانگریس پنجاب کی سیاست میں فیصلہ کن جماعت بن گئی تھی۔ خضر حیات خاں وزیر اعلیٰ بنے اور وہ ذہنی طور پر کانگریس کے زیر اثر آگئے تھے(۱۲)۔

پنڈت جواہر لال نہرو کا خیال تھا کہ اکثریتی جماعت ہوئے بغیر کانگریس کا سرکار میں حصہ لینا ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے کانگریس کو سمجھوتہ کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑے گا اور شاید اسے اپنے اصولوں سے بھی ہٹنا پڑے۔ اس پر مولانا کا کہنا تھا کہ اس بات کا تو کوئی خطرہ نہیں کہ کانگریس کو اپنے اصول چھوڑنے پڑیں۔ لاہور میں انھوں نے جو فیصلہ کیا ہے اگر کانگریس کو وہ پسند نہ آیا ہو تو وہ جو پالیسی چاہے اپنا سکتی ہے۔ کانگریس کے ذریعہ مجلس وزارت میں بنے رہنے کی کوئی گارنٹی نہیں دی گئی ہے اور وہ جب چاہے تب ہٹ سکتی ہے۔ گاندھی جی نے ان کے خیالات کی پُرزور تائید کی اور کہا کہ مولانا صاحب نے جو کچھ کہا ہے، میں اس میں ردّ و بدل کرنے کے خلاف ہوں۔ بعد میں دوسرے دن جواہر لال نہرو نے مولانا کی بات مان لی(۱۳)۔

کیبنٹ مشن

۱۹ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو انگلینڈ کے وزیر اعظم مسٹر کلیمنٹ ایٹلی نے ایک ریڈیو نشریے میں حکومت برطانیہ کا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے کہا تھا کہ کرپس منصوبے کو بد قسمتی سے ہندوستانی لیڈروں نے منظور نہیں کیا لیکن حکومت اب بھی اسی ارادے اور جذبے سے کام کر رہی ہے۔ ... ہندوستان کے تئیں برٹش پالیسی کی وہی تشریح، جو ۱۹۴۲ء کے اعلان میں پوشیدہ ہے اور جسے اس ملک کی سبھی پارٹیوں کی حمایت حاصل ہے، اپنے اغراض و مقاصد کے نظریے سے حسب سابق موجود ہے۔ اس اعلان میں برٹش سرکار اور قانون ساز کاؤنسل (ہندوستانی) کے درمیان ایک معاہدہ کیے جانے کا خیال ظاہر کیا گیا تھا۔ سرکار جلد ہی معاہدے کے مسودے کا خاکہ تیار کر رہی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس معاہدے میں ہندوستان کے مفاد کے خلاف کوئی بھی بات نہیں رکھی جائے گی (۱۴)۔ اس کے ایک دن پہلے ہی وائسرائے لارڈ ویول برٹش سرکار کے اراکین سے مشورہ کرنے کے بعد لندن سے لوٹے تھے اور ۱۸ر تاریخ کو ہی انہوں نے ہندوستان میں اس پالیسی کے سلسلے میں ایک بیان دے کر واضح کر دیا تھا کہ برٹش سرکار ابھی ہندوستان کو آزادی دینے نہیں جا رہی ہے بلکہ انتخابات کے بعد صوبائی مجلس منتظمہ کے نمائندوں سے گفتگو کر کے وائسرائے یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ انہیں ۱۹۴۲ء میں اعلان شدہ تجاویز منظور ہے یا وہ کسی متبادل یا ترمیم شدہ منصوبے کو ترجیح دیتے ہیں (۱۵)۔ ہندوستان میں انتخابی دور کے وقت میں ہی ۴ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس نے ہاؤس آف لارڈ میں ایک بیان دے کر کہا کہ سرکار اس بات کو بہت ہی اہمیت دیتی ہے کہ ہماری پارلیمنٹ کے کچھ ممبران کو ہندوستان کے ممتاز سیاسی لیڈران سے مل کر ان کے خیالات جاننے کے مواقع حاصل ہوں ... اسی لیے شاہی حکومت ''امپائر پارلیمنٹری ایسوسی ایشن'' کی طرح سے پارلیمنٹ کا ایک وفد ہندوستان بھیجنے کا نظم کر رہی ہے۔ وزیر ہند نے اس بیان میں یہ تسلیم کیا تھا کہ مکمل خود مختاری کا حصول ملکی نظام کا کنٹرول ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں سونپ دینے سے ہی ہو سکتا ہے (۱۶)۔

مولانا آزاد انگلینڈ کی کسی بھی سرکار کے وعدوں پر اعتبار نہیں کرتے تھے لیکن صبر کے ساتھ حالات دیکھ کر کام کرنا چاہتے تھے۔ ان کی نظر میں ہندوستان کے معاملے میں لیبر اور کنزرویٹو پارٹی دونوں ایک جیسے تھے۔ انہوں نے لیبر پارٹی کی سرکار کی پالیسیوں پر ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم نے گزشتہ تین برسوں کی جدو جہد میں جو طاقت مجتمع کی ہے، ان کا عجلت پسندی کے ساتھ ضیاع نہیں ہونا چاہیے۔ مزدور سرکار کا رویہ ہندوستان کے تئیں رجعت پسندانہ ہے۔ ہمیں اب برٹش سرکار کے وعدوں پر اعتبار نہیں ہے۔ آزادی پانے میں اپنی طاقت وقوت کا ہی بھروسہ ہے (۱۷)۔

انگلینڈ کی سرکار آہستہ آہستہ آگے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مزدور سرکار کے وزیر ہند مسٹر پیتھک لارنس نے فروری ۱۹۴۶ء میں ہندوستان میں حصول خود مختاری کی خاطر کیے جانے والے طریقوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان میں درج ذیل طریقے شامل ہیں۔

اوّل، برٹش بھارت کے منتخب نمائندوں اور ہندوستانی ریاست سے ابتدائی بات چیت کر کے دستور سازی کے مناسب طریقوں کے سلسلے میں وسیع بنیاد پر کوئی سمجھوتہ کر لیا جائے۔ دوم، کسی دستور ساز ادارے کی تشکیل ہو۔ سوم، ایک ایسے کاؤنسل کی تشکیل کی جائے، جسے ممتاز سیاسی پارٹیوں کی حمایت حاصل ہو۔ اس کے ساتھ ہی برطانوی کابینہ کے اراکین، وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس، شعبۂ تجارت کے چیئر مین سر اسٹی فرڈ کرپس اور بحریہ کے وزیر اے۔ بی۔ الکزینڈر کا ایک خصوصی نمائندہ وفد ہندوستان بھیجنے کا اعلان کیا گیا (۱۸)۔ مولانا آزاد کا اس پر ردِ عمل یہ تھا کہ لیبر سرکار نے ایک فیصلہ کن قدم اٹھایا ہے۔ یہ تبدیلی بڑی اہمیت کی حامل ہے (۱۹)۔

۲۳ر مارچ ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن کے ممبران ہندوستان پہنچ گئے اور فرقہ پرست و سیاسی لیڈران سے ملاقاتوں کی شکل میں انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ کیبنٹ مشن نے کہا کہ ہمارے پاس لیڈروں کے سامنے رکھنے کے لیے کوئی ٹھوس تجویز نہیں ہے (۲۰)۔ کرپس نے ایک بیان میں صاف کہا تھا کہ وہ ہندوستان میں مخالف دعوؤں کا فیصلہ کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں اقتدار سونپنے کے طریقے نکالنے آئے ہیں (۲۱)۔ ایسی حالت میں جو بات چیت ہوئی وہ ایک عام طریقے کی نیز مناسب تدبیر ڈھونڈنے کے لیے کی جانے والی بحث کی شکل میں تھی۔

مولانا آزاد اس وقت تک اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ سب سے اہم اور قابل غور مسئلہ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان کا سیاسی مسئلہ نہیں بلکہ ہندوستان کا فرقہ وارانہ مسئلہ

ہے(۲۲)۔ مستقبل میں حکومت سازی کا مسئلہ بھی اسی بات سے متعلق تھا۔ مسلمانوں کو ان کے مستقبل کی مستحکم پوزیشن کا یقین دلانے کے لیے وہ مرکز میں وفاقی حکومت کا ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ انھی کے لفظوں میں وفاقی حکومت میں Decentrilization of Power ہو تو اقلیتوں کا ڈر دور کرنے میں بھی مدد ملے گی(۲۳)۔ چنانچہ ان کا واضح اور قطعی خیال تھا کہ اس ملک کی جو ساخت ہے (زبان، رسم و رواج اور جغرافیائی اختلافات) اسے دیکھتے ہوئے یہاں کا دستور وفاقی ہونا چاہیے اور یہ دستور اس طرح بنایا جانا چاہیے کہ صوبوں کو حتی الامکان زیادہ سے زیادہ معاملات میں خود مختاری حاصل ہو سکے(۲۴)۔ اس کے لیے مولانا آزاد کے مطابق سب سے پہلا قدم تو یہ تھا کہ کوئی ایسا فارمولا تلاش کیا جائے کہ جس کے مطابق کم سے کم ایسے موضوعات متعین کیے جائیں جن کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرکزی حکومت پر ہو اور یہ موضوعات لازمی طور پر وفاقی حکومت کے موضوع ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ ایک فہرست ایسے موضوعات کی ہونی چاہیے، جن کی ذمہ داری صوبہ جات چاہیں تو مرکز سنبھال سکے۔ ایک تیسری فہرست بھی ہونی چاہیے جن کے بارے میں صوبائی قانون ساز اسمبلی یہ طے کرے کہ انھیں صوبائی موضوع ہی رکھا جائے یا ان کی ذمہ داری مرکز کو سونپ دی جائے۔ اگر ایسا آئین بنایا جائے جس میں یہ اصول پوشیدہ ہو تو یہ طے ہو جائے گا کہ مسلمانوں کی اکثریت والے صوبوں میں تین کو چھوڑ کر بقیہ امور کا نفاذ صوبہ ہی کرے گا۔ اس سے مسلمانوں کے دل سے یہ خوف نکل جائے گا کہ ہندو ان پر غلبہ حاصل کر لیں گے(۲۵)۔

کیبنٹ مشن سے ہونے والی بات چیت میں ۶/اپریل ۱۹۴۶ء کو مولانا آزاد نے اپنا مندرجہ بالا خیال بطور اشارہ مشن کے سامنے رکھا۔ مولانا کے مطابق لارڈ پیتھک لارنس نے اس سے متاثر ہو کر کہا کہ آپ تو سچ مچ فرقہ وارانہ مسائل کا ایک نیا حل سمجھا رہے ہیں(۲۶)۔ مسٹر کرپس سے بات چیت کے بعد مولانا آزاد کو محسوس ہوا کہ سر اسٹیفورڈ کرپس بھی ان کے نقطۂ نظر سے متفق ہیں(۲۷)۔

۲/اپریل کو کانگریس مجلس عاملہ کی بیٹھک میں مولانا آزاد نے اپنا یہ خیال پیش کیا۔ مولانا کے مطابق مجلس عاملہ میں گاندھی جی نے ان کی مکمل تائید کی تھی۔ سردار پٹیل نے سکہ و مالیات، صنعت و تجارت اور کامرس کو بھی مرکز کی فہرست میں رکھنے کا سوال اٹھایا تھا

لیکن گاندھی جی نے یہ کہہ پٹیل کو مطمئن کر دیا کہ یہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ مال اور سرحدی ٹیکس جیسے سوالوں پر صوبائی حکومتوں سے مرکز کے اختلافات ہوں گے۔ ان معاملات میں ایک متعلقہ پالیسی اپنانا تو ان کے اپنے ہی مفاد میں ہوگا۔ اس لیے یہ اصرار کرنا ضروری نہیں کہ خزانہ یا مالیات کو مرکزی امور کی لازمی فہرست میں شامل کیا جائے(۲۸)۔ اس کے بعد مولانا آزاد نے ۱۵/اپریل ۱۹۴۶ء کو ایک بیان دے کر اپنے منصوبے کو ملک کے عوام کے سامنے پیش کیا۔ اس میں انہوں نے مرکز میں ہندو اکثریت ہونے سے مسلم اکثریتی صوبوں پر مرکز کا دباؤ پڑنے کے مسلمانوں کے شبہات دور کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''میں کانگریس سے جو فارمولا منوانے میں کامیاب ہو گیا ہوں وہ فارمولا ایسا ہے، جس میں وہ سب خوبیاں تو ہیں، جو پاکستان کے منصوبے میں ہیں مگر جو اس کی خامیوں اور کمزوریوں سے پاک ہیں۔ پاکستان کے منصوبے کی بنیاد یہ ہے کہ مسلم اکثریتی علاقوں میں مرکزی حکومت دخل دے گی کیوں کہ مرکز میں ہندو اکثریت ہوگی۔ اس اندیشے کا جواب کانگریس اس طرح دیتی ہے کہ وہ صوبوں کو پوری پوری خود مختاری دے گی اور بے حساب طاقتیں (اختیارات) صوبوں میں پوشیدہ رہیں گے۔ اس نے مرکزی موضوعات کی دو فہرست بھی تیار کی ہیں، جن میں سے ایک لازمی ہے اور دوسری اختیاری، تاکہ اگر کوئی صوبہ چاہے تو سبھی موضوعات کو اپنے ہاتھ میں رکھ سکتا ہے۔ بس کچھ ہی موضوع ایسے ہوں گے جن کا اختیار مرکز کو سونپا جائے گا۔ چنانچہ کانگریس کے منصوبے میں یہ قطعیت ہو جاتی ہے کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں داخلی طور پر جیسے چاہیں ویسے ترقی کرنے کی چھوٹ ہوگی لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسے معاملوں کو لے کر وہ مرکز پر بھی دباؤ ڈال سکتے ہیں، جن کا تعلق پورے ہندوستان سے ہے(۲۹)۔

کیبنٹ مشن بھی بڑی حد تک اس منصوبے کی حمایت میں تھا لیکن مشن کی لیگ و کانگریس کے لیڈران سے ہونے والی باتوں سے کوئی حل نہ نکلا تو ایک بار پھر کوئی حل نکالنے کے لیے نئی کوشش شروع ہوئی۔ ۲۷/اپریل کو مشن کی جانب سے ایک بیان جاری کیا گیا کہ اہم مدعوں کی منظوری کے تعلق سے سمجھوتے کی بنیاد تلاش کرنے والوں کے لیے رسمی تبادلۂ خیال پسندیدہ ہوگا(۳۰)۔ ۲۷/اپریل ۱۹۴۶ء کو ہی کیبنٹ مشن کی جانب سے لارڈ پیتھک لارنس نے صدر کانگریس کو ایک خط لکھا۔ اس خط میں کیبنٹ مشن اور وائسرائے

دونوں کی کانگریس و لیگ کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا اور دونوں کے چار چار نمائندوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ان نمائندوں کو گفتگو کے لیے بنیادی طور پر کچھ اصول بتائے گئے تھے، جن پر کہ وہ نمائندے وائسرائے اور کیبنٹ مشن سے بات کریں گے۔ ان بنیادی اصولوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ برطانوی ہند کے آئندہ قانون کا ڈھانچہ اس طرح ہونا چاہیے۔ ایک وفاقی حکومت جس کے تحت غیر ملکی تعلقات، دفاع اور آمد و رفت کے موضوعات ہوں گے۔ صوبوں کے دو گروپ ہوں گے ایک ہندو اکثریتی اور دوسرا مسلم اکثریتی۔ دونوں کے تحت وہ سب امور ہوں گے جن پر اپنے اپنے گروپ کے صوبے ایک ساتھ مل کر کام کرنا چاہتے ہوں۔ دیگر سبھی امور صوبائی حکومتوں کے تحت ہوں گے اور انھیں (صوبائی حکومتوں کو) تمام باقی ماندہ حق رائے دہی بھی حاصل ہوگی۔ خط میں کہا گیا تھا کہ ایسا یقین ہے کہ سمجھوتے کی بات چیت کے نتیجے میں طے ہونے والی شرائط کے ساتھ ملکی ریاست بھی قانون کے اس ڈھانچے کے تحت اپنا مقام حاصل کرے گی۔ بات چیت کے مقام کا تعین نہیں کیا گیا لیکن پیتھک لارنس نے شملہ کا امکان ظاہر کیا تھا(۳۱)۔ ایسا ہی ایک خط مسلم لیگ کے صدر کو بھی لارڈ پیتھک لارنس کی جانب سے بھیجا گیا تھا۔

کانگریس مجلس عاملہ سے مشورے کے بعد مولانا آزاد نے ۲۶/اپریل ۱۹۴۶ء کو وائسرائے کے نام خط لکھا۔ اس میں انہوں نے شملہ کی دعوت قبول کرتے ہوئے آزاد شدہ اکائیوں کا ایک فیڈریشن بنانے کی ضرورت پر زور دیا اور وائسرائے نے جن گروپوں کی تشکیل کا اشارہ دیا تھا، انہیں فیڈریشن کے لیے نقصان دہ کہہ کر نامنظور کر دیا۔ انہوں نے ملکی ریاستوں کو ہندوستانی فیڈریشن میں شامل ہونے کو ضروری بتایا اور یہ واضح کر دیا کہ آزادیٔ ہند اور اس کے نتیجے میں ہندوستان سے برطانوی فوج ہٹائے بغیر ہندوستان کے مستقبل یا عبوری بندوبست پر بات نہیں کی جاسکتی (۳۲)۔

اسی خط میں مولانا آزاد نے لارڈ پیتھک لارنس اور وائسرائے سے مجوزہ گفتگو کے لیے کانگریس کی طرف سے چار اشخاص مولانا آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل اور خان عبد الغفار خاں کے نام پیش کیے(۳۳)۔ اس کے جواب میں ۲۹/اپریل کو لارڈ پیتھک لارنس نے صدر کانگریس مولانا آزاد کو درج بالا امور پر تبادلۂ خیال کی دعوت دیتے ہوئے ۲/مئی ۱۹۴۶ء کو شملہ میں گفتگو کے لیے مدعو کیا(۳۴)۔ ۲۹/اپریل کو ہی

لارڈ پیتھک لارنس نے مسٹر جناح کو ایک خط لکھا، جس میں کانگریس سے گفتگو کی اطلاع اور لیگ کو گفتگو کی دعوت دینے کے ساتھ ہی انہیں ۲/مئی کو شملہ گفتگو کے پروگرام کی خبر دی گئی، جو اس طرح تھی:

پروگرام

(۱) صوبائی گروپ:

(الف) ساخت

(ب) گروپ کے موضوعات کو طے کرنے کا طریقہ

(ج) گروپ کے تنظیم کی نوعیت

(۲) فیڈریشن:

(الف) وفاقی موضوعات

(ب) وفاقی قانون کی نوعیت

(ج) اقتصادی انتظام

(۳) نظم قانون سازی:

(الف) وفاقی نظریے سے

(ب) گروپ کے نظریے سے

(ج) صوبوں کے نظریے سے

مسٹر کرپس کے ذریعہ جو وفاقی خاکہ پیش کیا گیا تھا اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا آزاد نے مسٹر کرپس سے کہا تھا کہ مرکزی حکومت کے ذریعہ عمل درآمد کیے جانے والے موضوعات کی دو فہرست ہونی چاہئیں، ایک لازمی اور ایک اختیاری۔ لازمی فہرست میں خارجی و دفاعی معاملے شامل ہونے چاہئیں اور اختیاری فہرست کا دائرہ موجودہ حالات میں بقیہ سبھی موضوعات تک محیط ہوگا(۳۶)۔ مسٹر کرپس نے اس پر یہ مسئلہ اٹھایا تھا کہ اگر کچھ ریاستیں صرف پہلی فہرست کو ہی منظور کرتی ہیں اور کچھ پہلی و دوسری دونوں فہرست کو منظور کر لیتی ہیں تو ایسی حالت میں آپ کیا کریں گے؟ اس پر مولانا آزاد نے صاف طور پر کہا کہ ان موضوعات پر کانگریس مجلس عاملہ میں تبادلۂ خیال کی ضرورت ہے۔

یہی نہیں کئی ایسے موضوع ہیں، جن پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کی ضرورت ہے، جیسے مستقبل میں ہند اور برطانیہ کے تعلقات کیا ہوں؟(۸۷) مسٹر کرپس نے یہاں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ایسے موضوع، جن پر مولانا آزاد کی نظر میں غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے ان کی ایک فہرست بنا کر مولانا آزاد مسٹر کرپس کو دے دیں تا کہ مسٹر کرپس بھی اپنے لوگوں سے ان پر آپسی گفتگو میں تبادلۂ خیال کر سکیں۔

ان سبھی مسائل پر آپسی گفتگو سے، جو کرپس، مسٹر جناح اور کانگریسی نمائندوں سے کر رہے تھے، کسی بھی فیصلے پر نہیں پہنچا جاسکا۔ شملہ میں ایک کانفرنس بلا کر مسلم لیگ، کانگریس اور کیبنٹ مشن کے ممبروں کے بیچ کھلی بات چیت کے دوران اس موضوع پر تبادلۂ خیال کر کے کسی فیصلے پر پہنچنے کا فیصلہ کیا گیا۔

مولانا آزاد کیبنٹ مشن کی اس سہ سطحی تجویز والے حل پر تبادلۂ خیال کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے خود سراسٹی فرڈ کرپس کو مشورہ دیا تھا کہ کانگریس اور لیگ کے چار چار ممبر مل کر اس سہ سطحی حل پر بات کریں(۳۸)۔ لیگ کی طرف سے مسٹر جناح نے محمد اسمٰعیل، لیاقت علی وعبد الرب نشتر کا نام پیش کیا تھا۔

شملہ میں ۲ر سے ۱۲ر مئی تک تبادلۂ خیال جاری رہنے پر بھی کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا اور شملہ کانفرنس ناکام رہی۔ مشن کے ممبران نے شملہ سے لوٹ کر اپنی کچھ تجویز تیار کی اور ۱۶ر مئی ۱۹۴۶ء کو مسٹر اٹلی نے اپنی جانب سے ایک منصوبے کا ہاؤس آف کامن میں اعلان کیا۔ اس میں تین سطحوں پر نظم حکومت کا بندوبست کیا گیا تھا، صوبے، گروپ اور وفاق، نیز گروپ کو الف، ب، ج درجوں میں بانٹا گیا تھا(۳۹)۔

مولانا اس پورے منصوبے کو پسند کرتے تھے۔ مولانا نے اپنی کتاب ''انڈیا وِنس فریڈم'' میں لکھا ہے کہ مشن کے منصوبے میں یہ نظم تھا کہ صرف تین امور ہی لازمی طور پر مرکزی حکومت کے تحت ہوں گے۔ یہ تھے دفاع، خارجی معاملات اور مواصلات۔ میں نے بھی اپنے منصوبے میں یہی مشورہ دیا تھا مگر مشن نے اپنے منصوبے میں ایک جزو اور جوڑ دیا کہ اس نے ملک کو تین حلقوں الف، ب، اور ج میں بانٹ دیا کیوں کہ مشن کا خیال تھا کہ اس سے اقلیتوں میں اور بھی اطمینان کا جذبہ پیدا ہو جائے گا... مشن کا خیال تھا کہ اس سے مسلم اقلیت کو پوری طرح سے اطمینان ہو جائے گا اور لیگ کے جتنے بھی مناسب شبہات ہو

سکتے ہیں سب دور ہو جائیں گے(۴۰)۔ اس وجہ کر مولانا آزاد نے مجلسِ عاملہ سے مشورہ کرنے سے پہلے ہی کیبنٹ مشن کو ایک ذاتی خط میں لکھا تھا کہ وہ تجاویز سے متفق ہیں اور کانگریس کو بھی رضامند کرنا ان کے لیے ممکن ہوگا(۴۱)۔

مولانا چاہتے تھے کہ مسلم اکثریتی ریاستوں میں مسلمانوں کو خود مختاری دی جائے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مشن نے میری یہ بات بھی مان لی تھی کہ زیادہ تر امور صوبائی سطح پر سنبھالے جائیں گے اس لیے کثرت رائے والی ریاستوں میں مسلمانوں کو مکمل خود مختاری حاصل ہوگی۔ کچھ متعلقہ امور ایسے ہوں گے، جن کا نفاذ علاقائی سطح پر کیا جائے گا۔ اس سطح پر بھی گروپ 'ب' اور 'ج' علاقوں میں مسلمانوں کے کثرت رائے کی بات طے تھی اور اس طرح وہ اپنی تمام معقول ومناسب امیدوں کو کامیاب بنا سکتے تھے(۴۲)۔

اس منصوبے پر غور وخوض کرنے کے لیے کانگریس مجلس عاملہ کی میٹنگ ہوئی، جو کئی دنوں تک چلتی رہی۔ کمیٹی نے وائسرائے کے سامنے اس منصوبے کی خامیاں اور اپنا اعتراض رکھا۔ مجلس عاملہ کے مطابق صوبے مجبور نہیں ہیں کہ ان شعبوں میں بھی شامل ہوں، جن میں وہ جوڑ دیئے گئے۔ منصوبے کے مطابق قانون بن جانے کے بعد ہر ایک صوبے کو اختیار تھا کہ اسمبلی کی رائے سے وہ اس شعبے سے الگ ہو جائے۔ لیکن مجلس عاملہ کا کہنا تھا کہ اس کے علاوہ قانون بنانے کے لیے شعبوں کی الگ بیٹھک میں شریک نہ ہونے کا بھی ہر ایک صوبے کو اختیار ہے۔ صوبہ سرحد اور آسام دونوں ہی زبردستی شعبوں میں ملائے جانے کے خلاف تھے اس لیے ان کو یہ اختیار ملنا چاہیے کہ وہ شروع میں ہی شعبوں سے الگ رہ سکیں۔

مشن نے اپنی وضاحت میں کہا کہ اس کا ارادہ ایسا نہیں تھا کہ شروع سے ہی صوبے شریک نہ ہوں لیکن قانون بننے کے بعد صوبوں کو الگ ہونے کا اختیار تھا(۴۳)۔ ڈاکٹر راجندر پرساد کے مطابق اس منصوبے میں کسی بھی پارٹی کی مانگیں نہ منظور کی گئی تھیں اور نہ یکبارگی نامنظور ہی کی گئی تھیں۔ سبھی پارٹیوں کو کچھ نہ کچھ دے کر خوش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیگ کا مطالبۂ پاکستان نامنظور تو کیا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی صوبوں کو تین شعبوں میں اس طرح تقسیم کر دیا گیا تھا کہ جن صوبوں کو لیگ پاکستان میں ملانا چاہتی ہے ان کو دو شعبوں میں رکھ دیا گیا تھا اور باقی کو الگ ایک شعبے میں۔ پاکستان کی نامنظوری سے لیگ ناخوش اور دوسرے لوگ مطمئن تھے(۴۴)۔

بالآخر مسٹر جناح نے قبول کیا تھا کہ مشن کے منصوبے میں جو حل پیش کیا گیا ہے، اقلیتوں کے مسائل کا اس سے زیادہ انصاف پر مبنی حل اور نہیں ہو سکتا اور لیگ کو تو اس سے اچھی شرطیں اور مل ہی نہیں سکتیں (۴۵)۔

آخر کار لیگ اور کانگریس نے ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کا منصوبہ منظور کر لیا (۴۶)۔ مولانا آزاد نے کانگریس اعلیٰ کمیٹی کی بیٹھک میں کہا تھا کہ یہ منصوبہ کانگریس کی بہت بھاری جیت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تحریک اور آپسی گفتگو کے نتیجے میں انگریزوں کے ذریعہ ہندوستان کے قومی مطالبے کی منظوری تاریخ عالم کا ایک ایسا واقعہ ہے جس کی کوئی مثال نہیں۔ ۴۰ کروڑ کا ملک فوجی کارروائی کے بعد نہیں بلکہ تبادلۂ خیال اور بات چیت کے ذریعہ آزاد ہو رہا ہے۔ اگر صرف اس لحاظ سے دیکھیں تو بھی ہماری جیت کی کم قیمت لگانا کورا پاگل پن ہوگا۔ مشن کے منصوبے میں کانگریس کے نقطۂ نظر کے سبھی بنیادی عناصر منظور کر لیے گئے ہیں۔ کانگریس نے ہمیشہ ہندوستان کی آزادی و اتحاد کی حمایت اور پھوٹ کے رجحانات کی مخالفت کی ہے (۴۷)۔

عبوری حکومت یا جدید مجلس منتظمہ (انتظامی کاؤنسل)

کانگریس اور لیگ دونوں ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کے منصوبے کو منظور کرتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ دونوں نے نظم حکومت ہند کے تعلق سے آئندہ سیاسی ڈھانچے کی تجویز کو مان لیا ہے۔ اب اس پر حکومت کرنے نیز حکومت برطانیہ سے اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے نظام کی تشکیل کرنا باقی تھا۔ دوسرے لفظوں میں اقتدار اعلیٰ کے اختیارات کا مسئلہ حل ہونا ابھی باقی تھا۔ کیبنٹ مشن نے اس کے لیے عبوری حکومت کی تشکیل کا کام وائسرائے پر چھوڑ دیا تھا اور انھوں نے خود بغیر کسی ہندوستانی لیڈر کی منظوری کے فرقوں کے تین حصے عمومی (general) مسلمان اور سکھ کر لیے تھے، جن کی بنیاد پر حکومت تشکیل دی جانی تھی (۴۸)۔ آگے چل کر وائسرائے نے اسی بنیاد پر کام کیا۔ مولانا آزاد بہت قبل سے اس بات کے حمایتی تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو انتظامیہ اور عبوری حکومت میں فرقہ وارانہ شکوک و شبہات دور ہونے تک یکساں تناسب میں جگہ دی جائے۔ ان کا یہی نظریہ کانگریس کی عبوری حکومت سے متعلق پالیسی میں ایک اہم رول ادا کر رہا تھا۔ عبوری

حکومت کے قیام سے قبل ہی ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کے منصوبے کے انتظامات کے سلسلے میں مولانا آزاد نے ۱۷ مئی ۱۹۴۶ء کو کانگریس مجلس عاملہ کی ایک میٹنگ بلا کر تبادلۂ خیال کرنے کے بعد لارڈ پیتھک لارنس کو بیس مئی ۱۹۴۶ء کو ایک خط لکھ کر کانگریس کے نظریے کی وضاحت کی تھی کہ ''میری کمیٹی کے ووٹ سے تشکیل پا جانے کے بعد کاؤنسل خود قانون سازی کے لیے ایک خود مختار ادارہ ہوگا، جس کے کام میں کوئی بھی باہری طاقت مداخلت نہ کر سکے گی اور سمجھوتے میں اس کی شمولیت کے سلسلے میں بھی یہی بات لاگو رہے گی۔ ساتھ ہی کیبنٹ مشن کے ذریعہ کی گئی سفارشوں اور طریقۂ کار میں اپنی خواہش کے مطابق تبدیلی کر سکنے کے لیے کاؤنسل آزاد ہوگی نیز قانونی کاموں کے لیے قانون ساز کاؤنسل کے ایک خود مختار ادارہ ہونے کے ناطے اس کے آخری فیصلے خود بخود نافذ العمل ہوں گے ... قانون ساز کاؤنسل کو ہم ایک خود مختار مجلس کی شکل میں دیکھتے ہیں، جو اپنے سامنے موجود کسی بھی موضوع پر اپنی خواہش کے مطابق فیصلہ کر سکتی ہے۔ واحد پابندی جسے ہم اس سلسلے میں قبول کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ کچھ بڑے اور اہم فرقہ وارانہ مسائل کے فیصلے دونوں بڑے فرقوں میں سے ہر ایک کی کثرت رائے سے ہونے چاہئیں۔ میری کمیٹی محسوس کرتی ہے کہ ہندوستان میں غیر ملکی فوج کی موجودگی ہندوستان کی آزادی کو بے قدر و قیمت کر دے گی۔ قومی عبوری حکومت کے قیام کے وقت سے ہندوستان کو آزاد تصور کیا جانا چاہیے (۴۹)۔

مذکورہ خط سے واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا آزاد فوری آزادی چاہتے تھے اور ان کا قطعی خیال تھا کہ دونوں بڑے فرقے خود ہی اپنے مسائل حل کریں۔ قانون سازی کے کام میں دونوں کی یگانگت و تعاون میں ہی انھیں فرقہ وارانہ اتحاد کی سیاسی و علاقائی رکاوٹ کا حل دکھائی دیتا تھا۔ اس میں وہ کسی بیرونی طاقت کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔ مولانا کے خط کے جواب میں لارڈ پیتھک لارنس نے قانون ساز کاؤنسل کی برتری تو منظور کر لی لیکن قومی عبوری حکومت کے قیام کے وقت سے ہی ہندوستان کو آزاد نہ مان کر اس بات پر زور دیا کہ عبوری حکومت کا زمانہ حتی الامکان کم ہوگا اور نیا قانون نافذ العمل ہونے سے پہلے آزادی کا آغاز نہیں ہو سکتا (۵۰)۔

عبوری حکومت

عبوری حکومت کے قیام کے لیے کانگریس لگاتار اپنی کوششوں میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے مولانا آزاد، سردار پٹیل اور ڈاکٹر راجندر پرساد پر مشتمل ایک کمیٹی اس سلسلے میں رہنمائی کے لیے تشکیل دے کر اپنا کام شروع کر دیا تھا(۵۱)۔ کانگریس مجلس منتظمہ نے ۲۴مئی ۱۹۴۶ء کو ایک تجویز پاس کر کے یہ فیصلہ کیا کہ عبوری قومی حکومت اس مکمل آزادی کی مظہر ہونی چاہیے، جو قانون ساز کاؤنسل سے پیدا ہوگی۔ اس حقیقت کو سمجھ کر ہی اُسے رُو بہ عمل ہونا چاہیے، گرچہ موجودہ حالت میں قانون میں تبدیلی بھی نہیں ہوسکتی۔ عبوری دور میں گورنر جنرل حکومت کے سربراہ بنے رہ سکتے ہیں لیکن حکومت مجلس وزارت کی شکل میں کام کرے اور وہ مرکزی مجلس مقننہ کے تئیں جوابدہ ہو(۵۲)۔

۲۵ر مئی ۱۹۴۶ء کو مولانا آزاد نے وائسرائے لارڈ ویول کو خط لکھ کر ورکنگ کمیٹی کے مذکورہ فیصلے کی اطلاع دی نیز یاددہانی کرائی کہ آپ کے ساتھ میری جو آخری بات چیت ہوئی تھی، اس میں آپ نے کہا تھا کہ آپ کا ارادہ یہ ہے کہ آپ حکومت کے ایک آئینی صدر کی حیثیت سے کام کریں گے اور عملی طور سے قلیل مدتی حکومت کو آزاد شدہ نو آبادیات میں مجلس وزارت جیسے ہی حقوق حاصل ہوں گے(۵۳)۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ وائسرائے کے نظریے کی بنیاد پر ایک معاہدہ کانگریس اور وائسرائے کے درمیان ہوجانا چاہیے، جس سے آگے چل کر عبوری حکومت کو برٹش سرکار کے ساتھ ہونے والے معاملات میں کسی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ اس خط میں انھوں نے یہ بھی لکھا کہ یہ موضوع اتنا اہم ہے کہ اسے بے ضابطہ طور پر ہوئی گفتگو پر چھوڑ دینا نہ تو آپ کے تئیں منصفانہ ہوگا اور نہ ہی کانگریس مجلس عاملہ کے تئیں۔ قانون میں کوئی تبدیلی کیے بغیر بھی باضابطہ طور پر کوئی ایسا معاہدہ ہو سکتا ہے کہ جس سے کانگریس کی مجلس عاملہ کو یہ یقین ہو جائے کہ عبوری حکومت عملی طور سے ایک آزاد شدہ نوآبادی کی مجلس وزارت کی طرح ہی کام کرے گی۔

مرکزی اسمبلی کے تئیں عبوری حکومت کی ذمہ داری کے سوال پر بھی اسی طرح غور وفکر کیا جاسکتا ہے۔... عبوری حکومت کی مجلس وزارت کی شکل وصورت ساخت ونوعیت اور

تنظیمی خاکے سے متعلق دیگر تفصیلی امور بھی، جن کا ذکر آپ کے ساتھ ہوئی گفتگو کے دوران آیا تھا، مذکورہ دونوں بنیادی سوالوں کے تشفی بخش فیصلے پر ہی منحصر کریں گے(۵۴)۔

وائسرائے لارڈ ویول نے ۳۰ر مئی ۱۹۴۶ء کو ان کے خط کے جواب میں اس طرح کے تحریری معاہدے کے لیے اپنی ناپسندیدگی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس جذبے سے سرشار ہوکر سرکار کام کرے گی وہ کسی کنٹرول شدہ دستاویز اور یقین دہانی کی بہ نسبت کہیں زیادہ اہم ہے۔ بے شک اگر آپ مجھ پر اعتماد کرنے کو تیار ہیں تو ہم لوگ اس طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرسکیں گے کہ جس میں ہندوستان کو بیرونی پابندی سے آزادی کا احساس ہو سکے گا اور جیوں ہی نیا دستور بن جائے گا تیوں ہی ہم مکمل آزادی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلیں گے(۵۵)۔

مولانا آزاد مانتے تھے کہ عبوری حکومت کی صورت حال اور ذمہ داری (جوابدہی) کا تشفی بخش حل ہو جانے سے ہی دیگر مسائل کو سلجھانے کے لیے کوئی راستہ نکل سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے وائسرائے لارڈ ویول سے اپنے متذکرہ بالا خط میں یہ گزارش کی تھی۔

لارڈ ویول نے ۴ر جون ۱۹۴۶ء کو صدر مسلم لیگ مسٹر جناح کو ایک خط لکھا، جس میں انہوں نے کیبنٹ مشن کی طرف سے جناح کو یقین دلایا تھا کہ ہم (وائسرائے) دونوں پارٹیوں میں سے کسی ایک پارٹی سے عبوری حکومت کی تشکیل میں کسی طرح کی تفریق یا بھید بھاؤ کا برتاؤ نہیں کرنا چاہتے۔ مسٹر جناح نے ۳ر جون ۱۹۴۶ء کو ان سے یقین دہانی کا مطالبہ کیا تھا(۵۶)۔ اس یقین دہانی کو غالی جناب وائسرائے نے پوشیدہ رکھنے کی گزارش کی تھی۔ ایک دوسرے خط کے ذریعہ وائسرائے نے مسٹر جناح کو حکومت سازی کے سلسلے میں گفتگو کی دعوت دی تھی۔ اس کے جواب میں انہوں نے وائسرائے کو ۱۲ر جون ۱۹۴۶ء کو ایک خط کے ذریعہ مطلع کیا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ کانگریس نے اس سلسلے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ جب تک وہ کوئی فیصلہ نہ کرلے تب تک عبوری حکومت کے ممبروں کی فہرست یا محکموں کی تقسیم کے مسئلے پر غور و خوض کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ میں آپ کی اس بات سے متفق ہوں کہ اہم محکموں کی تقسیم دونوں بڑی پارٹیوں کے درمیان مساوی طور پر ہونی چاہیے(۵۷)۔ مسٹر جناح کے ساتھ ہی وائسرائے نے پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی اپنے ساتھ بات چیت کے لیے مدعو کیا تھا۔ جواہر لال نہرو

کو لکھے اپنے خط میں انہوں نے یہ لکھ دیا تھا کہ مساوات یا ایسے ہی کسی اور اصول پر غور و فکر کرنے کا میرا ارادہ نہیں ہے(۵۸) لیکن پنڈت نہرو نے یہ کہہ کر ملنا منظور کیا کہ ایسے معاملوں میں ہمارے اختیار یافتہ ترجمان جو ظاہر ہے کہ مولانا آزاد ہیں لہٰذا وہی قانونی طور سے کوئی گفتگو کر سکتے ہیں اور کچھ کہہ سکتے ہیں، میں نہیں کہہ سکتا(۵۹)۔ پھر بھی ۱۳ر جون کو وائسرائے لارڈ ویول کے سکریٹری مسٹر سی. ڈبلیو. وی. رینک نے جواہر لال نہرو کو وائسرائے کی طرف سے ۱۳ر جون ۱۹۴۶ء کو ملنے کی دعوت دی (۶۰)۔ پنڈت نہرو نے وائسرائے سے ملنے کے بعد مولانا آزاد اور کانگریس مجلس عاملہ کو بتایا کہ لارڈ ویول نے عبوری حکومت بنانے کے لیے کیا تجویز رکھی۔ صدر کانگریس مولانا آزاد نے پنڈت جواہر لال نہرو کے ذریعہ دی گئی جانکاری کی بنیاد پر عبوری حکومت کے سلسلے میں وائسرائے کو ایک خط لکھ کر غیر مستقل قومی حکومت بنانے میں اصول مساوات کے تیئں مخالفت ظاہر کی۔ انہوں نے صاف طور سے لکھا کہ ''آپ کی کیبنٹ سازی کی تجویز میں ہندوؤں، جن میں درج فہرست ذات شامل ہیں اور مسلم لیگ میں برابری رکھی گئی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی تعداد درحقیقت مسلم لیگ کے نامزد نمائندوں کی بہ نسبت کم رہے گی۔ گرچہ یہ ٹھیک ہے کہ فرقہ وارانہ مسائل کا فیصلہ الگ الگ گروپوں کے ووٹ کی بنیاد پر کرنے کا اصول ہم نے طویل مدتی نظام کی شکل میں قبول کیا ہے، پھر بھی یہ بات ہم نے دوسرے تحفظات کے بدلے ایک مؤثر ذریعہ کی شکل میں قبول کی تھی لیکن آپ کی موجودہ تجویز میں مساوات اور اس طرح کا سمجھوتہ دونوں چیزیں کہی گئی ہیں، جس کے نتیجے میں عبوری حکومت کا چلنا تقریباً ناممکن ہو جائے گا اور یقینی طور پر مزاحمت ہوگی''۔ اس کے ساتھ ہی مولانا آزاد نے عبوری حکومت میں ۱۵ اراکین رکھے جانے پر خصوصی زور دیا(۶۱)۔ مولانا آزاد کے اس خط میں وہ ساری باتیں واضح کر دی گئی تھیں، جن کی وضاحت عبوری حکومت کی تشکیل سے پہلے ہونا ضروری تھیں۔ ساتھ ہی یہ خط وائسرائے اور کانگریس کے مابین اختلافی نقطۂ نظر پر بھی بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ وائسرائے لارڈ ویول نے لیگ و کانگریس کو مساوی مانتے ہوئے انہیں برابر برابر نمائندگی، جیسا کہ مسٹر جناح چاہتے تھے، دینا چاہا لیکن صدر کانگریس مولانا آزاد ایسی پائیدار حکومت بنانے کے حق میں تھے، جو کامیابی کیساتھ چلے۔ ان کے ذہن میں یہ بات صاف تھی کہ یہی سرکار آئندہ آزادی کی آمد کا راستہ ہموار کرے گی اور اسی پر ملک کی فرقہ وارانہ حالت نیز مختلف فرقوں کے آپسی تعلقات منحصر کریں گے۔ اگر اس حکومت کی تشکیل میں لیگ کو برتری دے کر یا کانگریس کے مساوی ثابت کرتے ہوئے اور اقلیتوں و قوم پرست مسلمانوں کو نظرانداز کر کے سرکار بنائی جائے گی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے وائسرائے کو صاف صاف لکھا کہ مشترکہ حکومت کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے کم سے کم فی الحال کوئی یکساں نقطۂ نظر اور پروگرام ضرور رہنا چاہیے۔ اس طرح کی حکومت کے قیام کے لیے جو طریقہ اپنایا گیا ہے اسے نظر میں رکھتے ہوئے تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور میری کمیٹی کو یہ یقین ہے کہ اس طرح کی مشترکہ حکومت کبھی کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتی (۶۳)۔ اس طرح کانگریس نے کسی بھی حالت اور کسی بھی شکل میں سرکار بنانے کے لیے لیگ کے ساتھ کانگریس کو مساوی درجے میں رکھے جانے کی تجویز کو نامنظور کر دیا۔

کانگریس کی طرف سے ۵:۵:۲ کے فارمولے کو نامنظور کیے جانے پر وائسرائے نے ایک درج فہرست ذات کے نمائندے کو ملا کر کانگریس کے ۶ ممبر اور ۵ لیگ کے اور ۲ اقلیتی نمائندوں کے، یعنی کل ملا کر ۱۳ رکنی عبوری حکومت کی تجویز رکھی۔ کانگریس نے اس تجویز کو بھی نامنظور کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ۱۵ ممبران کی حکومت بننے پر ہی اقلیتوں کے حسب خواہش مناسب نمائندے لیے جا سکیں گے اور سب کو مطمئن کیا جا سکے گا (۶۴)۔ وائسرائے کانگریس کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے اور انہوں نے ایک اشتہار شائع کر کے یہ کہا کہ لیگ و کانگریس کی حکومت سازی کی کوشش ناکام ہوگئی لہٰذا اب وہ اپنی طرف سے حکومت سازی کی نئی تجویز رکھیں گے۔ ۱۵ر جون ۱۹۴۶ء کو انھوں نے ۱۴ر رکنی عبوری حکومت کی تجویز پیش کی اور اس میں ایک ہندو ہریجن سمیت ۶ کانگریسی، ۵ لیگی ۱ سکھ، ۱ عیسائی اور ۱ پارسی نمائندے کے ناموں کا اعلان کیا گیا (۶۵)۔ وائسرائے نے یہ واضح کر دیا تھا کہ اگر کوئی بھی فریق (لیگ یا کانگریس) عبوری حکومت بنانے کے سوال پر متفق نہیں ہوتا ہے تو وائسرائے خود اس اعلان شدہ بنیاد پر عبوری حکومت کی تشکیل کریں گے (۶۶)۔ کانگریس ابھی تجویز پر غور ہی کر رہی تھی کہ وائسرائے اور مسٹر جناح کے درمیان یہ طے ہوگیا کہ حکومت کے اراکین کی تعداد ۱۴ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اقلیتوں کی جو جگہ خالی ہوگی ان کی بھرتی میں لیگ کی رائے لی جائے گی۔ حکومت ایسا کوئی کام نہیں کرے گی، جس

میں لیگ کی کثرت آراء شامل نہ ہو(۶۷)۔ وائسرائے نے اس کے بارے میں ۲۲؍ جون ۱۹۴۶ء کو محمد علی جناح کو ایک خط بھیج کر اپنی رائے ظاہر کر دی کہ وائسرائے اور کیبنٹ مشن کے لیے کانگریس کے نمائندوں میں کسی بھی مسلمان کا نام جوڑے جانے کو قبول کرنا ممکن نہیں ہوگا(۶۸)۔ کانگریس اس تجویز میں یہ تبدیلی چاہتی تھی کہ کانگریسی نمائندوں میں ایک مسلمان کا نام شامل کیا جائے، لیکن وائسرائے نے ایک خط میں یہ واضح کر دیا کہ کانگریس اپنی طرف سے کسی مسلمان کا نام نہ دے کیوں کہ اس کی منظوری نہیں ہو سکے گی(۶۹)۔ انہوں نے مولانا آزاد کو لکھے خط میں اپنی بات کی تائید میں لکھا تھا کہ عبوری حکومت کا فیصلہ کسی بھی دیگر فرقہ وارانہ سوال کے حل کے لیے کسی بھی صورت میں مثال نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ یہ تو صرف موجودہ مشکلات کو حل کرنے کا محض ایک ذریعہ ہے اور اسی کے واسطے سے ہی اعلیٰ سطحی مشترکہ حکومت کا حصول ممکن ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس یقین دہانی کو نظر میں رکھتے ہوئے کہ کوئی مثال نہیں بنے گی ہم کانگریس سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنی اس مانگ کو چھوڑ دے اور اس عبوری حکومت میں حصہ لے جس کی ملک کو ضرورت ہے(۷۰)۔

مولانا آزاد نے اسے کانگریس کی بنیادی فکر اور اختیارات پر چوٹ تصور کیا۔ ان کی نظر میں یہ بھی عیاں ہوگیا تھا کہ اس طرح عارضی طور پر یا مثال نہ بنائے جانے کی یقین دہانی پر کچھ بھی تجویز مان لینا مستقبل کے لیے نقصان دہ ہوگا اور لیگ کے مقابلے میں کانگریس کی طاقت گھٹ جائے گی اور کانگریس کی جگہ پر لیگ کا غلبہ بڑھ جائے گا۔ اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے لکھا ”کیبنٹ مشن اور آپ عبوری حکومت کے لیے کانگریس کے نمائندوں میں کانگریس کے ذریعہ نامزد کیے گئے، کسی مسلمان کا نام قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں، ہمیں یہ ایک غیر معمولی فیصلہ محسوس ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کانگریس کو خود ہی اپنا نمائندہ چننے کی پوری آزادی نہیں تھی۔ یہ کہنے سے کہ اسے مثال نہیں سمجھنا چاہیے، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسے اہم اصول کی عارضی طور پر اگر نافرمانی بھی کر دی جائے تو بھی ہم اُسے کسی وقت یا کسی حالت میں ماننے کو تیار نہیں تھے“، عبوری حکومت میں وائسرائے کے ذریعہ صدر لیگ مسٹر جناح کو جب یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ فرقہ وار تناسب میں کوئی بھی تبدیلی دونوں بڑی جماعتوں کی رائے کے بغیر نہیں کی جائے گی تو مولانا آزاد نے وائسرائے کو لکھا تھا کہ ہم یہ بات منظور نہیں کر سکتے۔ اس سے کانگریس کی نمائندگی صرف

اعلیٰ ذات کے ہندوؤں تک محدود رہ جاتی ہے اور اس طرح لیگ و کانگریس دونوں کو مساوی نمائندگی مل جاتی ہے۔ فرقہ وارانہ مسئلے کا حل لیگ کے بغیر ممکن نہ ہونے کے سلسلے میں انہوں نے صاف صاف لکھا تھا کہ ہم نے یہ بات وفاقی کاؤنسل میں طویل مدتی نظام حکومت کے لیے منظور کی تھی، عارضی حکومت کی کاؤنسل کے تئیں جوابدہ ہونے اور کاؤنسل میں اعلیٰ ذاتوں کے نمائندے آبادی کی بنیاد پر منتخب ہونے کی حالت میں حالیہ یہ باتیں مجوزہ عارضی حکومت پر بھی لاگو ہو سکتی ہیں۔ اسے عارضی حکومت پر کسی طرح بھی لاگو نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اس کی تو بنیاد ہی یکسر مختلف ہے(۷۱)۔ خط میں مولانا آزاد نے وائسرائے کو ۱۶؍ جون ۱۹۴۶ء کے منصوبے کے مطابق کوئی عارضی حکومت بنانے کی تجویز کانگریس کے ذریعہ نامنظور کیے جانے سے بھی آگاہ کر دیا تھا(۷۲)۔

ڈاکٹر راجندر پرساد کے لفظوں میں اس کو منظور کرنے کا مطلب ہو جاتا تھا کہ کانگریس صرف ہندوؤں کی جماعت ہے اور صرف مسلم لیگ کو ہی مسلمانوں کی نمائندگی حاصل ہے(۷۳)۔ مولانا نے ایک بیان میں اس وجہ سے کانگریس کے ذریعہ یہ منصوبہ نامنظور کرنے کی معذوری ظاہر کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ کانگریس اپنی قوم پرستانہ شبیہ نہیں چھوڑ سکتی(۷۴)۔ اسی طرح اب کانگریس ۱۶؍ مئی ۱۹۴۶ء کی جدید دستور سازی کی بات کو تو منظور کرتی تھی لیکن ۱۶؍ جون ۱۹۴۶ء کی عبوری حکومت سازی کی وائسرائے کے منصوبے کو وہ نامنظور کر چکی تھی۔ مولانا آزاد لیگ کو مطمئن کرنے کی غرض سے مسلم نمائندوں کی جگہ خالی رکھنے پر بھی غور کر رہے تھے، لیکن یہ سوچ کر کہ ایسا کرنے سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ حکومت نامکمل اور غیر مستحکم ہے انہوں نے اس نقطۂ نظر کو چھوڑ دیا(۷۵)۔ مولانا آزاد کا نقطۂ نظر ان تمام سلسلۂ گفتگو میں لیگ کو مطمئن کرنے والا نیز اس کے تئیں معاون بنا رہا لیکن ان کی ساری کوششوں کے باوجود یہ منصوبہ عمل میں نہیں لایا جاسکا۔ مولانا کے لفظوں میں لیگ کے رویے نے حالات کو بہت مشکل بنا دیا(۷۶)۔ مولانا آزاد کی قیادت میں کانگریس کی طرف سے جو معاہدہ والا نقطۂ نظر اپنایا گیا تھا اس کے متعلق مسٹر کرپس نے خود مولانا آزاد سے کہا تھا کہ تبادلۂ خیال کے دوران کانگریس کی جانب سے سمجھوتے کے جذبے کو انہوں نے محسوس کیا ہے(۷۷)۔

راست کارروائی اور پُرتشدد ہنگامے

۱۶ر جون ۱۹۴۶ء کے منصوبے میں یہ لکھا گیا تھا کہ اگر کوئی جماعت اس منصوبے کو نامنظور کردے گی تو بھی وائسرائے عبوری حکومت بنانے کی کوشش کو جاری رکھیں گے اور ایسی جماعتوں کے نمائندوں کی عبوری حکومت بنائیں گے جنہوں نے ۱۶ر مئی ۱۹۴۶ء کے منصوبے کو منظور کرلیا ہو(۷۸)۔ کانگریس و لیگ دونوں نے ۱۶رمئی کا منصوبہ منظور کرلیا اس لیے وائسرائے نے مذکورہ ہدایت کے مطابق لیگ اور کانگریس کے نمائندوں کو لے کر حکومت بنانے کی خواہش ظاہر کی۔ مسلم لیگ والے اس امید پر بیٹھے تھے کہ کانگریس کے ذریعہ ۱۶ر جون ۱۹۴۶ء کا منصوبہ نامنظور کردینے پر عبوری حکومت میں لیگ کی سربراہی رہے گی اور اس طرح لیگ کے ہاتھوں میں اختیارات آجائیں گے(۷۹)۔ لیگ نے فی الوقت اس منصوبے پر کوئی فیصلہ نہیں لیا تھا بلکہ وہ کانگریس کے فیصلے کا انتظار کررہی تھی۔ کانگریس کے ۱۶ر جون ۱۹۴۶ء کے منصوبے کی نامنظوری کے بعد لیگ نے اس منصوبے کو منظور کرنے کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس کے بعد بھی وائسرائے اور کیبنٹ مشن کے ذریعہ لیگ و کانگریس کے نمائندوں کے ساتھ سرکار بنانے کا اعلان کرنے پر لیگ مشتعل ہو اُٹھی اور اس نے ۱۶ر مئی ۱۹۴۶ء کے منصوبے کے مطابق دستور ساز کمیٹی کے انتخاب کے بعد ۲۹ر جولائی ۱۹۴۶ء کو اپنی پارٹی کی بیٹھک بلاکر ۱۶ر مئی و ۱۶ر جون ۱۹۴۶ء کے منصوبوں کو نامنظور کرنے کا اعلان کردیا اور پاکستان کی مانگ دہراتے ہوئے اس کے قیام کے لیے سیدھی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا(۸۰)۔ لیگ کو مسلمانوں کا واحد نمائندہ اور سرکار میں مسلم نمائندے کی تقرری کی اجارہ داری منظور نہ ہونے کی وجہ کر ہی لیگ نے انہیں نامنظور کر دیا(۸۱)۔

۲۹ر جولائی ۱۹۴۶ء کو مسٹر جناح نے بمبئی میں لیگ کی ایک میٹنگ میں اس نااُمیدی کو ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اب سمجھوتے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے(۸۲)۔

شمال مغرب سرحدی صوبے کے لیگی لیڈر عبدالرب نشتر (بعد میں عبوری حکومت میں لیگی وزیر) نے کہا تھا کہ ''پاکستان خون بہا کر ہی لیا جاسکتا ہے۔ اگر موقع آیا تو غیرمسلموں کا خون بہانا ہی پڑے گا کیوں کہ مسلمان اہنسا کو نہیں مانتے''(۸۳)۔ لیگ نے

اپنی نئی پالیسی کو مشتہر کرنے کے لیے ۱۶ر اگست ۱۹۴۶ء کا دن مقرر کیا تھا۔ لیونارڈ موسلے نے لکھا ہے کہ ہاوڑہ کے کچھ چنے ہوئے غنڈوں کو اپنے ساتھ باڈی گارڈ کی حیثیت سے رکھنے والے — باہر سے ملنسار اور اندر سے شاطر سیاستداں، بنگال کے وزیراعظم حسن شہید سہروردی کے لیے راست کارروائی سنہرا موقع بن کر سامنے آئی، تاکہ وہ بنگال کے مسلمانوں پر اپنے اثرات اور پاکستان کی حمایت کا مظاہرہ کرسکیں(۸۴)۔ مسٹر سہروردی چاہتے تھے کہ بنگال میں خون خرابہ کے مظاہرے سے پیدا شدہ خوف و دہشت کا استعمال کرکے، حصول پاکستان کے لیے مسلمانوں کی پُرتشدد لڑائی کی تیاری کی جھلک دکھا کر پاکستان کی مانگ کو منظور کرانے کے لیے نفسیاتی اثر ڈالا جائے۔ اس کے لیے وہ منظم طریقے سے کام کرتے رہے تھے۔ سیدھی کارروائی کی تاریخ کا اعلان ہونے کے بعد ۵ر اگست کو انہوں نے ''اسٹیٹس مین'' میں ''شہید'' کے قلمی نام سے لکھا تھا کہ خون خرابہ اور بے سکونی اپنے آپ میں کوئی بری بات نہیں اگر کسی اچھے کام کے لیے اس کا استعمال کیا جائے، آج مسلمانوں کے لیے پاکستان سے بڑا اور اچھا اور کچھ نہیں(۸۵)۔ ۱۰ر اگست کو انہوں نے دلّی کی اپنی ایک تقریر میں دھمکی دی کہ اگر مرکز میں کانگریس صرف اپنی عارضی حکومت بناتی ہے تو وہ (سہروردی) بنگال کی آزادی کا اعلان کریں گے اور ایسی مرکزی سرکار کو کوئی ٹیکس بنگال سے حاصل نہیں ہوگا(۸۶)۔ دلی کی سیاسی گفتگو میں الجھی ہوئی کانگریس جب وائسرائے کے ساتھ عبوری حکومت کی تشکیل میں لگی ہوئی تھی تبھی لیگ نے ۱۶ر اگست ۱۹۴۶ء کے دن سارے ملک میں حصول پاکستان کے لیے ہڑتال کرنے اور جلسے منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ بنگال میں لیگی کابینہ کام کررہی تھی۔ یہاں سرکار نے اس دن عوامی تعطیل کا اعلان کردیا۔ دیگر مسلم اکثریتی صوبوں میں سیدھی کارروائی اتنی مؤثر نہ ہوئی کیوں کہ سندھ میں سرکار کے چیف سکریٹری نے ۱۶ر اگست کو سرکاری چھٹی نہیں دی تھی اور پنجاب کے گورنر سر ایوان جینکنس کا اچھا اثر تھا نیز سرکار مستحکم تھی(۸۷)۔ اس طرح سرکاری اختیارات کا بیجا استعمال کرکے جبراً ہڑتال کے لیے عوامی تعطیل کا اعلان کرکے لوگوں کو سیدھی کارروائی کے لیے سرکاری دفاتر اور دوکانوں کے کام سے آزاد کردیا گیا۔ قانون ساز اسمبلی کے ہندو اراکین نے اس کی مخالفت کی کہ سیاسی ہڑتال میں ان کی کوئی دلچسپی نہیں تو ووٹ سے ان کی مخالفت کچل دی گئی(۸۸)۔

برٹش بھارت میں انگریزوں کی سیاست کا بنیادی اصول ''تفریق ڈالو اور حکومت

کرزن' نے ۱۹۰۵ء کے تقسیم بنگال میں جو کردار نبھایا تھا اس کی جڑ مزید گہری ہوتی چلی گئی تھی۔ ہندوستان میں متعدد ایسے موقعوں پر جب سیاسی تحریک کسی فیصلہ کن مرحلے میں پہنچنے کے قریب ہوتی تھی تو فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ سدا ہی ان کو متاثر ہونا پڑتا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے برابر ٹوٹتے رہنے سے کچھ نئے مسائل پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ اس مرتبہ ۱۹۴۶ء میں جو لیگ کی سیدھی کارروائی کا منصوبہ بنا تھا اس کے تحت بھی فرقہ وارانہ منافرت کی آگ کام کر رہی تھی۔ اسے عمل میں لانے کے لیے لیگ کو عبوری حکومت کے تنازعہ کا ایک بہانہ مل گیا تھا۔ پنڈت نہرو نے ۶؍جولائی کو ایک بیان میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ہم فی الحال دستور ساز اسمبلی میں شامل ہیں(۸۹)۔ اس بیان کو کانگریس کی من مانی بتا کر لیگ نے قیام پاکستان کے لیے سیدھی کارروائی پر عمل درآمد کرنے کا اعلان کر دیا۔ لیگ کی ''سیدھی کارروائی'' سے متعلق تجویز میں یہ کہا گیا تھا کہ مسلم لیگ کو پورا یقین ہو گیا ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ حصول پاکستان کے لیے اسے براہِ راست کارروائی پر انحصار کرنا ہوگا اور اپنے حقوق و اختیارات کے راستوں کا تعین کرنا ہوگا نیز اپنے وقار کو قائم رکھنا ہوگا۔ انگریزوں کی موجودہ غلامی اور اعلیٰ ذات ہندوؤں کے مبینہ غلبے سے چھٹکارا پانا ہوگا۔

یہ کاؤنسل مسلم طبقے سے گزارش کرتی ہے کہ وہ اپنی واحد نمائندہ تنظیم کے سایۂ عاطفت میں یکجا ہو کر مضبوط ہو جائیں اور ہر ممکن قربانی دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہ کاؤنسل ورکنگ کمیٹی کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ مذکورہ پالیسی کو عملی شکل دینے کے لیے فوراً براہِ راست کارروائی کا ایک پروگرام تیار کرے اور مسلمانوں کو اس آنے والے جد و جہد کے لیے منظم کرے جو ضرورت پڑنے پر شروع کی جائے گی۔ انگریزوں کے رُخ کی مخالفت نیز ان کے تئیں غم و غصے کی شکل میں یہ کاؤنسل مسلمانوں سے گزارش کرتی ہے کہ وہ غیر ملکی سرکار کے ذریعہ عطا کردہ خطابات کو فوراً ترک کر دیں(۹۰)۔ مسلمانوں میں اشتعال انگیز تحریروں کے ذریعہ سے مشتہر کیا جا رہا تھا کہ انگریزوں کی جگہ پر غیر مسلم ہندوستانیوں کا اقتدار قائم نہ ہونے دیں۔ ان کے لیے حرام ہے کہ وہ اس طرح کے عمل کو خاموشی سے بیٹھے ہوئے دیکھتے رہیں(۹۱)۔

لیگ کی سیدھی کارروائی کا مطلب تھا، پاکستان کے قیام کو کوئی واضح سیاسی حمایت نہ مل پانے پر، دوسرے لفظوں میں مسٹر جناح کی کوشش ناکام رہنے پر طاقت کے بل پر

پُرتشدد طریقے سے عوام کو ستا کر سرکار کو دہشت زدہ کرنا اور جس حصے کو لیگ والے پاکستان میں شامل کرنا چاہتے تھے اس پر جبراً قبضہ کر کے وہاں پاکستان کے قیام کا اعلان کرنا۔ اس مقصد کے لیے لیگ میں اعلیٰ سطح پر تبادلۂ خیال ہوا اور پنجاب، جو لیگ کے پاکستان منصوبے کا خاص زمینی حصہ تھا، وہاں لیگی کارکنان میں کلکتہ سے ایک مفصل پروگرام چھاپ کر اور سائیکلو اسٹائل ٹائپ میں طبع کر کے خفیہ طور پر تقسیم کیا گیا(۹۲)۔ لیگ کی اس طرح کی ہدایتوں کے ذریعے سارے ملک میں ایک زبردست ہندو مخالف پُرتشدد جذبات کو مشتعل کیا گیا تھا۔ اس اشتعال کی مجسم اور عملی شکل کلکتہ کے فسادات کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی۔ ۱۶؍اگست کی صبح کلکتہ میں تشدد کا ننگا ناچ شروع ہو گیا۔ ہاوڑا سے آئی ہوئی ایک مسلح بھیڑ نے غیر مسلموں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ دو پہر تک بہت ہی خوفناک شکل اختیار کر گیا۔ اسی دن سہ پہر کو ایک عام جلسے میں تقریر کرتے ہوئے بنگال کے لیگی لیڈر اور وزیر اعظم حسن شہید سہروردی نے کلکتہ میدان میں مجتمع سامعین کو ان کی تعداد، ان کے حوصلے اور قیام پاکستان کی کوششوں کے لیے مبارکباد دیا۔ اس وقت بھی جلسہ گاہ سے کچھ دور پر لوٹ، مار، قتل اور آگ زنی ہو رہی تھی لیکن جناب سہروردی اور ان کی محافظ فوج کو یہ سب دکھائی نہیں دیا(۹۳)۔ کلکتہ کی سیدھی کارروائی کے پہلے حملے کے بعد کلکتہ کی غیر مسلم آبادی نے بھی خود کو منظم کر کے اتنے ہی زوروں کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کر دیا(۹۴)۔ کلکتہ کے واقعات کے ردِعمل میں بنگال کے دیگر مقامات پر بھی فرقہ وارانہ تناؤ سر اٹھانے لگے اور کلکتہ کا بدلہ لینے کی آواز اٹھائی جانے لگی۔ ۲؍ستمبر ۱۹۴۶ء کو نواکھالی کے شاہ پور گاؤں میں میاں غلام سرور (سابق لیگی رکن اسمبلی) نے ڈھول بجا کر اعلان کرایا کہ کلکتہ کے خوفناک سانحۂ قتل کا بدلہ لینے کی تدبیر سوچنے کے لیے علماء اور مسلم لیگ کا مشترکہ جلسہ ہوگا۔ ۷؍ستمبر کو یہ جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسے میں اور ۸؍ستمبر کو دس گھریا گاؤں میں نیز دیگر مقامات پر اشتعال انگیزی کی گئی۔ فسادیوں نے افواہ پھیلانا شروع کر دیا کہ ہفتے بھر تک مسلمان ہندوؤں کے جان و مال کے ساتھ جو چاہیں کر سکتے ہیں، حکومت اس میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ اس کے بعد ۱۰؍اکتوبر کو لکشمی پوجا کے دن کرپارا میں فساد شروع ہو گیا(۹۵)۔ نواکھالی کے ہندوؤں پر خوفناک مظالم ڈھائے گئے، ہندوؤں کے بازاروں میں آگ لگائی گئی نیز مسلمانوں نے انھیں ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا۔

افواہوں کا بازار گرم تھا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے گھروں پر حملے کرنے شروع کر دیے، لوگوں سے لیگ کی مدد کے لیے بڑی بڑی رقمیں وصول کی گئیں اور رقمیں لے کر انھیں قتل کر دیا گیا۔ پڑوس کے مسلم گھروں میں پناہ لینے والی ہندو عورتوں کو اس گھر کی مسلم عورتوں نے مجبور کیا کہ وہ اپنے سہاگ کی علامت ختم کر دیں۔ ہندوؤں کو نماز پڑھنے اور داڑھی رکھنے پر مجبور کیا گیا نیز انھیں نماز پڑھانے کے لیے مولوی مقرر کیے گئے (۹۶)۔

مولانا آزاد نے نواکھالی میں ہندوؤں پر ڈھائے گئے مظالم کی مذمت کی تھی اور انھیں غیر اسلامی بتایا تھا (۹۷)۔ لیگی مسلمان ان تشدد آمیز حرکات پر خوش ہوتے تھے اور اپنے نکتہ چینوں کی مذمت کرتے تھے۔ مولانا کے ذریعہ ان افعال کو غیر اسلامی بتانے پر بہار مسلم لیگ کے سکریٹری نے مولانا آزاد کی مذمت کی تھی (۹۸)۔ نواکھالی کے بعد بہار میں فسادات پھوٹ پڑے۔ ہندوؤں کی لکشمی دیوی کی مورتی کے جلوس کو روکنے کی کوشش کی گئی اور مخالفت کرنے پر بھاگلپور، چھپرا اور مونگیر میں ہنگامہ شروع ہو گیا (۹۹)۔ پٹنہ میں بہار کے ضلعوں کے لیگی صدور اور وزراء کی ایک بیٹھک میں سیدھی کارروائی کے پروگرام پر عمل کرنے کا فیصلہ لیا گیا اور قائد اعظم جناح کے تحفظ ناموس کا حلف لیا گیا۔ بہار میں تشدد آمیز کارروائی کے لیے اسلحہ جات کا انتظام کرنے میں لیگی لیجیسلیچر بھی حصہ لے رہے تھے (۱۰۰)۔

سرکار نے کلکتے سے محض ڈیڑھ گھنٹے کے ہوائی سفر کی دوری پر ہوتے ہوئے بھی نواکھالی میں کوئی مدد نہیں پہنچائی۔ ڈاک و تار پر لیگ کا قبضہ تھا، پولس انچارج مسلمان تھا، سرکار نے فسادیوں کا پورا پورا ساتھ دیا (۱۰۱)۔ کلکتہ میں بھی ۱۶/ اگست سے شروع ہوئے فسادات چار دنوں تک چلتے رہے تھے۔ چار دن بعد ان کے روک تھام کی کوشش کی گئی تھی (۱۰۲)۔ اس پر مولانا آزاد نے بنگال کی سرکار خاص کر اس کے وزیر اعظم حسن شہید سہروردی کی سخت تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''گرچہ بنگال کی سرکار نے پریشانی پر غور کیا، لیکن انھوں نے پوری ہوشیاری نہیں برتی۔ فوج طلب کرنے، دفعہ ۱۴۴ نافذ کرنے اور مکمل کرفیو لگانے میں انھوں نے بہت دیر کر دی''۔ مولانا آزاد نے ۱۶/ اگست کے عام تعطیل کی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ ۱۶/ اگست کی عام تعطیل کا اعلان کیے جانے سے کلکتہ کے فسادیوں نے یہ باور کر لیا کہ سرکار نے انھیں اپنی خواہش کے مطابق کام کرنے کے لیے لائسنس دے دیا ہے (۱۰۳)۔ اس طرح مولانا آزاد نے اپنا یہ خیال ظاہر کر دیا کہ وہ اس

طرح کے خون خرابے کو کسی بھی حالت میں جائز نہیں سمجھتے تھے اور ان کی نظر میں بنگال کی بے رحمانہ و سنگدلانہ قتل و غارت گری کے لیے لیگی سرکار ذمہ دار تھی۔

مشترکہ عبوری حکومت

۱۹۴۶ میں جو مشترکہ عبوری مرکزی حکومت بنانے کی کوششیں چل رہی تھیں وہ ایک مرتبہ ناکام ہو چکی تھیں۔ ان کوششوں میں کانگریس کو سرکار بنانے کا موقع دے کر نئی سرکار کی تشکیل کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ اس میں پنڈت جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرساد، آصف علی، شری راج گوپال آچاریہ، شرت چندر بوس، ڈاکٹر جان متھائی، سردار بلدیو سنگھ، سر شفاعت احمد، شری جگجیون رام، سید علی ظہیر اور کنور جی ہرمز جی بھابھا کو وزیر بنایا گیا تھا۔ دو مسلمانوں کی جگہ خالی تھی (۱۰۴)۔

سرکار کی تشکیل میں مسلم ممبران کی تقرری کے لیے مولانا آزاد کی رائے کانگریس میں سب سے مقدم مانی جاتی تھی جیسا کہ کراچی کے مسٹر نچھل داس کے ذریعہ ایک غیر لیگی مسلمان کو عبوری حکومت میں لینے کی سفارش کیے جانے پر سردار پٹیل نے انھیں ایک خط میں واضح طور پر لکھا تھا کہ اس معاملے میں ہمیں مولانا صاحب کے ذریعہ ہی ہدایت حاصل کرنی ہے، میں اس میں کچھ نہیں کر سکتا (۱۰۵)۔

مولانا آزاد حکومت میں قوم پرست مسلمانوں کو مکمل نمائندگی دلانے کے لیے کوشاں تھے۔ ادھر لیگ کے سربراہ مسٹر جناح کے ذریعہ طلب کردہ ۱۶/ اگست کی سیدھی کارروائی کو عملی شکل دینے کی وجہ سے ملکی سیاست میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ نواکھالی کے فسادات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور یہ لگتا تھا کہ مسٹر محمد علی جناح کی یہ بات صحیح ہے کہ بغیر تقسیم ملک کے آزاد ہونے پر ہندو مسلمان پُر امن طور پر نہیں رہ سکیں گے اور خانہ جنگی چھڑ جائے گی (۱۰۶)۔ فسادات کی وجہ کر عبوری حکومت میں مسلم لیگ کے شامل ہو جانے کے بعد بھی کانگریس و لیگ کے تعلقات سدھر نہیں سکے بلکہ مزید بگڑ گئے۔ یہ تعلقات اتنے کشیدہ ہو چکے تھے کہ دونوں کی ملی جلی سرکار کا چلنا ناممکن ہو گیا تھا۔ سماجی طور سے فرقہ وارانہ اخوت پر بھی ان فسادات کا مہلک اثر پڑا تھا۔ اس وجہ سے آگے چل کر حصول آزادی کے وقت بھی پنجاب اور بنگال میں فرقہ وارانہ منافرت کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ فسادات

نے مسٹر جناح کے دوقومی نظریے کو زبردست قوت بہم پہنچائی تھی، جس کی وجہ کر ہندوستان کے دوحصوں میں منقسم ہونے کو روکا نہیں جاسکتا تھا۔

تشدد آمیز فسادات سے لیگ و کانگریس دونوں کو سوچنے کے لیے ایک نئی سطح مل گئی تھی۔ اس میں کانگریس جو سرکار بنا کر ایک اطمینان بخش ماحول بنانا چاہتی تھی اس کا نقطۂ نظر پہلے سے ہی تعمیری تھا۔ جیسا کہ صدر کانگریس مولانا آزاد نے ایسوسی ایٹیڈ پریس کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے یہ سوال پوچھے جانے پر کہ اگر مسلم لیگ اپنی طرف سے نام نہ پیش کرے تو کیا وزارت مرتب کی جائے گی؟ اس کے جواب میں کہا تھا کہ اس کا فیصلہ وائسرائے کا کام ہے۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے اس نے انتہائی حد تک ثابت کر دیا ہے کہ اس کا نقطۂ نظر تعمیری ہے(۱۰۷)۔ مولانا آزاد خود چاہتے تھے کہ لیگ کانگریس کے ساتھ عبوری حکومت میں شامل ہو۔ دوسری طرف لیگ ہمیشہ غیر فیصلہ کن حالت میں دکھائی دیتی تھی۔ اس کا نقطۂ نظر تعمیری کی جگہ پر تخریبی رجحانات سے تحریک پاتا تھا(۱۰۸)۔ وائسرائے کے ذریعہ عبوری حکومت میں لیگ کے شامل نہ ہونے کے فیصلے کے بعد کانگریس سرکار کے ممبران کے ناموں کے ۲۵/اگست ۱۹۴۶ء کے اعلان پر مسٹر جناح نے اپنا ردِّعمل ظاہر کرتے ہوئے ۲۷/اگست ۱۹۴۶ء کو ایک بیان میں کہا تھا کہ انہوں نے مسلم لیگ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو گہری چوٹ پہنچائی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ہندوستانی مسلمان اس چوٹ کو صبر اور ہمت کے ساتھ برداشت کرلیں گے اور اپنی ناکامیوں سے سبق لیں گے، تاکہ ہم عبوری حکومت اور قانون ساز کاؤنسل میں اپنا پُروقار اور پُرعدل مقام حاصل کر سکیں۔ مسٹر جناح نے وائسرائے کو خبردار کرتے ہوئے دھمکی بھرے الفاظ میں کہا تھا کہ انہوں نے جو قدم اٹھایا ہے وہ بہت ہی بیوقوفانہ اور ناعاقبت اندیشانہ ہے اور اس کے نتائج نہایت سنگین وخطرناک ثابت ہو سکتے ہیں اور انہوں نے تین مسلمانوں کو نامزد کر کے زخم پر نمک چھڑکا ہے(۱۰۹)۔

مسٹر جناح کے مذکورہ بیان کے بعد بھی عبوری حکومت کے سربراہ پنڈت جواہر لال نہرو نے حکومت سازی کے پانچ دن بعد ایک ریڈیو نشریہ میں لیگ کو سرکار میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ قانون ساز کاؤنسل میں ہم اس ارادے سے جائیں گے کہ ہم متنازع فیہ معاملات میں بھی کوئی نقطۂ اتصال تلاش کرسکیں اور اس لیے جو کچھ ہوا ہے

اور جو سخت الفاظ کہے گئے ہیں ان کے باوجود آپسی تعاون اور افہام وتفہیم کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ہم انہیں بھی جنہیں ہم سے اختلاف رائے ہے، دعوت دیتے ہیں کہ ہمارے برابر کے ساتھی بن کر قانون ساز کاؤنسل میں آئیں۔ وہ کسی بھی طرح اپنے کو بندھا ہوا نہ سمجھیں۔ ہو سکتا ہے کہ جب ہم مل کر یکساں کاموں میں جٹے ہوں موجودہ اڑچنیں دور ہو جائیں(۱۱۰)۔ لیگ کو عبوری حکومت میں شامل کرنے کے سوال پر راضی کرنے کے لیے نواب بھوپال نے یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء کو گاندھی جی سے بات چیت شروع کی تھی(۱۱۱)۔ لیکن یہ بے معنی ثابت ہوئی۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اکتوبر ۱۹۴۵ء میں لیگ اور کانگریس کی گفتگو پھر شروع ہوئی۔ ۵/اکتوبر ۱۹۴۶ء کو پنڈت نہرو اور مسٹر جناح نے نواب بھوپال کے مکان پر آپس میں بات چیت کی۔

اس بات چیت میں مسٹر جناح نے لیگ کے حکومت میں شمولیت کی بنیادی شرطوں کے طور پر پنڈت نہرو کے سامنے کچھ مطالبے پیش کیے(۱۱۲)۔

(۱) انتظامی کاؤنسل میں ۳-۵-۶ کے مطابق ۱۴/ممبران ہوں گے۔ کانگریس کو قوم پرست مسلم نمائندے کی تقرری کا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔

(۲) حکومت میں کوئی جگہ خالی ہونے پر وائسرائے اسے پُر کرنے میں دونوں جماعتوں کی رائے لیں۔

(۳) فرقہ وارانہ مسائل کے سلسلے میں کاؤنسل کے سبھی فیصلوں پر لیگ کو ویٹو کا اختیار دیا جائے۔

(۴) کابینہ کے نائب صدر ہونے کا اختیار کانگریس اور لیگ کو باری باری سے دیا جائے۔ (وائسرائے اس کے صدر اور پنڈت نہرو نائب صدر تھے)

(۵) خاص خاص محکموں کا برابر برابر بٹوارہ ہو۔

(۶) ان میں دونوں جماعتوں کی منظوری کے بغیر کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔

(۷) کابینہ میں اختلاف رائے ہونے پر اس کے فیصلے فیڈرل کورٹ کے ذریعہ ہوں گے(۱۱۳)۔

۵/اکتوبر ۱۹۴۶ء اور ۷/اکتوبر ۱۹۴۶ء کو پنڈت نہرو اور محمد علی جناح کے درمیان دوستانہ ماحول میں مفصل گفتگو ہوئی(۱۱۴)۔ دوران گفتگو مسٹر جناح نے اس بات پر زور دیا

که مہاتما گاندھی اور جناح کے بیچ طے ہوا فارمولا ہی اس گفتگو کی بنیاد تھی (۱۱۵)۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک آپ اس شکل میں اسے نہ مانیں گے تب تک ہم کچھ بھی آگے نہیں بڑھیں گے (۱۱۶)۔ آخر کار نہرو ۔ جناح گفتگو ناکام ہوگئی۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۴۶ء کو مسٹر جناح نے وائسرائے کو ایک خط لکھ کر مسلمان اور دیگر فرقوں کی بھلائی کے لیے مرکزی سرکار و حکومت کا سارا دارومدار کانگریس پر نہ چھوڑنے کی غرض سے مجلس عاملہ میں پانچ لیگی ممبروں کو بھیجنا منظور کر لیا (۱۱۷)۔ لیگ کے سرکار میں شامل ہوتے وقت یہ یقین کیا جاتا تھا کہ وہ مشن کے منصوبے کے مطابق قانون ساز کاؤنسل میں بھی شامل ہو جائے گی، لیکن ایسا نہیں ہوا اور لیگ نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ پاکستان اور دو قانون ساز کاؤنسلوں کے اپنے مطالبے پر قائم ہے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے برطانوی وزیر اعظم مسٹر ایٹلی نے پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر جناح اور عبوری حکومت میں سکھ نمائندے مسٹر بلدیو سنگھ کو گفتگو کے لیے لندن طلب کیا، لیکن لندن جا کر بھی مسئلے کا کوئی حل نہیں نکل سکا (۱۱۸)۔ سرکار میں شامل ہو کر بھی لیگ نے اپنی مانگوں کو چھوڑنا منظور نہیں کیا اور ان پر ڈٹی رہی۔ مسٹر کرپلانی کے مطابق اس کا مطلب تھا کہ لیگ سرکار میں شامل بھی ہے اور سرکار کی مخالفت بھی کر رہی ہے۔ اس سے سرکار کے کاموں میں کئی طرح کی مشکلیں پیدا ہوگئیں۔ سرکار میں کوئی اتحاد یا مشترکہ جوابدہی نہیں تھی (۱۱۹)۔ لیگی وزراء کو معاشیات، تجارت، ڈاک اور فضائی خدمات، صحت اور انتظامی امور کے محکمے دیے گئے تھے (۱۲۰)۔ کانگریسی ممبروں میں سردار پٹیل کو وزیر داخلہ کا عہدہ دیا گیا تھا۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ لارڈ ویول کا مشورہ تھا کہ لیگ کے لیے ہم لوگ محکمہ امور داخلہ چھوڑ دیں مگر سردار پٹیل نے جو اس وقت وزیر داخلہ تھے، اس کی سخت مخالفت کی۔ میری رائے تھی کہ قانون اور نظم ونسق کا مسئلہ ایسا ہے جو کہ بنیادی طور پر صوبوں کے دائرے میں آتا ہے۔ کیبنٹ مشن کے منصوبے میں جس تصویر کا تصور کیا گیا تھا اس کے مطابق اس حلقے میں مرکز کا دخل بہت کم رہنا تھا۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ مرکزی ڈھانچے میں وزارت داخلہ کی بہت زیادہ اہمیت نہیں رہے گی اس لیے میں لارڈ ویول کا مشورہ مان لینے کے حق میں تھا، لیکن سردار پٹیل اپنی ضد پر اڑے رہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ لوگ ضد کریں گے تو میں کیبنٹ چھوڑ دوں گا لیکن محکمۂ امور داخلہ نہیں چھوڑوں گا (۱۲۱)۔ وزارت مالیات کا عہدہ لیاقت علی خاں سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ کو

حاصل ہوا تھا جنہوں نے اس عہدے کے اختیارات کا غلط استعمال کانگریس کے مفادات پر شدید ضرب لگانے میں کیا۔ لیونارڈ موسلے کے مطابق چودھری محمد علی خاں، جو بعد میں پاکستان کے وزیر اعظم بنے، کی صلاح پر لیاقت علی نے ایسا بجٹ بنایا، جس سے کانگریس کی مدد کرنے والے کروڑ پتیوں کا دم نکل جائے۔ ... اور ہوا اس سے بھی زیادہ، نہرو اور پٹیل غصے سے چیخ اٹھے (۱۲۲)۔ مولانا آزاد نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کانگریس کی اعلان شدہ پالیسی تھی کہ اقتصادی نابرابری دور ہونی چاہیے اور آہستہ آہستہ سرمایہ داری کی جگہ سماج میں اشتراکیت کے نظریے کا احترام ہونا چاہیے۔ کانگریس کے انتخابی اعلان نامے (مینی فیسٹو) میں بھی یہ نقطۂ نظر واضح ہوا تھا۔ اس کے علاوہ تاجروں اور صنعت کاروں نے جنگ کے زمانے میں جو غیر ضروری منافعے کمائے تھے، ان کے بارے میں جواہر لال نہرو اور میں دونوں ہی بیان دے چکے تھے۔ سبھی جانتے تھے کہ اس آمدنی کا بہت سارا حصہ غائب ہوگیا تھا اور انکم ٹیکس سے بچا لیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا تھا کہ سرکار بہت بڑے ذرائع سے محروم کر دی گئی تھی اور ہم سوچتے تھے کہ قاعدے سے جو ٹیکس سرکار کو ملنے چاہئیں اور جن کی ادائیگی نہیں کی گئی ان کی وصولی کے لیے حکومت ہند کو کڑی وصولی کرنی چاہیے۔

لیاقت علی خاں نے ایسا بجٹ تیار کیا تھا جو ظاہری طور پر تو کانگریس کے اعلان ناموں پر منحصر تھا مگر دراصل اس میں بڑی چالاکی سے کانگریس کے نام پر کلنک لگانے کی کوشش کی گئی تھی۔ انہوں نے کیا یہ کہ کانگریس کے ان دونوں مطالبوں کو ایسی شکل دے دی کہ وہ ایک دم ناقابل عمل بن جائیں۔ انہوں نے ٹیکس لگانے کے ایسے طریقے تجویز کیے کہ جن سے سرمایہ دار طبقے کی کمر ٹوٹ جاتی اور کامرس وصنعت کو مستقل طور پر نقصان پہنچتا (۱۲۳)۔

اس طرح لیگ کے رویے کی وجہ کر سرکار کے ممبروں میں آپسی اتفاق رائے و موافقت ومطابقت کی کمی سے حکومت کا چلنا ناممکن ہوگیا۔ مولانا آزاد کے مطابق اسی سے وہ تعطل پیدا ہوا، جس سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو آہستہ آہستہ تقسیم ہند کی راہ ہموار کرنے کا موقع ملا (۱۲۴)۔

خلاصہ

۱۹۴۲ء سے بعد کے دور جدوجہد میں ۱۵/ جون ۱۹۴۵ء کو بانکوڑا جیل سے رہا ہونے کے بعد مولانا آزاد اپنی سیاسی زندگی کے سب سے اہم اور مشکل دور میں داخل ہوتے ہیں۔ اسی دور میں ہندوستان کی آزادی کا عزم اپنے وجود میں آتا ہے اور لارڈ ویول اور برٹش کیبنٹ مشن کے توسط سے کانگریس و مسلم لیگ کے ساتھ ہندوستانی سیاست کے مسائل کا حل ڈھونڈنے کی نئی شروعات ہوتی ہے۔ کیبنٹ مشن ہندوستان کے لیے عبوری حکومت کے نظام کا جو فارمولا سامنے رکھتا ہے اسے کانگریس کے ذریعہ منظور کیے جانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ہاتھ نیز اہم مقام ہے۔ سردار پٹیل کی طرح مولانا آزاد بھی کیبنٹ مشن منصوبے کو ہندوستانی مسائل کا ایک اچھا حل مانتے تھے(۱۲۵)۔ ان کی نظر میں اقلیتوں اور اکثریتوں دونوں کے لیے یہ ایک صحیح نظام تھا۔ لیکن یہ ان کا واضح نظریہ تھا کہ کسی بھی منصوبے سے ہندوستان کے مختلف حصوں کو جوڑنے والی رابطے کی زنجیر کسی طور پر ٹوٹنی نہیں چاہیے۔ مسٹر کرپس نے جب بات چیت کے دوران ان سے پوچھا کہ اگر پنجاب، شمال مغربی صوبۂ سرحد اور سندھ وفاق ہند سے باہر رہنا پسند کریں اور ان کے کئی موضوعات مرکز کے مساوی ہوں تب کانگریس ان کے تئیں کیا پالیسی اپنائے گی(۱۲۶)۔ مولانا آزاد نے مسٹر کرپس کو جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے، جس پر آگے غور کیا جاسکتا ہے، لیکن اس معاملے پر یہ خیال ذہن میں رکھ کر غور کیا جائے گا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں کے درمیان کی لازمی زنجیر رابطہ کو کسی بھی حالت میں نقصان نہیں پہنچنا چاہیے(۱۲۷)۔ وہ لیگ اور کانگریس کی برابری کو بھی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے مسٹر کرپس کے سامنے مرکزی انتظامیہ کاؤنسل کے جو خد و خال پیش کیے تھے اس میں صوبوں کے ذریعہ انتظامی کاؤنسل کے اراکین چنے جانے کا نظم کیا گیا تھا اور اس کے مطابق کانگریس کو ۸ اور لیگ کو ۲ یا ۳ سیٹیں حاصل ہوسکتی تھیں۔ مسٹر کرپس کے ذریعہ اس سلسلے میں لیگ کو برابری دیے جانے کا سوال اٹھائے جانے پر مولانا آزاد نے صاف صاف کہا تھا کہ ان کے منصوبے میں مسلمانوں کو صرف دو یا تین سے زیادہ سیٹیں حاصل نہیں ہوسکتی ہیں۔ گرچہ زیادہ سیٹیں دینے کے نظم کیے جاسکتے ہیں لیکن کانگریس کے ذریعہ لیگ کے ساتھ

برابری کو تسلیم کر لینے میں انہیں (آزاد کو) شبہ ہے(۱۲۸)۔ آگے چل کر صرف ہندو مسلم ممبروں کی عبوری حکومت میں برابری کے سوال پر ہی لیگ کی ہٹ دھرمی سے شملہ کانفرنس ناکام ہوگئی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کانگریس کی بنیادی طرز فکر اور اصولوں کو چھوڑ کر یا انہیں نقصان پہنچا کر کوئی سمجھوتہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن کیبنٹ مشن منصوبے کے اس نظام کو جس کے مطابق صوبوں کو تین حصوں میں اس طرح بانٹا گیا تھا کہ لیگ کے ذریعہ مانگے گئے نام نہاد پاکستان والے صوبے کو دو حصوں میں اور بقیہ ہندوستان ایک حصے میں رکھا گیا تھا تاکہ تقسیم کے موافقین و مخالفین سبھوں کو مطمئن کیا جاسکے، مولانا آزاد نے منظور کر لیا تھا۔ مولانا اس میں مسلمانوں اور ہندوؤں، دونوں کا فائدہ سمجھتے تھے اور جو منصوبہ کیبنٹ مشن نے پیش کیا تھا وہی مولانا کا اپنا نظریہ بھی تھا۔ اس لیے انہوں نے لیگ و کانگریس کے ذریعہ اس کے منظور کیے جانے پر اپنا ردعمل اپنی کتاب ''آزاد کی کہانی'' میں ان الفاظ میں ظاہر کیا ''اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی کا مشکل مسئلہ بات چیت اور آپسی سمجھوتے کے ذریعہ طے کر لیا گیا ہے تشدد اور حریفانہ طریقے استعمال نہیں کیے گئے۔ یہ بھی لگا جیسے آخر کار ہم فرقہ وارانہ دشواریوں کو بھی پیچھے چھوڑ آئے ہیں'' (۱۲۹)۔ مولانا آزاد نے اسے اچھا ماننے کے بعد اپنی کوششوں سے اس کو زندہ رکھنے کی پوری کوشش کی تھی، یہاں تک کہ عبوری حکومت بننے کے بعد جب لیگ کے عدم تعاون اور ضد سے پیدا شدہ دشواریوں کی وجہ کر سرکار چلنی ناممکن ہوگئی اور وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ملک کا بٹوارہ کرنے کے منصوبے پر غور کرنا شروع کیا تو مولانا نے کیبنٹ مشن منصوبے کو زندہ رکھنے کی آخری کوشش کی تھی اور وائسرائے سے مل کر اسی کی بنیاد پر کوئی حل نکالنے کا مشورہ دیا تھا(۱۳۰) لیکن مولانا آزاد کی یہ کوشش ناکام رہی۔

(۹)

تقسیم ہند

(۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۷ء)

سنہ ۱۹۴۶ء کی عبوری حکومت کے عملی تجربہ سے لیگ و کانگریس کی پالیسیوں اور اصولوں کا اختلاف اور فرق واضح ہوگیا تھا۔ سرکار کے کام کرنے کے طور طریقے سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ لیگ و کانگریس ایک ساتھ مل کر کام نہیں کرسکیں گے۔ لیگی رویہ دیکھ کر آگے چل کر ۱۹۴۷ء کے شروعاتی مہینوں میں کانگریس اور عبوری حکومت کے اقلیتی اراکین نے عبوری حکومت سے لیگ کے استعفیٰ کی مانگ بھی کی تھی (۱)۔ لیگ کے ساتھ کانگریس کے تعلقات اور ملک کی سیاسی صورت حال کے مدنظر کانگریس نے کچھ تجاویز پاس کیے۔

کانگریس کی تجاویز

فرقہ وارانہ فسادات کی جو شروعات ۱۶/ اگست ۱۹۴۶ء کے لیگ کی سیدھی کارروائی کے اعلان سے ہوئی تھی اس کے ختم ہونے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ تشدد اور لوٹ کا دور ختم نہیں ہو رہا تھا۔ لیگ کی سیاست دنگوں کی مدد سے کانگریس کو اکھاڑنے کی ہوگئی تھی۔ اس دوران ۵/جنوری ۱۹۴۷ء کو پنڈت جواہر لال نہرو نے کل ہند کانگریس کمیٹی کی بیٹھک میں ایک تجویز رکھی، جو کثرت رائے سے پاس ہوئی۔ اس تجویز کی دفعہ چھ میں کہا گیا تھا کہ یہ صاف ہو جانا چاہیے کہ کسی بھی ریاست پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جائے گا اور پنجاب میں سکھوں کے حقوق کو غصب نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے دباؤ کی حالت میں کسی بھی صوبے یا صوبے کے حصے کو ضرورت پڑنے پر اپنے عوام کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے

اس کے موافق قدم اٹھانے کا اختیار ہوگا (۲)۔ اس تجویز میں پوشیدہ طور سے یہ منظور کرلیا گیا تھا کہ جہاں کے عوام نہ چاہیں اس صوبے یا صوبے کے حصے کو مرکز سے باہر جانے کا فیصلہ کرنے کی آزادی ہوگی۔ اس تجویز سے جیسا کہ ظاہر ہے پنجاب کے مستقبل کے اندیشے کو دور کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ سکھوں کو یہ یقین ہو جائے کہ انہیں لیگ کے بھروسے نہ چھوڑنے کے لیے کانگریس کمربستہ ہے۔ اس تجویز کے تھوڑے دن بعد کانگریس کو نئے قد اٹھانے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ کر ملک میں سیاست و نظم حکومت کی حالت بربادی کی طرف بڑھتی نظر آرہی تھی۔ مارچ، اپریل ۱۹۴۷ء میں بنگال، پنجاب اور سرحدی صوبے میں تشدد کی زبردست وارداتیں ہو رہی تھیں (۳)۔ جائز اور قانونی طریقہ کار کے بدلے کابینہ کی جبراً بیخ کنی کے لیے فرقہ وارانہ فسادات کا سہارا لیا جا رہا تھا۔ اس وقت مارچ کے وسط میں کانگریس مجلس عاملہ نے پنجاب کے دو صوبے بنائے جانے کی تجویز پاس کر دی تاکہ ہندو اکثریتی علاقے کو مخالفین کے مظالم سے محفوظ بنایا جائے (۴)۔ اس تجویز کو تیار کرنے اور مجلس عاملہ میں رکھنے کا کام سردار پٹیل نے کیا تھا اور اس میں سکھوں کو یہ آزادی دی گئی تھی کہ وہ کہاں رہیں گے، اس کا فیصلہ وہ خود کرلیں (۵)۔ تقسیم پنجاب کی اس تجویز کو پاس کرنے میں مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ذریعہ مخالفت کا خوف تھا؛ اس لیے تجویز کے پاس کرنے کے لیے ایسا موقع منتخب کیا گیا تھا جب مہاتما گاندھی بہار کے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کر رہے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد بیمار پڑے ہوئے تھے (۶)۔ تجویز پاس ہونے پر مہاتما گاندھی کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا کہ کیا ہوا بعد میں گاندھی جی کو جب معلوم ہوا اور انہوں نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے نہرو اور پٹیل سے وضاحت طلب کی تھی، تو پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے جو جوابات دیے ان سے دونوں کا نظریہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے گاندھی جی کو لکھا تھا کہ پنجاب والی تجویز کے بارے میں آپ کو سمجھانا مشکل رہا ہے، بہت سوچ سمجھ کر ہی اس تجویز کو پاس کیا گیا ہے۔ جلد بازی میں یا پوری طرح سوچے سمجھے بغیر کچھ نہیں کیا گیا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا تھا کہ ہم لوگوں نے پہلے جو فیصلے کیے تھے، پنجاب کے بٹوارے کا فیصلہ فطری طور پر اس کے بعد آتا ہے۔ پرانی تجاویز منفی تھیں لیکن اب فیصلے کا وقت آگیا ہے اور صرف اپنے خیالات ونظریات کو ظاہر کرنے والی تجاویز

پاس کرنے کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ مجھے اچھی طرح یقین ہو گیا ہے اور اسی طرح ورکنگ کمیٹی کے ممبران کو بھی یقین ہے کہ ہم لوگوں کو فوراً تقسیم کا مطالبہ کرنا چاہیے(۷)۔

کانگریس مجلس عاملہ کے مارچ کی اس تجویز کے بعد اس کا فطری ردِّعمل بنگال میں ہوا اور بنگال کو تقسیم کر دینے کا مطالبہ ہوا۔ بنگالیوں نے محسوس کیا کہ ۶۳۰ لاکھ کی آبادی میں مسلمانوں کی کل ملا کر ۷۰ لاکھ سے زیادہ تعداد ہونے سے پورے صوبے کو ہمیشہ کے لیے مسلم لیگ کے ماتحت نہیں چھوڑا جاسکتا(۸)۔ آچاریہ کرپلانی کے مطابق پنجاب کے بٹوارے کی تجویز پاس ہونے کے وقت انہوں نے اسے تقسیم ملک کا پیش خیمہ مانتے ہوئے اس کی مخالفت کی تھی۔ اراکین عاملہ محسوس کرتے تھے کہ پاکستان، جس پر مسلم لیگ زور دے رہی تھی اور جسے حکومت برطانیہ کی حمایت حاصل تھی، اس کا قیام ناگزیر تھا اور اگر ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تو پنجاب اور بنگال کا بٹوارہ اس کا لازمی نتیجہ ہوگا، لہٰذا انتظامی بنیاد پر تقسیم پنجاب کا مشورہ دینا ان کی نظر میں چھوٹی برائی تھا(۹)۔ گاندھی جی اس سے ناخوش اور پریشان تو تھے لیکن مستقبل کے سلسلے میں پُراُمید بھی تھے۔ اتنا سب کچھ ہونے پر بھی انہوں نے چینی سفیر سے ملنے پر مستقبل کے بارے میں اپنی امید ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "جب گنگا میں باڑھ آتی ہے تو پانی گندا ہو جاتا ہے۔ گندگی اوپر آجاتی ہے۔ جب باڑھ اُتر جاتی ہے تو آپ آنکھوں کو راحت دینے والا صاف و شفاف پانی دیکھتے ہیں(۱۰)۔ لیکن گاندھی جی اس تقسیم پنجاب کی تجویز کو غیر مؤثر نہیں بنا سکے گرچہ تقسیم میں ان کا کوئی یقین کبھی نہیں رہا۔ اسی لیے آگے چل کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملنے پر انہوں نے کسی طرح کے بٹوارے کی مخالفت کرتے ہوئے اپنی نئی تجویز رکھی تھی کہ لیگ کو پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے مدعو کیا جائے(۱۱)۔

ماؤنٹ بیٹن کی آمد

ہندوستان میں عبوری مرکزی حکومت کی کابینہ کی تشکیل کے ساتھ ہی آزادی کی تحریک ایک نئے اور فیصلہ کن دور میں پہنچ گئی تھی۔ وائسرائے لارڈ ویول کلکتہ کی انتہائی بے رحمانہ و سنگدلانہ قتل و غارت گری سے گھبرا اُٹھے تھے۔ حالات ایسے تھے کہ جناح اور مسلم لیگ کو کانگریس پر اعتماد نہیں تھا۔ کانگریس وائسرائے پر اعتماد نہیں کرتی تھی۔ وائسرائے کو

حکومت برطانیہ خاص کر وزیر اعظم لارڈ ایٹلی پر عدم اعتماد تھا اور ایٹلی کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ویول پر اعتماد نہیں تھا(۱۲)۔ پھر بھی لارڈ ویول نے اپنے صلاح کاروں اور انگریز حکمراں کے تعاون سے ہندوستان سے انگریزی فوج اور انگریزی اقتدار کو آہستہ آہستہ ہٹانے کا ایک منصوبہ بنایا۔ ویول کا خیال تھا کہ برطانوی اقتدار اور فوج کی واپسی یکا یک اور گھبرا کر نہیں ہو سکتی۔ کسی صوبے کو تب تک نہیں چھوڑا جائے گا جب تک قابل وثوق احساس تحفظ اور امن و امان قائم نہ ہو جائے(۱۳)۔ یعنی ہر صوبے میں فرقہ وارانہ اختلافات دور ہو کر امن و تحفظ قائم ہو جائے تب ہندوستان سے انگریزوں کا جانا ٹھیک ہے۔ اس وجہ سے ایٹلی خوش نہیں تھے کہ جب ہم اپنا اقتدار سمیٹ رہے ہیں تو اس موقع پر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ ہمیں جانے سے پہلے ان تمام مسائل کو حل کرنا چاہیے وگرنہ ہم اپنی مقبولیت و معتبریت کے ساتھ دھوکا کریں گے(۱۴)۔ بالآخر ویول کے منصوبے کو انگلینڈ کی سرکار نے نہ صرف یہ کہ نامنظور کر دیا بلکہ اس کے نتیجے میں لارڈ ویول کے وائسرائے کے عہدے کے خاتمے کا فیصلہ سامنے آیا۔ ۱۹؍فروری ۱۹۴۷ء کو ایٹلی نے ایک تار کے ذریعہ ویول کو اس کی اطلاع دے دی(۱۵)۔ لارڈ ویول کی جگہ پر لوئی ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے بنایا گیا اور ۲۰؍فروری ۱۹۴۷ء کو ہاؤس آف کامنس میں جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستانیوں کو اقتدار سونپنے کا اعلان کر دیا گیا(۱۶)۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی آمد کے ساتھ ہی ہندوستانی تاریخ کے نئے باب کا نہایت ہی متنازع، تکلیف دہ، تجسس و اشتیاق، فکر و اندیشے نیز خوف و دہشت سے بھرا ہوا قتل و خون، لوٹ مار، نفرت و عداوت، بیزاری و نا اُمیدی کے ساتھ ساتھ تسلی و تشفی اور اُمید و اطمینان کا ایک غیر معمولی دور شروع ہوتا ہے۔ سرونسٹن چرچل کے لفظوں میں "جس کا سامنا کرنے کے لیے ہی حکومت برطانیہ کے ذریعہ دوسری جنگ عظیم کے اس جنگجو کو بھیجا گیا تھا"(۱۸)۔ ماؤنٹ بیٹن لندن سے مشورہ کے بغیر اور کوئی اطلاع دیے بغیر بھی اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے کا اختیار لے کر ہندوستان آئے تھے(۱۹)۔ ہندوستان پہنچنے پر پہلے پنڈت جواہر لال نہرو نے ان سے ۲۴؍مارچ ۱۹۴۷ء کو ملاقات کی۔ اسی شام لیگ کی طرف سے بھی لیاقت علی خاں ماؤنٹ بیٹن سے ملے(۲۰)۔ یہیں سے ماؤنٹ بیٹن نے آئندہ دور کے ہندوستان کے خدوخال کی تشکیل کے لیے کئی سیاسی جماعتوں کے لیڈروں اور دیگر سرکردہ شخصیتوں سے

ملنا شروع کر دیا۔ اس طرح کی ملاقات و گفتگو سے انہوں نے ان سیاسی لیڈروں کے ساتھ قربت و دوستی کا تعلق قائم کیا جو اس سے قبل کسی وائسرائے نے نہیں کیا تھا (۲۱)۔ اسی درمیان سیاسی موضوعات اور دیگر سیاسی لیڈروں کے سلسلے میں ان کی الگ الگ ذاتی رائے جاننے کے مواقع کا انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنے دماغ میں ہندوستان کے مستقبل کے لیے ایک طے شدہ منصوبے کا نقشہ لے کر ہی ہندوستان آئے تھے لیکن یہ منصوبہ ماؤنٹ بیٹن کا اپنا نہ ہو کر ایک لمبے عرصے سے چلنے والی برٹش سیاست کا طے شدہ نتیجہ تھا۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کے لفظوں میں اس کا سرا لندن کے انڈیا آفس میں بہت پہلے سے یہاں تک کہ ۱۹۴۰ء کے جناح کے تجویز پاکستان سے بھی پہلے سے موجود تھا (۲۲) اور یہ منصوبہ قطعی طور سے ۱۹۰۵ء کے تقسیم بنگال کے خلاف ہوئی زبردست قومی تحریک سے انگریزی سامراج کو پیدا شدہ خطرے کو دور کرنے کے لیے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی تشکیل میں انگریزی تعاون کی انتہا نیز انگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو، پالیسی کی آخری حد تھی۔ اتنا ضرور ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے آنے سے قبل حکومت برطانیہ نے جون ۱۹۴۸ء میں ہندوستان چھوڑنے کا جو اعلان کیا تھا اس کے بعد ماؤنٹ نے اسے نئی جہت و رفتار عطا کی تھی۔ یہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی جلد فیصلہ لینے اور اس پر فوراً عمل درآمد کرنے کی خصوصیت کا ثبوت تھا (۲۳)۔ یہ کہنا کہ ماؤنٹ بیٹن کے دماغ میں ایک صاف نقشہ تقسیم اور آزادی ہند کا تھا، اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنی پہلی ملاقات میں ہی انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو سے کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ انگریزی حکومت کا خاتمہ کرنے والا آخری وائسرائے آپ مجھے نہ سمجھیں بلکہ نئے ہندوستان کا راستہ بنانے والا پہلا وائسرائے (۲۴)۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن قطعی طور سے لارڈ اٹلی کے اس تیقن کو بنیاد بنا کر ہی کھڑے ہوئے تھے، جس کے مطابق ہندوستان کے فرقہ وارانہ و ازیں قبیل مسائل کو حل کیے بغیر ہندوستان سے جانا انگلینڈ کی جانب سے دھوکا دہی، فریب یا اعتماد شکنی نہیں بلکہ تکمیل کار کی علامت تھی (۲۵)۔ اس پس منظر کے ساتھ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے شہ نشینان سیاست سے ملاقات کر رہے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے جب ماؤنٹ بیٹن کی ملاقات ہوئی تھی تو نہرو پر ماؤنٹ بیٹن کا گہرا رنگ چڑھ چکا تھا (۲۶)۔ ۳۱ر مارچ اور یکم اپریل ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ ہوئی بات چیت میں مہاتما گاندھی نے فرقہ وارانہ اور سیاسی مسائل کے حل کے طریقے کے طور پر انہیں مشورہ دیا تھا کہ موجودہ کابینہ کو تحلیل کر کے مسٹر جناح کو صرف مسلم لیگ کی سرکار بنانے کے لیے مدعو کیا جائے۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ برٹش سرکار کے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کے طریقے سے پیدا شدہ حالات میں صرف دو ہی متبادل سامنے ہیں۔ ایک یہ کہ قانون اور نظم و نسق کی حفاظت کے لیے انگریزی اقتدار قائم رہے اور ایک یہ کہ (برٹش سرکار ختم ہو اور ہندوستان میں فرقہ وارانہ) خونریزی ہو۔ خون ریزی کو منظور کر کے اس کا مقابلہ کیا جانا چاہیے (۲۷)۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن نے اپنے مشیر کاروں سے تبادلۂ خیال کے بعد اس مشورے کو نامنظور کرنے کا فیصلہ کیا (۲۸)۔

گاندھی جی نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا تھا کہ وہ کانگریس سے اپنے منصوبے کو منظور کرا لیں گے، لیکن ماؤنٹ بیٹن نے گاندھی جی کا منصوبہ نہ ماننے کے ساتھ یہ تہیہ بھی کیا کہ گاندھی جی کے ذریعہ اپنے منصوبے پر کانگریس کی منظوری حاصل کرنے کی کوشش کرنے سے پہلے ہی وہ جواہر لال نہرو کو اس بات سے آگاہ کرا دیں کہ ماؤنٹ بیٹن اسے ماننے کے حق میں نہیں ہیں (۲۹)۔ بالآخر گاندھی جی نے فرقہ وارانہ فسادات سے تاراج شدہ بہار میں اپنی راحت رسانی و خدمت گزاری کے کاموں پر دھیان دینے کے لیے وائسرائے سے بات چیت میں مزید حصہ نہ لینے کا فیصلہ کر لیا (۳۰)۔ اپنے ہندوستان آنے کے درمیان ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا مستقبل کے ہندوستان کا منصوبہ قطعی شکل اختیار کر چکا تھا کہ کیبنٹ مشن منصوبے کو زندہ رکھنے کی پوری کوشش ہونی چاہیے، لیکن محمد علی جناح کے مقاصد اور طاقت کو ختم ہونے سے بچانے کے لیے (ضرورت پڑنے پر) تقسیم کی سہولت دینے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے (۳۱)۔

اس طرح لارڈ ماؤنٹ بیٹن برطانوی وزیر اعظم ایٹلی کے ذریعہ دی گئی ہدایت کی بنیاد پر کام کر رہے تھے کہ حکومت برطانیہ کا واضح مقصد ہے کہ برٹش کامن ویلتھ کے دائرے میں قانون ساز اسمبلی کی مدد سے ایک سرکار کیبنٹ مشن منصوبے کی بنیاد پر بنے اور کام کرے۔ اپنی پوری طاقت لگا کر آپ کو سبھی پارٹیوں کو اس مقصد کی طرف لے جانا چاہیے اور جو بھی نئی باتیں ہوں ان کے بارے میں سرکار کو صلاح دینی چاہیے کہ کون سے

قدم اٹھائے جائیں ... چونکہ یہ منصوبہ اہم پارٹیوں کی رضامندی سے برٹش انڈیا میں ہی لاگو ہوسکتا ہے اس لیے کسی پارٹی کو مجبور کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا اگر یکم اکتوبر تک آپ سمجھتے ہوں کہ ہندوستان راجاؤں کی مدد سے یا ان کے بغیر برٹش ہندوستان میں سرکار بنانے کا کوئی امکان نہیں ہے تو آپ کو اس کی خبر سرکار کو دینی چاہیے اور صلاح بھیجنی چاہیے کہ کس طرح مقررہ تاریخ کو تبادلۂ اقتدار کیا جاسکتا ہے(٣٢)۔ اس ہدایت کی بنیاد پر وائسرائے نے متذکرہ بالا قصد ضرور کرلیا تھا بھلے ہی اس پر آخری فیصلہ لیے جانے میں ابھی دیر تھی۔

ماؤنٹ بیٹن، نہرو اور پٹیل

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور جواہر لال نہرو کی پرانی پہچان ماؤنٹ بیٹن کے وائسرائے بن کر آنے کے بعد قریبی دوستی میں بدل گئی تھی۔ اپنی پہلی ملاقات میں ہی دونوں نے ایک دوسرے کی اہمیت و معاونت کو سمجھ لیا تھا۔ جب ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستانی ماحول میں فرقہ وارانہ بغض و عداوت کو قریب سے دیکھا تھا تبھی انہوں نے اس کے اہم کردار کو بھی دل میں اُتار لیا تھا۔ عبوری حکومت میں لیگ کی، کانگریس کے پروگراموں کو پورا نہ ہونے دینے کے لیے روڑا اَٹکانے والی پالیسی نے انہیں اس سلسلے میں اور زیادہ گہرائی سے جاننے کا موقع فراہم کیا تھا۔ ملک کے سیاسی حالات نے بیسویں صدی کے ہندوستان کے دو سیاستدانوں اور ایک غیر ملکی حکمراں کو تقریباً ایک ہی راستے پر چلنے کے لیے مجبور کردیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن اگر پہلے ہی تقسیم کے لیے تیار ہونے کی پوزیشن میں تھے، تو پنڈت جواہر لال نہرو، ماؤنٹ بیٹن کے آنے سے بھی پہلے مشرقی بنگال کو ہندوستان سے الگ کردینے کا فیصلہ ذاتی طور پر لے چکے تھے(٣٣)۔ ٢٠ر اپریل ١٩٤٦ء کو ہی پنڈت نہرو نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ لیگ پاکستان لے سکتی ہے صرف اس شرط پر کہ وہ ہندوستان کا ایسا کوئی اور حصہ نہ لے جو پاکستان میں شامل ہونا چاہتا ہو(٣٤)۔ مولانا آزاد کا یہ کہنا صحیح معلوم نہیں ہوتا ہے کہ سردار پٹیل سے اپنی بات منوا لینے کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنا دھیان پنڈت جواہر لال نہرو پر مرکوز کیا۔ پہلے تو جواہر لال بالکل راضی نہ تھے اور تقسیم کے نام ہی سے ان کا نہایت ہی شدید ردِّعمل ہوا لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن برابر اپنی بات کہتے رہے اور

قدم بقدم جواہر لال کی مخالفت کی دیوار ٹوٹتی رہی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان آنے کے ایک ماہ کے اندر ہی جواہر لال، جو کبھی بٹوارے کے کٹر مخالف تھے، اگر اس کے حمایتی نہیں بن گئے تھے تو کم سے کم اس میں ان کی خاموش رضامندی ضرور ہوگئی تھی(٣٥)۔ یہ بات ضرور سچ مانی جاسکتی ہے کہ مسز ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اثر سے پنڈت جواہر لال نہرو کھلے طور سے تقسیم کی حمایت کرنے کو تیار ہوگئے تھے۔ جہاں تک سردار پٹیل کا تعلق ہے عبوری حکومت میں لیگ کے ذریعہ پیدا کی گئی پریشانیوں سے نجات پانے کے لیے جب پٹیل پریشان تھے تب دسمبر ١٩٤٦ء کے آخر میں حکومت ہند کے ریفارم کمشنر بی. پی. مینن سے سردار پٹیل کی بات ہوئی تھی۔ اس میں مینن نے بہت ہی صاف الفاظ میں پٹیل سے کہا تھا کہ انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مطالبۂ پاکستان کو بہت سے بااثر ومقتدر انگریزوں کی حمایت حاصل ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان کے بڑے فوجی افسروں کی تائید حاصل ہے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ آہستہ آہستہ خانہ جنگی کی طرف بڑھنے کی بجائے تقسیم کو تسلیم کرلینا کہیں اچھا ہے۔ اگر ہم لوگ تقسیم کے لیے راضی ہو جائیں تو مسٹر جناح بنگال و پنجاب نیز آسام کے وہ علاقے مانگ ہی نہیں سکتے جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہے۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ کس بنیاد پر اقتدار کا تبادلہ ہو(٣٦)۔ مینن کے ذریعہ جو حالات پٹیل کے سامنے واضح کیے تھے انہیں سمجھ کر پٹیل نے مینن کے مطابق ان کی بات کا یقین کرتے ہوئے ان کی یہ بات مان لی تھی کہ تقسیم شدہ ہندوستان میں دو مرکزی حکومتوں کا ہونا ہی سب سے اچھا رہے گا اور اس کی بنیاد نو آبادیاتی حکومت ہی ہو سکتی ہے(٣٧)۔ مینن کے ذریعہ سمجھائے گئے پس پردہ حالات جاننے کے بعد ہی پٹیل نے اپنا ذہن اس بات کے لیے تیار کرلیا تھا کہ لیگ کو ایک الگ حصہ ہندوستان میں سے دے دیا جائے تاکہ لیگ اپنی سرکار الگ بنا سکے۔ لیونارڈ موسلے کے الفاظ میں پنجاب کی تقسیم کی تجویز تیار کرنے میں پٹیل کے دماغ میں یہی تصویر تھی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ مسلمانوں سے وہ نجات چاہتا تھا۔ کانگریس کے منتظم ومنصرم کی حیثیت سے وہ محسوس کرتا تھا کہ آزاد ہندوستان میں حزب مخالف کی شکل میں مسلم لیگ کا مطلب ہے مصیبت، اس کے منصوبوں کا خاتمہ، قوانین پر روک تھام۔ مسلم لیگ کے نائب لیڈر لیاقت علی خاں نے عبوری حکومت کے فنانس ممبر کی حیثیت سے ایسا بجٹ بنایا تھا کہ کانگریس پارٹی کے حمایتی کروڑپتیوں کا برا

حال ہو گیا تھا اور سماجواد کا کانگریسی دعویٰ خاک میں مل گیا تھا۔ پٹیل نے نہ صرف بجٹ میں ردّ و بدل کے لیے سر توڑ کوشش کی اور وائسرائے کی مدد سے اس میں کامیاب بھی ہوئے بلکہ انہوں نے اس طرح کے جال میں کبھی نہ پھنسنے کا ہی فیصلہ کر لیا(۳۸)۔ اس لیے مولانا آزاد کا سردار پٹیل پر یہ الزام لگانا کہ یہ تاریخ کی ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں جو آدمی سب سے پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اس خیال (تقسیم کا خیال) کا حمایتی ہوا وہ سردار پٹیل تھا، بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ کیوں کہ کانگریس کی ماہ مارچ والی تقسیم پنجاب کی تجویز ماؤنٹ بیٹن کی آمد کے قبل ہی پاس ہو چکی تھی اور اس کے پاس ہونے کی جوابدہی اراکین مجلس عاملہ کی تھی جو مستقبل میں رونما ہونے والی فرقہ وارانہ تباہی کے اندیشے کو دور کرنے کی ایک تدبیر کی شکل میں پنجاب کی تقسیم کو منظور کر چکی تھی۔ اس تجویز سے ماؤنٹ بیٹن کی تقسیم کے خیال کو تقویت حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ سردار پٹیل سے بات کرنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن کا خیال یہ پختہ ہو گیا اور انہیں یہ محسوس ہوا کہ اس پر عمل کیا جا سکتا ہے(۳۹)۔ اس کی رہی سہی کسر تب پوری ہو گئی جب موجودہ وزیر دفاع سردار بلدیو سنگھ نے ۱۶/اپریل ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات میں اس کے اس منصوبے کے تئیں اپنی منظوری ظاہر کر دی تھی(۴۰)۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے ملک کے فرقہ وارانہ فسادات کی ہولناکی کا استعمال ایک ایسے ذریعہ کی شکل میں کیا جس سے کہ وہ کانگریسی لیڈروں کو تقسیم کی فوری ضرورت کی اہمیت سمجھا سکیں۔ دوران فساد مسز ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن جب فساد زدہ علاقے کا دورہ کر کے لوٹی تھیں تب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انہیں جواہر لال نہرو کے پاس اسی حربے کا استعمال کرنے بھیجا تھا۔ پنڈت نہرو جب ملک کی خراب ہوتی صورت حال سے متفکر تھے اور پنجاب کی خونریزی سے پریشان ہو اٹھے تھے تب انہوں نے گاندھی جی کو لکھا تھا کہ کس حد تک سارے ملک میں حالات غیر اطمینان بخش ہیں۔ ایک قسم کی توڑ پھوڑ کی طاقت سرگرم عمل ہے، جس کا ہمارے کام پر ہر چہار جانب سے برا اثر پڑ رہا ہے۔ ساتھ ہی عوام سے ہمارا رابطہ ٹوٹتا جا رہا ہے(۴۱)۔ ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن نے نہرو کے پاس جا کر ان کے ساتھ مل کر ملک کی حالت پر آنسو بہائے تھے(۴۲)۔ اس طرح ماؤنٹ بیٹن، پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل تینوں ایک ہی راستے پر بڑھ رہے تھے۔ پٹیل اور نہرو حالات کی مجبوری سے اور ماؤنٹ بیٹن اپنے مشیر کاروں، اپنی بیوی اور بیٹی کی مدد سے اپنے فیصلے کو بروئے کار لانے کے لیے(۴۳)۔

تقسیم کے منصوبے

ماؤنٹ بیٹن نے کانگریس کے لیڈروں اور محمد علی جناح کے خیالات و جذبات کو سمجھتے ہوئے ہندوستان آنے کے صرف بیس دن بعد بٹوارے کو عملی شکل دینے کے لیے کارروائی شروع کر دی اور لمن کے معاون لارڈ اسمے نے حکومت ہند کے ریفارم کمشنر وی. پی. مینن کو ایک خط بھیجا تھا، جس میں بٹوارے کے منصوبے کے خد و خال اُجاگر کیے گئے تھے اور اس میں ضروری تبدیلی کرنے کی گزارش کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ حکومت برطانیہ جب (ہندوستان کو آزاد کرنے کا) اعلان کرے تو ٹھیک اس کے بعد کون سا راستہ اپنایا جائے، اس پر غور و خوض کریں۔ مثال کے طور پر کیا سارے ہندوستان میں عام چناؤ کی ضرورت ہو گی؟ پنجاب، بنگال اور آسام کا بٹوارہ ہم لوگ کس طرح کریں گے(۴۴)۔ مینن نے ایک مسودہ اس سلسلے میں تیار کیا(۴۵)۔ وائسرائے نے صوبائی گورنروں کا اجلاس بلا کر (۱۵ - ۱۶/مارچ ۱۹۴۷ء) یہ مسودہ ان کے سامنے رکھا، جس میں درج ذیل باتیں کہی گئی تھیں:

(۱) اگر بٹوارہ ہوتا ہے تو اس کی جوابدہی صاف طور سے ہندوستان کی ہو گی۔
(۲) عام طور سے صوبوں کو خود اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہو گا۔
(۳) ووٹنگ کے مقصد سے پنجاب اور بنگال کا بٹوارہ کیا جائے گا۔
(۴) آسام کے مسلم اکثریتی صوبے سلہٹ کو منقسم بنگال سے تشکیل شدہ مسلم صوبے میں ملنے کی چھوٹ دی جائے گی۔
(۵) شمال مغرب سرحدی صوبے میں عام انتخاب کرائے جائیں گے(۴۶)۔

اس اجلاس میں صرف بنگال کے گورنر سر فریڈرک بروز کی رپورٹ میں یہ اشارہ کیا گیا تھا کہ وہ اس منصوبے کی بہ نسبت سہروردی کے آزاد بنگال کے منصوبے سے ہمدردی رکھتا ہے اور بقیہ تقریباً سبھی گورنروں نے ماؤنٹ بیٹن کے اس منصوبے سے رضامندی ظاہر کی۔ موسلے کے لفظوں میں "انہوں نے وائسرائے کو ہری جھنڈی دکھا دی"(۴۷)۔

شملہ کا فیصلہ

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور محمد علی جناح کے درمیان ہونے والی گفتگو سے صرف یہ نتیجہ نکلا تھا کہ جناح اپنے مطالبۂ پاکستان سے ہٹنے کو تیار نہیں ہوئے۔ پہلی بات چیت میں جناح کے اندر جس سرد مہری کا احساس وائسرائے کو ہوا تھا اسے آخر تک دور نہیں کیا جاسکا(۴۸)۔ چنانچہ ۲۲راپریل ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے سوچا کہ کیبنٹ مشن منصوبے کو نئے نام اور نقشے سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ جس شکل میں اسے پہلے پیش کیا گیا تھا وہ نفسیاتی طور سے غلط تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر دو خود مختار ریاستوں کا اصول تسلیم کرلیا جائے تو اس نظریہ کے تحت وفاق کی تشکیل کی جاسکتی ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ مسلم لیگ ایک آزاد مرکز کے ساتھ (کیبنٹ مشن منصوبے میں پیش کیے گئے) گروپ 'بی' اور 'سی' کو چھوڑ کر ایک کٹا ہوا پاکستان لینا قبول کرلے گی(۴۹)۔ اس طرح کانگریس و لیگ کے درمیان متفقہ طور پر مسائل کے حل تک عدم رسائی کی وجہ کر ماؤنٹ بیٹن نے ایک بیچ کا راستہ نکال لیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد گرچہ اس وقت صدر کانگریس نہیں تھے، ان کی جگہ پر پنڈت جواہر لال نہرو کو کانگریس کا صدر منتخب کیا جاچکا تھا لیکن وہ اب بھی کانگریس پارٹی میں ایک اہم مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے اس وقت لیگ اور کانگریس کے درمیان نااتفاقی کی حالت اور تقسیم ملک کے امکان کو ذہن میں رکھتے ہوئے تقسیم روکنے کی غرض سے ایک نیا فارمولا وائسرائے کے سامنے پیش کیا۔ مولانا کے مطابق انگلینڈ کی سرکار نے پچھلے وائسرائے لارڈ ویول اور ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ عبوری حکومت کے مسئلے پر لندن میں ہوئی بات چیت کے بعد جو بیان جاری کیا تھا اس میں صوبوں کے گروپ سے باہر جانے کے اختیار پر اگر وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن آزادانہ طور پر ذاتی اختیارات کا استعمال کریں تو یہ قابل قبول ہوسکتا ہے۔ مولانا کی یہ رائے گاندھی جی کے اس بیان سے وابستہ تھی کہ ہندوستان کے مفاد میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ اپنی ذاتی اہلیت وصلاحیت کی بنیاد پر ماؤنٹ بیٹن ہی اس کے واحد فیصلہ کنندہ ہیں(۵۰)۔ لیکن اس پر کوئی غور وخوض نہیں ہوا اور مولانا کی یہ کوشش ناکام ہوگئی۔

اس وقت وائسرائے کا مقصد تھا کہ کثرت رائے کی بنیاد پر فیصلہ کن نظام کار کی

جگہ پر ایسے دو فرقوں کی تشکیل کریں جو ایک مرکز کے تحت بیٹھ کر رائے مشورہ کریں۔ لہٰذا وائسرائے نے اپنے معاونین وشرکائے کار کے ساتھ نہایت ہی سنجیدہ ومفصل تبادلۂ خیال کے بعد اپنے پہلے منصوبے کو آخری شکل دینے میں کامیابی حاصل کرلی۔ اس میں نظم تھا کہ پارٹی لیڈروں کی منظوری کے بغیر ہی یک طرفہ طور پر ریاستوں کو اقتدار سونپ دینا چاہیے اور مرکز میں مضبوط ومستحکم سرکار کے بدلے ایک فیڈریشن ہونا چاہیے(۵۲)۔ وائسرائے کو یہ یقین تھا کہ یہی وہ منصوبہ تھا جسے دونوں فریق مان لیں گے۔ صرف مسٹر اٹلی اور ان کے ساتھیوں کی منظوری حاصل کرنے کے لیے اپنے دو معاونین لارڈ اِسمے اور جارج ایبل کو یہ منصوبہ لے کر ۲رمئی ۱۹۴۷ء کو لندن روانہ کردیا۔ اسی درمیان حکومت ہند کے ریفارم کمشنر بی. پی. مینن کے ساتھ وائسرائے کی شملہ میں ہوئی بات چیت نے وائسرائے کو اپنے منصوبے میں تبدیلی کرنے کے لیے مجبور کردیا۔ وائسرائے پوری کوشش کررہے تھے کہ کسی طرح کامن ویلتھ میں ہندوستان اور پاکستان کو شامل کرلیا جائے۔ اس سلسلے میں بی. پی. مینن کے شملہ قیام کے دوران انہیں اپنی صلاح دیتے ہوئے کہا تھا کہ سردار پٹیل نے مجھے یقین دلایا ہے کہ اگر نوآبادیات کی بنیاد پر فوراً اقتدار کا تبادلہ ہو تو وہ اپنے اثرات سے کانگریس کی منظوری لے لیں گے(۵۴)۔ وائسرائے اپنے پہلے منصوبے کو جناح کے ذریعہ قبول کیے جانے کے تعلق سے مشکوک تھے۔ انہیں خوف تھا کہ جناح شاید اسے ٹھکرا نہ دیں۔ اسی لیے انہوں نے لندن گئے ہوئے اِسمے کو ایک تار بھیج کر بتایا تھا کہ مسٹر جناح اور لیاقت علی خاں کے ساتھ گفتگو میں میں نے بہت ہی گہرائی سے غور کیا کہ وہ لوگ اس منصوبے کو ٹھکرانے کا کوئی اشارہ دیتے ہیں یا نہیں۔ مجھے تو ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا۔ جان بوجھ کر میں نے ان سے سیدھا سوال نہیں پوچھا ہے کہ کترا ہوا پاکستان وہ قبول کریں گے یا نہیں۔ اس اُمید میں کہ میں آگے بڑھ کر برطانیہ سرکار سے پورے پاکستان کی سفارش کروں، میرا خیال ہے کہ وہ ضرور ''نہ'' کہہ دے گا۔ اس لیے اِس خطرے سے ہمیں آگاہ رہنا چاہیے(۵۵)۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔ وائسرائے کا شک صحیح نکلا۔ محمد علی جناح کی ضد کی وجہ کر وائسرائے کو اپنے اس منصوبے کو چھوڑ دینا پڑا(۵۶)۔ بہت جلد ہی مینن کے ذریعہ پیش کردہ منصوبے پر عمل کرنے کا تہیہ کیا۔

۸رمئی ۱۹۴۷ء کو پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے معتبر دوست کرشنا مینن کے

ساتھ وائسرائے سے شملہ میں ملاقات کی (۵۷)۔ اس مرتبہ ۸ سے ۱۰ ر مئی ۱۹۴۷ء تک نہرو اور وائسرائے کے درمیان بی. پی مینن والے منصوبے پر رائے مشورہ ہوتا رہا۔ اس کا خاکہ اس طرح تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت والے صوبوں کو ہندوستان سے الگ ہونے دیا جائے۔ پھر دو مرکزی سرکاروں کے ہاتھ اقتدار سونپ دیا جائے۔ دونوں کے اپنے گورنر جنرل ہوں۔ جب تک دونوں ملکوں کی مختلف قانون ساز اسمبلیوں کے ذریعہ ان کے دستور تیار نہ ہوں تب تک ان کا تعلق ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے مناسب ترامیم و اصلاحات کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد دونوں ممالک آزاد (۵۸)۔ اس گفتگو میں بی. پی. مینن نے خود نہرو کو اپنا منصوبہ تفصیل کے ساتھ سمجھایا۔ پنڈت نہرو نے منصوبے پر تبصرہ کرتے ہوئے بی. پی. مینن سے کہا کہ آپ کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ ہندوستان میں ایک بڑی رائے عامہ مکمل آزادی کے حق میں ہے۔ نو آبادی کا نام ہی سابقہ تجربات کے پیش نظر بھڑکا دے گا۔ میں جانتا ہوں کہ اصولی طور پر یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ نو آبادی کا مطلب مکمل آزادی ہی ہے لیکن عوام ان باریکیوں کو نہیں سمجھتے (۵۹)۔ لفظ نو آبادی کے سلسلے میں بی. پی. مینن نے بتایا کہ میرے منصوبوں میں یہ التزام رہے گا کہ آرڈر آف کاؤنسل کی بنیاد پر کنگ امپیرر کے خطاب سے لفظ ''امپیرر'' نکال دیا جائے۔ جواہر لال نہرو نے جواب میں کہا ''اس طرح کے فہرست الفاظ سے بہتوں کو غائبانہ محکومی کی بو ملے گی''۔ نہرو نے پھر کہا کہ جذباتی وجوہات کی بنا پر میں خود برٹش کامن ویلتھ سے نزدیکی تعلق رکھنا پسند کرتا ہوں لیکن میں ابھی تک واضح نہیں کر سکتا ہوں کہ اس تعلق کی شکل کیا ہوگی۔ میں سوچتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ یہ تعلق قائم رہے گا، ہاں بھڑکانے والی فہرست الفاظ ہٹانی پڑے گی (۶۰)۔ پنڈت نہرو کے ان الفاظ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انہیں بی. پی. مینن والا منصوبہ پسند آیا تھا۔ یہی وہ منصوبہ تھا جسے لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی عمل میں لانا چاہتے تھے۔ نہرو نے کامن ویلتھ کے سلسلے میں آخری تبصرہ یہ کیا تھا ''لیکن نو آبادی میں ہندوستان جب چاہے کامن ویلتھ چھوڑ تو سکتا ہے ہی'' جواب میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بھی اس سے اپنی رضامندی ظاہر کر دی تھی (۶۱)۔ اس طرح بی. پی. مینن کے منصوبے کو نہرو کی منظوری مل گئی۔ سردار پٹیل پہلے ہی مینن کو اس سلسلے میں یقین دہانی کرا چکے تھے۔ اب ماؤنٹ بیٹن کو کانگریس کی طرف سے اطمینان ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ مینن کے ذریعہ تیار کردہ منصوبہ تھا، وائسرائے کا پہلا منصوبہ نہیں تھا جسے لے کر لارڈ اِسمے اور

جارج ایبل لندن گئے تھے۔ وائسرائے نے لندن والا منصوبہ بھی نہرو کو دکھایا جس سے وہ متفق نہیں ہوئے اور انہوں نے اگلے دن ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ نہ صرف اس سے ہندوستان کو خطرہ ہے بلکہ ہندوستان اور برطانیہ کے آپسی تعلقات بھی خطرے میں ہیں۔ مجھے کوئی شک نہیں کہ کانگریس بھی اسے منظور نہیں کرے گی (۶۲)۔ نہرو کے ذریعہ اپنے منصوبے کو نامنظور کرائے جانے سے وائسرائے کو گھبراہٹ ہوگئی تھی، لہٰذا مینن نے اسے مشورہ دیا کہ اس وقت میرے منصوبے کی بنیاد پر آگے بڑھنا امید افزا ثابت ہوگا۔ یہ تو طے ہے کہ کانگریس اسے مان لے گی۔ کیوں کہ اس طرح بہت جلد تبادلۂ اقتدار ہو جائے گا۔ صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ کیا جناح چھانٹا ہوا ہندستان مانیں گے؟ یہاں مینن نے ہی وائسرائے کو یاد دلایا کہ وائسرائے خود اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جناح پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے لیے راضی ہو جائیں گے (۶۳)۔ ماؤنٹ بیٹن نے ایسا ہی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد پنڈت نہرو کو ایک بار پھر وائسرائے نے بات چیت کے لیے بلایا اور اس میں ماؤنٹ بیٹن اور مینن دونوں کے منصوبے پڑھے گئے۔ ماؤنٹ بیٹن کے منصوبے کے تئیں نہرو کی مخالفت واضح کی گئی اور پھر مینن کے منصوبے کو دہرایا گیا۔ آخر میں ماؤنٹ بیٹن نے پنڈت نہرو سے سیدھا سوال کیا کہ اگر ابھی کی گفتگو کی بنیاد پر نئے منصوبے بنائے جائیں تو کیا کانگریس اسے منظور کرے گی؟ پنڈت جواہر لال نہرو نے جواب میں کہا ''میں کہہ نہیں سکتا لیکن میں پہلے مسودہ دیکھنا چاہوں گا'' (۶۴)۔

ماؤنٹ بیٹن کی ہدایت پر مینن نے اسی وقت اپنے منصوبے کا مسودہ تیار کیا۔ اسی دن یعنی ۱۱ ر مئی کی رات کو وائسرائے بھون میں ایک ضیافت کے دوران مینن کو بتایا گیا کہ پنڈت جواہر لال نے اس منصوبے کو منظور کر لیا ہے (۶۵)۔

تقسیم اور مولانا آزاد کی کوشش

مولانا آزاد کا شروع سے ہی یہ خیال تھا کہ کیبنٹ مشن کا منصوبہ سب سے اچھا منصوبہ تھا۔ اس میں ہندوستان کی سالمیت محفوظ تھی اور ہر فرقے کو آزادی اور وقار کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا گیا تھا (۶۶)۔ اس لیے انہیں جب یہ بات معلوم ہوئی کہ سردار پٹیل تقسیم کے حق میں ہیں تو مولانا نے پٹیل کو اپنا نظریہ سمجھانے کی کوشش کی۔ مولانا آزاد کے لفظوں میں ''میں نے ان سے کہا کہ اگر ہم بٹوارے کے لیے راضی ہو گئے تو ہم ہندوستان

کے لیے ایک مستقل مسئلہ پیدا کرلیں گے۔ بٹوارے سے فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہ ہوگا بلکہ اس ملک میں یہ ہمیشہ کی چیز بن جائے گی۔ مسٹر جناح نے دوقومی نظریے کا نعرہ بلند کیا تھا۔ بٹوارہ مان لینے کا مطلب تھا اس نعرے کو مان لینا۔ کانگریس ہندو اور مسلمان کی بنیاد پر ملک کا بٹوارہ کرنے کی بات کو کیسے مان سکتی ہے۔ فرقہ وارانہ خوف دور کرنے کی بجائے بٹوارہ فرقہ وارانہ منافرت کی بنیاد پر دو حکومتوں کو جنم دے کر اسے دائمی بنا دے گا۔ ایک مرتبہ اگر نفرت کی بنیاد پر حکومتوں کا جنم ہوگیا تو حالات کہاں لے جائیں گے کوئی نہیں کہہ سکتا'' (٦٧)۔ لیکن پٹیل جو تقسیم کو قبول کرنے کے لیے اپنی رضامندی ظاہر کر چکے تھے،انہوں نے جواب میں صاف طور پر کہا کہ آپ لوگوں کو بھلا لگے یا برا، ہندوستان میں دراصل دو قوم ہیں۔ انہوں نے اپنے قول کی حمایت میں یہ بھی کہا کہ اگر دو بھائی ساتھ نہیں رہ سکتے تو علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اپنا اپنا حصہ لے کر الگ الگ ہو جانے پر وہ دوست بن جاتے ہیں۔ دوسری جانب اگر انہیں زبردستی ساجھے میں رکھا جائے تو وہ روز لڑتے جھگڑتے ہیں ، روز کی چخ چخ سے اچھا یہ ہے کہ ایک بار اچھی طرح جھگڑ لو اور الگ ہو جاؤ (٦٨)۔ جب مولانا آزاد نے جواہر لال نہرو کو تقسیم کی مخالفت کرنے کا مشورہ دیا تو جواہر لال نے لیگ کے ساتھ سرکار چلانے میں پیش آمدہ اپنے تلخ تجربات کی بنیاد پر تقسیم کی حمایت کرتے ہوئے جواب دیا کہ انتظامی کاؤنسل میں لیگی اراکین کے رویے کا جو تجربہ مجھے ہوا ہے اس کے بعد مجھے ان کے ساتھ مل کر کام کر پانے کی کوئی اُمید نہیں رہی۔ ہم لوگوں کی رائے کسی بھی مسئلے پر تو نہیں ملتی، ہر روز تکرار ہوتی ہے (٦٩)۔ انہوں نے مولانا آزاد سے یہ بھی کہا کہ بٹوارے کی بات مان لینے کے علاوہ اور چارہ ہی کیا ہے (٧٠)۔ مولانا کے مطابق جب انہوں نے گاندھی جی سے بٹوارہ منظور نہ کرنے کے سلسلے میں کہا تو صرف گاندھی جی نے ہی اس کے خلاف صاف طور پر مولانا سے کہا کہ ''اگر کانگریس بٹوارے کو قبول کرنا چاہتی ہے تو اسے میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔ جب تک میں زندہ ہوں میں کبھی ہندوستان کا بٹوارہ قبول نہیں کروں گا اور جہاں تک میرا بس چلے گا کانگریس کو بھی قبول نہیں کرنے دوں گا'' (٧١)۔

مولانا آزاد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ گاندھی جی سردار پٹیل سے ملنے کے بعد بدل گئے تھے اور جب میں دوبارہ ان سے ملا تو میں نے پایا کہ وہ بدل گئے ہیں۔ وہ کھلے

طور سے بٹوارے کے حق میں تو نہیں ہوئے تھے لیکن وہ اتنے زور سے بٹوارے کی مخالفت بھی نہیں کر رہے تھے (٧٢) لیکن مولانا کا یہ کہنا صحیح نہیں لگتا کیوں کہ مہاتما گاندھی نے تو خود وائسرائے سے مل کر ان کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ لیگ کو حکومت سازی کے لیے مدعو کریں (٧٣)۔ اور اتنا ہی نہیں مہاتما گاندھی اس میں کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھے۔ انھوں نے وائسرائے سے کہا تھا کہ اگر لیگ کی سرکار ملکی عوام کے مفاد میں ٹھیک کام کرتی ہے تو کانگریس اس کی حمایت کرے گی۔ گاندھی جی اس سلسلے میں کسی بھی نزاع میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے یہ بھی وائسرائے پر ہی چھوڑ دیا تھا کہ وہ خود ہی لیگ کے کاموں کو عوامی مفاد میں ہونے کا فیصلہ کریں۔ گاندھی جی لیگ کو پہلے موقع دے کر بٹوارے کے امکانات ہی ختم کر دینا چاہتے تھے۔ ہاں ان کا یہ کہنا بہت ہی واضح تھا کہ اگر لیگ اس تجویز کو نامنظور کر دیتی ہے تو پھر کانگریس کے سامنے بھی ٹھیک ویسی ہی تجویز رکھی جانی چاہیے (٧٤)۔ ایسی حالت میں گاندھی جی کو بٹوارے کے لیے رضامند ہونے کا مجرم نہیں مانا جاسکتا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ گاندھی جی سے بھی مایوس ہونے کے بعد انھوں نے بٹوارہ روکنے کے لیے آخری کوشش کے ارادے سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں مولانا نے کیبنٹ مشن منصوبے کو زندہ رکھنے کی اپیل کی اور کہا کہ ہم لوگوں کو صبر سے کام لینا چاہیے کیوں کہ اس کے کامیاب ہونے کی اب بھی اُمید ہے۔ اگر ہم نے جلد بازی سے کام لیا اور تقسیم کے لیے راضی ہو گئے تو ہم ہندوستان کو مستقل نقصان پہنچائیں گے۔ ملک تقسیم ہو گیا تو پتہ نہیں اس کا کیا ردّعمل ہوگا اور پھر بڑھتے ہوئے قدم واپس لوٹا لینے کا کوئی راستہ نہ رہ جائے گا (٧٥)۔ مولانا آزاد نے تقسیم کے خلاف ماؤنٹ بیٹن کو سمجھانے کی کوشش میں اتنا تک کہہ دیا کہ کانگریس اب تک اس بات پر زور دیتی تھی کہ ہندوستان کو فوراً آزاد کر دیا جائے۔ اب کانگریس ہی یہ کہہ رہی ہے کہ سیاسی مسئلے کا حل ایک دو سال کے لیے ٹال دیا جائے (٧٦)۔ اگر انگریز کانگریس کی اس بات کو مان لیتے ہیں تو یقیناً ان پر کوئی داغ نہیں لگے گا۔ انھوں نے اس جانب بھی وائسرائے کا ذہن متوجہ کیا تھا کہ اب اگر انگریزوں نے جلد بازی سے کام لیا تو آزاد اور غیر جانبدارانہ مشاہد فطرتاً یہ نتیجہ نکالیں گے کہ انگریز ہندوستان کو ایسے حالات میں آزادی دینا چاہتے تھے جب وہ اس کا پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ ہندوستان کی خواہش کے خلاف بٹوارے پر زور دینے اور تقسیم

کرانے سے یہ شک پیدا ہوگا کہ انگریزوں کی نیت صاف نہیں تھی (۷۷)۔ مولانا نے لکھا
ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انھیں یقین دہانی کرائی تھی کہ میں حالات کی پوری پوری اور
سچی تصویر برٹش کابینہ کے سامنے رکھ دوں گا اور پچھلے دو مہینے میں میں نے جو کچھ دیکھا سنا
ہے اس کا ایمانداری سے ذکر کر دوں گا اور کابینہ کو یہ بھی بتا دوں گا کہ کانگریس کا ایک اہم
حصہ ایسا بھی ہے، جو یہ چاہتا ہے کہ اس سوال کا حل ایک دو سال کے لیے ملتوی کر دیا
جائے۔ انھوں نے یہ بھی یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ مسٹر ایٹلی اور مسٹر کرپس کو یہ بھی بتا دیں
گے کہ اس معاملے میں مولانا آزاد کا خیال کیا ہے(۷۸) لیکن مولانا آزاد کی ان ساری
کوششوں کو کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی (۷۹) اور جو منصوبہ بی. پی. مینن نے تیار کیا تھا
لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اسے ہی آگے بڑھایا۔ ماؤنٹ بیٹن اس پر اتنے پختہ خیال ہو چکے تھے
کہ مولانا آزاد کے ذریعہ تقسیم شدہ ملک کے الگ الگ حصوں میں خون کی ندی بہنے اور
ہلاکت انسانی کی ذمہ داری انگریزوں کے سر ہونے کی بات کہنے پر انھوں نے فوراً جواب
دیا کہ کم ازکم اس سوال پر میں آپ کو مکمل یقین دلا سکتا ہوں کہ یہ میری ذمہ داری ہے کہ
کوئی خون خرابہ اور فساد نہ ہو۔ میں فوجی ہوں غیر فوجی نہیں۔ ایک بار بٹوارہ اگر اصولی طور
پر مان لیا جائے تو میں ایک حکم نامہ جاری کر اس بات کا انتظام کروں گا کہ ملک میں کہیں
بھی فرقہ وارانہ فسادات نہ ہوں (۸۰)۔

۳/جون کی تجویز

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنے منصوبے کو حکومت برطانیہ سے منوانے کے لیے پُرعزم
تھے۔ انھوں نے اس منصوبے کے سلسلے میں لندن سرکار کے ذریعہ وضاحت طلب کیے جانے
پر ایک مرتبہ جھنجھلاہٹ میں تہیہ کر لیا تھا کہ نئے منصوبے کا جو مسودہ میں نے بھیجا ہے اسے
جیوں کا تیوں وہ (لندن سرکار) مان لے ورنہ میں استعفیٰ دے دوں گا(۸۱) لیکن آخر میں
بی. پی. مینن کے ذریعہ سمجھائے جانے پر ۱۸/مئی ۱۹۴۷ء کو وائسرائے خود لندن گئے اور وہاں
ایٹلی اور ان کی کابینہ نے آسانی کے ساتھ اس منصوبے کو پانچ منٹ میں ہی منظور کر
لیا(۸۲)۔ ۲/جون کو وائسرائے نے کانگریس و لیگ کے لیڈروں کو بلا کر ان کے سامنے
تقسیم کا منصوبہ پیش کر دیا(۸۳)۔ اس وقت کانگریس کی جانب سے پنڈت جواہر لال نہرو

اور سردار ولبھ بھائی پٹیل اور لیگ کی طرف سے محمد علی جناح اور لیاقت علی خاں کو بلایا گیا
تھا۔ اس سے صاف جھلکتا تھا کہ حکومت برطانیہ اور اس کے نمائندے لارڈ ماؤنٹ بیٹن،
لیگ و کانگریس کو برابری کا درجہ دے کر چل رہے تھے۔ سکھوں کے نمائندہ کی حیثیت سے
سردار بلدیو سنگھ کو مدعو کیا گیا تھا۔ کچھ اخبارات کے ذریعہ یہ تبصرہ کرنے پر کہ صدر کانگریس
آچاریہ کرپلانی کو کیوں نہیں بلایا گیا، جب کہ صدر مسلم لیگ محمد علی جناح کو مدعو کیا گیا ہے،
جواہر لال نہرو کا ذہن اس طرف متوجہ کیا گیا اور ماؤنٹ بیٹن سے کہنے کے بعد صدر
کانگریس آچاریہ کرپلانی کو بھی دعوت دی گئی۔ ساتھ ہی لیگ کی طرف سے ایک ممبر سردار
عبدالرب نشتر کو بھی بلایا گیا تا کہ لیگ و کانگریس کا وزن برابر رہے(۸۴)۔ اس طرح نہرو،
پٹیل، کرپلانی کانگریس سے جناح، لیاقت علی و نشتر لیگ سے اور بلدیو سنگھ سکھوں کے
نمائندے کی حیثیت سے میٹنگ میں شامل ہوئے۔

۲/جون کی اس میٹنگ میں مدعو مذکورہ لیڈروں کے سامنے بٹوارے کا منصوبہ
پیش کیا گیا۔ ''فریڈم ایٹ مِڈ نائٹ'' کے مصنفین ڈومینک لیپیرے، اور لاری کولنس کے
مطابق لارڈ ماؤنٹ بیٹن فیصلہ کر چکا تھا کہ وہی زیادہ تر گفتگو کرے گا، دوسرے شخص کو
بولنے کا موقع دے کر وہ میٹنگ کو عام بحث، جو چیخنے چلّانے کی سطح تک جا سکتی تھی، بنانے
کا خطرہ مول نہیں لے گا(۸۵)۔ میٹنگ میں اس نے اپنے منصوبے کو سمجھانا شروع کیا اور
نوآبادیاتی تجویز سے متعلق دفعات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس کا مطلب یہ نہیں
ہے کہ برٹش سرکار اپنا اختیار بنائے رکھنا چاہتی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ برٹش سرکار
اس الزام سے بچنا چاہتی ہے کہ اس نے وقت سے پہلے ہی اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے، جب کہ
اس کے بنے رہنے کی ضرورت تھی (۸۶)۔ وائسرائے نے کہا کہ میں نہیں کہتا کہ آپ لوگ
اپنی خواہش کے برخلاف اس منصوبے سے مکمل اتفاق کریں، میں صرف پُرامن جذبے سے
اسے منظور کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں(۸۷)۔ پنڈت نہرو کے ذریعہ اتفاق اور منظوری کا
فرق پوچھے جانے پر ماؤنٹ بیٹن نے جواب دیا کہ متفق ہونے میں یہ حقیقت پنہاں ہے کہ
اس میں صحیح اصولوں کی شمولیت ہے، جب کہ انھیں (وائسرائے کو) دونوں جانب کے
اصولوں کی خلاف ورزی کرنی پڑتی ہے، اس لیے وہ (وائسرائے) مکمل اتفاق کے لیے نہیں
کہہ رہے ہیں۔ میں نے منظوری یہ یقین کرنے کے لیے مانگی ہے کہ یہ ملک کے بھلے کے

لیے بنایا گیا ایک واضح اور باوزن منصوبہ ہے(۸۸)۔ ماؤنٹ بیٹن نے کانگریس، لیگ اور سکھوں کا ردّعمل جاننے کے لیے ۲/ جون کی آدھی رات تک کا وقت دیا۔ آچاریہ کرپلانی و بلدیو سنگھ نے اسے مان لیا اور شام تک خط کے ذریعہ مطلع کرنے کا یقین دلایا لیکن جناح نے تحریری ردّعمل ظاہر کرنے کی جگہ بذات خود وائسرائے سے مل کر زبانی اطلاع دینے کی بات کہی، جسے وائسرائے نے قبول کر لیا(۸۹)۔ اسی دن دو پہر کو ساڑھے بارہ بجے مہاتما گاندھی نے ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی(۹۰)۔ ماؤنٹ بیٹن مہاتما گاندھی کی آمد سے ڈرتے تھے کیوں کہ گاندھی جی ہندوستان کی تقسیم روکنے کے لیے بھوک ہڑتال یا دوسرے ذرائع سے ماؤنٹ بیٹن کے منصوبے پر پانی پھیر سکتے تھے۔ اس دن سوموار تھا اور گاندھی جی کا ''مون برت'' تھا۔ اس ملاقات میں گاندھی جی نے ایک کاغذ کے پُرزے پر اپنا خیال اس طرح ظاہر کیا ''مجھے افسوس ہے کہ میں بول نہیں سکتا۔ جب میں نے سوموار کو خاموش رہنے کا فیصلہ لیا تھا تب میں نے نہایت ہی ضروری معاملات پر اعلیٰ افسروں سے اور بیماروں سے ملنے جانے کو اس سے مستثنیٰ رکھا تھا، لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے خاموشی توڑنے کو نہیں کہیں گے۔ کیا میں نے اپنی تقریروں میں ایک لفظ بھی آپ کے خلاف کہا؟ اگر آپ قبول کرتے ہیں تو آپ کا کہنا بیکار ہے۔ یہاں ایک دو چیزیں ہیں جن کے بارے میں میں بات کروں گا لیکن آج نہیں۔ اگر ہم ایک دوسرے سے پھر ملے تو میں کہوں گا(۹۱)۔ اس طرح گاندھی جی نے منصوبے کے تئیں ماؤنٹ بیٹن سے بھی اپنی مخالفت ظاہر کر دی تھی(۹۲)۔ اگلے دن ۳/ جون کو اس مجوزہ منصوبے کا عوامی طور پر اعلان کر دیا گیا۔

۲/ جون کو جو منصوبہ کانگریس، لیگ اور سکھوں کے نمائندگان کے سامنے پیش کیا گیا تھا اسے ان نمائندوں نے منظور کر لیا تھا اور ۳/ جون کو پنڈت جواہر لال نہرو، محمد علی جناح اور سردار بلدیو سنگھ کے ریڈیو نشریات سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ سیاستدانوں کی اعلیٰ سطحی گفتگو میں ہندوستان کا بٹوارہ کرنے کی بات مان لی گئی ہے لیکن ابھی کانگریس مجلس عاملہ نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ جہاں تک مسلم لیگ کی مجلس منتظمہ کا سوال ہے لیگ کے صدر مسٹر جناح اور منتظمہ میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جیسا کہ مسٹر جناح نے وائسرائے سے خود کہا تھا ''آپ کوشش کر سکتے ہیں اور ساری دنیا کو ویسا بتا سکتے ہیں، لیکن مہربانی کر کے اس بھلاوے میں رہنے کی کوشش مت کیجیے کہ میں نہیں جانتا کہ کون کون مسلم لیگ میں کیا کیا

ہیں''(۹۳) اور مسٹر جناح کی منظوری اس سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ ۲/ جون کی رات کو گیارہ بجے وائسرائے سے مل کر انھوں نے اپنا فیصلہ دے دیا۔ وائسرائے کے الفاظ میں ''جناح کی خوشی صاف تھی''(۹۴)۔ ۳/ جون کو شام کے وقت جواہر لال نہرو نے ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا ''میں بہت خوشی سے اس تجویز کی سفارش نہیں کر رہا۔ حالانکہ یہ بھی ٹھیک ہے کہ میرے دماغ میں اس بات پر کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس وقت یہی سب سے اچھا راستہ ہے''۔ مسٹر جناح نے اسے قبول کرتے ہوئے اپنے بیان میں کہا کہ ''یہ ہم لوگوں کے سوچنے کی بات ہے کہ جو منصوبہ برطانیہ سرکار سامنے رکھ رہی ہے اسے ہم لوگ سمجھوتہ یا آخری سودے کی شکل میں قبول کریں۔ پاکستان زندہ باد''۔ سردار بلدیو سنگھ نے کہا ''اس سے ہر کسی کو خوشی نہیں ہوئی، سکھوں کو تو ہوئی ہی نہیں، لیکن پھر بھی یہ گزارے لائق ہے۔ ہم لوگوں کو اسے مان لینا چاہیے''(۹۵)۔

کانگریس مجلس عاملہ

۴/ جون ۱۹۴۷ء کو کانگریس مجلس عاملہ کی ایک بیٹھک دہلی کی بھنگی کالونی جہاں گاندھی جی قیام پذیر تھے، میں ہوئی۔ اس بیٹھک میں جے پرکاش نارائن اور ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کو خاص طور سے مدعو کیا گیا تھا(۹۶)۔ بیٹھک میں جو بھی رائے مشورہ ہوا اس سے تجویز کو منظور کرنے کے حالات بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر لوہیا کے مطابق صرف جے پرکاش، میں (ڈاکٹر لوہیا)، مہاتما گاندھی اور خان عبدالغفار خاں کے علاوہ کسی نے بھی تقسیم کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ مولانا آزاد دونوں دن ایک کرسی پر کونے میں بیٹھے ہوئے لگاتار سگریٹ پھونکتے رہے لیکن ایک لفظ بھی نہیں بولے۔ آچاریہ کرپلانی سست ہو کر ایک طرف بیٹھے رہے۔ گاندھی جی نے اس بیٹھک میں نہرو اور پٹیل سے شکایت کی کہ تقسیم کی اسکیم منظور کرنے سے قبل انھوں نے مجھے (گاندھی جی کو) مطلع کیوں نہیں کیا۔ گاندھی جی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پنڈت نہرو نے بیچ میں ہی روکتے ہوئے کہا کہ انھوں (پٹیل و نہرو) نے انھیں (گاندھی جی) کو پوری طرح باخبر رکھا ہے۔ گاندھی جی کے یہ کہنے پر کہ وہ (گاندھی جی) تقسیم کی اسکیم کے سلسلے میں نہیں جانتے ہیں، پنڈت نہرو نے جواب دیا کہ نواکھالی اتنی دور ہے کہ اسکیم کے بارے میں تفصیل سے بتانا ممکن نہ تھا پھر بھی میں

نے (نہرو نے) موٹے طور پر تقسیم کے سلسلے میں گاندھی جی کو لکھ دیا تھا (۹۷)۔

مہاتما گاندھی اُن دِنوں خود کو تنہا محسوس کر رہے تھے۔ انھیں اندرون قلب اتنی بے چینی کا احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنے بستر پر بھی بڑبڑاتے تھے کہ آج میں اپنے آپ کو اکیلا پاتا ہوں۔ جواہر لال اور سردار پٹیل بھی سوچتے ہیں کہ گاندھی جی نے حالات کو غلط سمجھا ہے اور تقسیم کو منظور کر لینے سے قطعی طور پر امن و چین دوبارہ قائم ہو جائے گا ... میرا وائسرائے سے یہ کہنا انھیں پسند نہیں کہ اگر بٹوارہ ہو بھی تو وہ برٹش ثالثی یا برٹش حکومت کے تحت نہیں ہونا چاہیے ... میں صاف دیکھ سکتا ہوں کہ اس قیمت پر حاصل کی گئی آزادی کا مستقبل تاریک ہے (۹۸)۔ وہ بٹوارے کے تئیں اپنی نامنظوری کو اس سے زیادہ اور کیسے ظاہر کر سکتے تھے جو بستر میں لیٹے لیٹے بھی ان کے لفظوں میں اس طرح نکلتی تھی کہ ''یہ نہیں کہا جانا چاہیے کہ گاندھی تقسیم ہند میں ایک پارٹی تھا'' (۹۹)۔ اس بیٹھک میں گاندھی جی کا اکیلا پن کھل کر سامنے آیا اور وہ ایک دم تنہا و بے یار و مددگار رہ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پٹیل اور نہرو نے یہ پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ تقسیم کے بارے میں قطعی فیصلہ ہونے سے پہلے گاندھی جی کو نہ بتانا ہی سب سے اچھا رہے گا (۱۰۰) اور وہ اس سلسلے میں بٹوارے کی تجویز منظور کرنے کا فیصلہ پہلے لے چکے تھے (۱۰۱)۔ اس بیٹھک میں کانگریس مجلس عاملہ کے اراکین میں صرف خان عبد الغفار خاں کو چھوڑ کر اور کسی نے بھی تقسیم کی مخالفت میں اپنی رائے نہیں دی۔ خان عبد الغفار خاں تقسیم کو پٹھانوں کے لیے تباہی و بربادی مانتے تھے اور انھوں نے اس بیٹھک میں بٹوارے کی تجویز کی مخالفت میں روتے ہوئے کہا تھا کہ ہم تو تباہ ہو گئے (۱۰۲)۔ بیٹھک میں موجود بقیہ سبھی اراکین تقسیم کے حق میں فیصلہ لینے میں شامل تھے۔

آچاریہ کرپلانی نے لکھا ہے کہ مولانا آزاد اور دوسرے مسلم لیڈران بھی تقسیم کے حق میں ایک پارٹی تھے (۱۰۳)۔

کانگریس اعلیٰ کمیٹی

کانگریس مجلس عاملہ کی ۴؍ جون کی بیٹھک میں تجویز کو منظوری حاصل ہونے کے بعد ۱۴؍ جون ۱۹۴۷ء کو کل ہند کانگریس اعلیٰ کمیٹی کا اجلاس بٹوارے کی تجویز پر غور و خوض کرنے، بالفاظ دیگر منظوری دینے کے لیے بلایا گیا۔ اس کی بیٹھک دہلی میں ۱۴؍ جون کو دن

کے ڈھائی بجے شروع ہوئی۔ آچاریہ کرپلانی صدر جلسہ تھے اور اس میں کانگریس اعلیٰ کمیٹی کے ۲۱۸ ممبران موجود تھے۔

بیٹھک میں کانگریس مجلس عاملہ کے ذریعہ منظور شدہ تجویز کو گووند ولبھ پنت نے کانگریس اعلیٰ کمیٹی کے سامنے پیش کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی تائید کی (۱۰۴)۔ بیٹھک۔ میں انھوں نے بٹوارے کو بدبختی پر محمول کرتے ہوئے تباہ کن ضرور بتایا لیکن اس کی منظوری، کو آخری شکل نہ دینے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے اپنی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب آزادی کی کہانی میں لکھا ہے کہ ''میں نے اس موقع پر صاف صاف کہا تھا کہ مجلس عاملہ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ نہایت ہی بدبختانہ سلسلۂ واقعات کا ثمرہ ہے''۔ ہندوستان کا بٹوارہ بہت ہی المناک سانحہ ہے اور اس کے حق میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے اس بٹوارے کو ٹالنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ہمیں کامیابی نہیں ملی۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارا ملک ایک ہے نیز ہماری تہذیبی و ثقافتی زندگی ایک رہی ہے اور رہے گی۔ مولانا آزاد نے تہذیبی و قومی اتحاد کی بات کرتے ہوئے اس حقیقت کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا کہ انھوں نے بٹوارہ منظور کر لیا ہے۔ انھوں نے اسی تقریر میں کہا کہ سیاسی نقطۂ نظر سے ہمیں کامیابی نہیں ملی اسی لیے ہم ملک کو بانٹ رہے ہیں۔ ہمیں اپنی شکست مان لینی چاہیے لیکن ساتھ ہی ہمیں بھرپور کوشش کرنی چاہیے کہ کہیں ہماری تہذیب کا بٹوارہ نہ ہو جائے۔ مستقبل کے لیے مولانا آزاد اسی تہذیبی یگانگت کی یقین دہانی بھی چاہتے تھے جیسا کہ آگے انھوں نے کہا کہ ''پانی میں چھڑی ڈالیے، آپ کو لگے گا پانی بٹ گیا ہے، پر دراصل پانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسے آپ چھڑی ہٹائیں گے پانی کی تقسیم کا نشان بھی نہ رہ پائے گا'' (۱۰۵)۔ مولانا آزاد کے بیان سے ہی یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ انھوں نے سیاسی بٹوارہ قبول کر لیا۔ آچاریہ کرپلانی نے بھی اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ مولانا آزاد نے کانگریس مجلس عاملہ یا کل ہند کانگریس اعلیٰ کمیٹی میں کبھی تقسیم کی مخالفت نہ کی (۱۰۶)۔ جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل نے بھی تجویز کی حمایت کی۔ صدر کانگریس آچاریہ کرپلانی کے کہنے پر مہاتما گاندھی نے بھی اس پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ گاندھی جی نے اپنی بے بسی اور سیاسی حالات کے تناظر میں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے کل ہند کانگریس مجلس عاملہ کی تجویز منظور کرنے کی سفارش کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ کیا میں اس

کی مخالفت نہیں کرتا اگر مجھے وقت ملتا؟ لیکن میں موجودہ قیادت کو چیلنج نہیں کرسکتا نیز عوام کا اعتماد اس میں (قیادت میں) سے نہیں ہٹا سکتا، جب تک کہ میں انھیں (عوام کو) یہ بتانے کی پوزیشن میں نہ ہو جاؤں کہ یہاں ایک متبادل قیادت ہے۔ ان حالات میں موجودہ قیادت کو کمزور بنانا غلط ہوگا۔ اس لیے مجھے یہ کڑوی گولی نگلنی ہوگی (۱۰۷)۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ گاندھی جی اپنے اکیلے پن اور حالات کی سنگینی کی وجہ کر مجبور تھے۔ وگرنہ کرپلانی کے الفاظ میں ''اگر انھوں نے کانگریس مجلس عاملہ کے فیصلے کی مخالفت کی ہوتی تو انھیں تقسیم کا فیصلہ لینے والے لیڈروں کے خلاف عوام کے سامنے جانا ہوتا اور ایک نئی قیادت کی تشکیل کیے بغیر وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے'' (۱۰۸)۔ ایسا نہ کرنے کی معذوری ہی ان کی مجبوری تھی۔ انھوں نے بٹوارے کو منظور نہیں کیا بلکہ اس مجبوری کو منظور کیا جیسا کہ ان کے درج ذیل الفاظ سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے جو انھوں نے ۳؍جون کی شام کو کہا تھا کہ ''میں بار بار آپ سے کہہ چکا ہوں کہ زبردستی کے سامنے تھوڑا جھکنا بھی غلط ہے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کا کہنا ہے کہ وہ لوگ ہتھیاروں کی طاقت کے سامنے نہیں حالات کے سامنے جھکے ہیں... بڑی ہوشیاری سے موجودہ اہم سوالوں کی اچھائیوں اور برائیوں کو تول لینے کے بعد وہ بے دلی سے ان حصوں کو یونین سے الگ رکھنے پر راضی ہوگئے، جنھوں نے کانسٹی چوینٹ اسمبلی کی مخالفت کی تھی۔ مسلم لیگ کی غلط پالیسی پر مجھے افسوس ہے۔ جو کچھ ہوا ہے اس کے لیے میں وائسرائے کو الزام نہیں دے سکتا۔ یہ سب تو کانگریس اور مسلم لیگ نے کیا ہے۔ وائسرائے نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ میں تو غیر منقسم ہندوستان چاہتا ہوں مگر کانگریس نے جو بے دلی سے ہی سہی مسلمانوں کی اختیار کی ہوئی حیثیت کو منظور کر لیا ہے، اس کے سامنے میرا کوئی بس نہیں۔ میں نے اس بات کی ہر ممکن کوشش کی کہ لوگ ۱۶؍مئی کے بیان پر اڑے رہیں مگر ناکام رہا۔ لیکن اب تو سوچنا یہ ہے کہ جو بات منظور کی گئی ہے اس کے تئیں میرا اور آپ کا کیا فرض ہے۔ میں کانگریس کا خادم ہوں کیوں کہ میں ملک کا خادم ہوں اور میں ان کے تئیں کبھی بے وفا نہیں ہوسکتا'' (۱۰۹)۔

۶؍جون کی ''پرارتھنا سبھا'' میں گاندھی جی نے اسی موضوع کے تعلق سے پھر کہا ''مسلم لیگ سے اب میں اپیل کرتا ہوں کہ چونکہ ان کی خواہش پوری ہو چکی ہے اس لیے وہ پارٹیوں کے درمیان سمجھوتہ کرانے کے کارگراں بار سے وائسرائے کو فرصت دیں۔ مجھے

اُمید ہے کہ پارٹیوں کے درمیان کا یہ سمجھوتہ آخری ہوگا۔ میں ملک کا خادم ہوں اس لیے کانگریس کا بھی خادم ہوں۔ کیا میں اس لیے اُپواس کروں کہ کانگریس کا نظریہ میرے نظریے سے نہیں ملتا۔ مجھے خاموش رہنا ہی چاہیے'' (۱۱۰)۔

خلاصہ

تقسیم سے قبل ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات سے مولانا کو اندرونی تکلیف پہنچی تھی۔ تبھی انھوں نے انھیں غیر اسلامی بتایا تھا۔ اسی طرح گاندھی جی کی مانند تقسیم کو بھی وہ اسلام موافق نہیں مانتے تھے (۱۱۱)۔ تقسیم کے خیال کو ہی وہ آسانی سے اس طرح قبول نہیں کر پاتے تھے، جس طرح پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے کرلیا تھا۔ جب مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا تبھی انھوں نے ایسوسی ایٹیڈ پریس کے نمائندے سے کہا تھا کہ ''نہ تو میں ہندوستانی کی حیثیت سے اور نہ ہی ایک مسلمان ہونے کے ناطے اسے پسند کرتا ہوں'' (۱۱۲)۔ مولانا آزاد کو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایسا کرنے سے سبھی ہندوستانیوں، خاص طور سے مسلمانوں کو بہت نقصان ہوگا۔ اپریل ۱۹۴۶ء میں انھوں نے ایک بیان میں اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا کہ ''مسلم لیگ نے پاکستان کا جو منصوبہ تیار کیا ہے اس پر میں نے ہر امکانی نظریے سے غور کیا ہے۔ ایک ہندوستانی کے ناطے میں نے یہ بات جانچی پرکھی ہے کہ پورے ہندوستان کے مستقبل پر اس کا اثر پڑ سکتا ہے۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں نے غور کیا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت پر اس کے کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ منصوبے کے سبھی پہلوؤں پر غور وخوض کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ نہ صرف سارے ہندوستان کے لیے نقصان دہ ہے بلکہ مسلمانوں کے لیے خاص طور سے ہلاکت خیز ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس سے جتنے مسائل حل ہوتے ہیں اس سے کہیں زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو میں یہ کہوں کہ یہ پاکستان لفظ ہی مجھے کچھ جچتا نہیں ہے۔ اس میں کچھ اس طرح کا مفہوم ہے کہ دنیا کے کچھ حصے تو پاک ہیں اور کچھ حصے ناپاک۔ زمین کو اس طرح پاک اور ناپاک حصوں میں بانٹنا ہی اسلام کے خلاف ہے اور اسلام کے بنیادی جذبات اس سے مجروح ہوتے ہیں'' (۱۱۳)۔

مولانا آگے فرماتے ہیں کہ ''مسٹر جناح کے مطابق ہر کھیڑے میں، ہرگاؤں اور

شہر میں دو قومیں ایک دوسرے کے مقابلے میں رہتی ہیں اور اس لیے وہ چاہتی ہیں کہ انھیں دو ملکوں میں الگ الگ کر دیا جائے"۔

انھوں نے مزید کہا "میں اس مسئلے کے اور سب پہلوؤں کو نظر انداز کر کے صرف مسلم مفاد کے نقطۂ نظر سے اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں تو اس سے بھی آگے بڑھ سکتا ہوں اور یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان کے منصوبے سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ ہو سکتا ہے تو میں خود تو اسے مان ہی لوں گا کوشش کروں گا کہ اور لوگ بھی اسے منظور کر لیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ جب میں مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مفاد کی بھی کسوٹی پر اس منصوبے کو کستا ہوں تو اسی نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ اس سے ان کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور نہ ان کے جائز اندیشے دور ہوں گے"۔ قیام پاکستان کے نقصانات سمجھاتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ "اس سے ہندوستان میں ساڑھے تین کروڑ مسلمان رہ جائیں گے، جو ملک بھر میں چھوٹی چھوٹی تعداد میں بکھرے ہوں گے۔ ہندو اکثریتی صوبوں میں وہ آج کے مقابلے میں کمزور ہوں گے ... مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جب آج کا جوش ختم ہو جائے گا تو وہی لوگ جو آج پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں، مسلمانوں کے مفاد کے لیے نقصاندہ کہہ کر اسے نامنظور کریں گے" (۱۱۴)۔

قیام پاکستان کے بعد بھی، جب کہ وہ کانگریس کی مجلس عاملہ و اعلیٰ کمیٹی کی نشستوں میں خود ہی اسے منظور کر چکے تھے، مولانا آزاد تقسیم ملک سے خوش نہیں تھے۔ انھوں نے پاکستان بننے پر اپنا غم ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "سچ تو یہ ہے کہ اس بارے میں جتنا ہی سوچتا ہوں اتنا ہی مجھے یہ یقین ہوتا ہے کہ پاکستان بن جانے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اتنے بگڑ گئے تھے کہ بٹوارے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ مسلم لیگ کے زیادہ تر حمایتیوں کا خیال یہی تھا اور بٹوارے کے بعد بہت سارے کانگریسی لیڈروں کا بھی یہی خیال رہا ہے۔ بٹوارے کے بعد جب کبھی میں نے جواہر لال یا سردار پٹیل سے اس بارے میں بات کی تب انھوں نے بھی اپنے فیصلے کی تائید میں ہمیشہ یہی دلیل دی۔ لیکن اگر ہم اس معاملے پر ٹھنڈے دماغ سے سوچیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کا تجزیہ صحیح نہیں ہے" (۱۱۵)۔

مولانا آزاد بٹوارے کی جگہ پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی تعاون کو

مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی سب سے بڑی گارنٹی مانتے تھے۔ ان کی نگاہ میں دونوں فرقوں کے بگڑے ہوئے تعلقات کا حل یہ تھا کہ ہندو اکثریتی صوبوں کے ہندو اپنے صوبے کے مسلمانوں کی اور مسلم اکثریتی صوبوں کے مسلمان اپنے صوبے کے ہندوؤں کی حفاظت کریں (۱۱۶)۔ اسی لیے پاکستان کی مانگ کو انھوں نے کبھی اپنی حمایت نہیں دی۔ انھوں نے دونوں فرقوں کے اتحاد کے لیے اپیل کرتے ہوئے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد میں مسلمانوں کے ایک جلسے میں دورانِ تقریر کہا تھا کہ "ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا، میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون، جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں لیکن تم نے سنی اَن سنی برابر کر دی۔ مجھے آج جو کچھ کہنا ہے بے روک ٹوک کہنا چاہتا ہوں۔ متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا" (۱۱۷)۔ ملک کا بٹوارہ ہونے کے بعد بھی انھیں یہ اُمید بندھی ہوئی تھی کہ یہ بٹوارہ ختم ہو جائے گا۔ ایک صحافی مسٹر ڈی۔ ایف۔ کراکا سے انھوں نے کہا تھا کہ "ہندوستان میں ۴۰ لاکھ مسلمان رہیں گے اور پاکستان میں پچیس لاکھ ہندو رہیں گے، جہاں وہ پیدا ہوئے ہیں وہیں انھیں رہنا ہوگا۔ وہ دراصل ایک ہی عوام ہیں، وہ لمبے عرصے تک ساتھ رہے ہیں۔ انھیں پھر پاس پاس آنا ہوگا" (۱۱۸)۔

گاندھی جی کا ساتھ دے کر تحریک عدم تعاون کو کامیاب بنانے کی کوشش نہ کی ہوتی تو بہت
ممکن تھا کہ گاندھی جی کی یہ تحریک ملک کے ایک طبقے کے اندر ہی سمٹ کر رہ جاتی اور اس
کا وہ نتیجہ نہیں نکلتا، جو مولانا کے اس میں شامل ہونے کے بعد نکلا۔ اس تحریک میں ہندوؤں
اور مسلمانوں کی طاقت کے یکجا بہم ہو جانے سے انگریزوں کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اب
اس ملک میں ان کا بنے رہنا زیادہ دن ممکن نہیں ہے۔

۱۹۲۱ء کی تحریک عدم تعاون کے بعد کاؤنسل میں داخلے کے سوال پر کانگریس میں
پیدا ہونے والے اندرونی اختلاف رائے کے وقت صرف مولانا آزاد ہی ایک ایسے شخص
تھے، جنھیں دونوں فریقوں میں یکساں طور سے احترام و اعتماد حاصل تھا۔ جس طرح ۱۹۰۶ء
میں دادا بھائی نوروزی کو کانگریس کا صدر بنائے جانے پر کانگریس کی پھوٹ کو روک دیا گیا
تھا، اسی طرح ۱۹۲۳ء میں مولانا آزاد کو کانگریس کے اجلاس کا صدر بنائے جانے سے ہی
کانگریس کی پھوٹ کو ابتدائی دور میں ختم کرنا ممکن ہو سکا تھا۔ اپنی اہلیت و قابلیت سے انھوں
نے ایک سنگین بحران کو ہمیشہ کے لیے ٹال کر کانگریس اور عوام کے اندر جد و جہد آزادی کے
لیے یقین و اعتماد نیز حوصلہ و اُمنگ کی نئی روح پھونکی تھی۔

گاندھیائی عہد (۱۹۲۱ء تا ۱۹۴۷ء) کی پہلی دہائی میں ہندوستانی سیاست اور سماج
کی ترقی کو سب سے زیادہ ضرر پہنچانے والی فرقہ وارانہ کشمکش کے دور میں مولانا آزاد ایک
غیر جانبدار رہنما اور مصلح کی شکل میں سامنے آئے تھے۔ انھوں نے سوامی وویکانند، سوامی
دیانند کی طرح مذہب اور قوم پرستی کے درمیان ربط قائم کیا تھا اور خلافت اجلاس کے مذہبی
اسٹیج سے دیگر مواقع پر فرقہ وارانہ اتحاد کی تشہیر و تبلیغ کی تھی اور اسے ملک کی سیاسی آزادی
کے حصول کے لیے ضروری قرار دیا تھا۔ اگر مہاتما گاندھی ''اُپواس'' کے ذریعہ لوگوں کو اتحاد
کے لیے پابند عہد ہونے کی ترغیب دے رہے تھے تو مولانا آزاد خلافت اجلاس و دیگر مذہبی
پلیٹ فارم سے یہ کوشش کر رہے تھے کہ آپسی کشمکش کی جگہ پر باہمی معاہدہ اور دوستی کا جذبہ
پیدا کیا جائے۔ آگرہ، کلکتہ، ناگپور اور ڈھاکہ کے فسادات کو ختم کرانے اور ملک میں گھوم کر
اتحاد و اتفاق کی تبلیغ کرنے میں انھوں نے جو کردار نبھایا تھا وہ ناقابل فراموش ہے۔ انھوں
نے اپنے اخبار ''الہلال'' کے توسط سے ۱۹۲۷ء میں فرقہ وارانہ اتحاد پیدا کرنے والے
مضامین لکھ کر اپنی بیباکی، غیر جانبداری اور قومی یکجہتی کے دلی جذبات و احساسات کا تعارف

پیش کیا تھا۔

سائمن کمیشن کے ہندوستان آنے پر مولانا آزاد نے اس کے خلاف ہڑتالوں کا
انعقاد اور کمیشن مخالف مظاہروں کی تنظیم کے لیے بہت ہی اُمنگ و حوصلے نیز خلوص کے
ساتھ کام کیا تھا۔ کمیشن کے جواب میں ہندوستانیوں نے موتی لال نہرو کی صدارت میں جو
کمیٹی ہندوستان کی دستور سازی کے لیے بنائی تھی، مولانا نے اس کے فیصلوں کو مسلمانوں
سے تسلیم کرانے کے لیے اپنی ساری قوت و طاقت صرف کر دی تھی۔ انھوں نے بنگال کے
کئی مسلم لیڈروں کی ایک بیٹھک بلا کر ان لوگوں کو ''نہرو رپورٹ'' کے حق میں ہموار کیا اور
بعد میں لکھنؤ کے کل جماعتی اجلاس میں اس رپورٹ کی تائید کی۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی
جیسے مسلم رہنما اس رپورٹ کی حمایت کرتے رہے۔ بعد میں اسی رپورٹ کو کل جماعتی اجلاس
منعقدہ اگست ۱۹۲۸ء، لکھنؤ نے منظور کیا اور اس کی بنیاد پر کلکتہ کانگریس (دسمبر ۱۹۲۸ء) نے
اسے اپنی منظوری عطا کی تھی۔

مہاتما گاندھی کے ذریعہ مارچ ۱۹۳۰ء میں ڈانڈی کوچ سے شروع کی گئی سول
نافرمانی کی تحریک کے لیے مولانا آزاد نے عوام کا عزم و حوصلہ بڑھانے کی غرض سے ملک
کے کچھ شہروں کا دورہ کیا تھا اور بعد میں ضرورت پڑنے پر اس تحریک کے ڈکٹیٹر کی ذمہ داری
سنبھال کر اسے نہایت ہی کامیابی کے ساتھ جاری و ساری رکھا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں دوبارہ
شروع کی گئی سول نافرمانی تحریک میں بھی انھوں نے اس کے ڈکٹیٹر کا عہدہ سنبھال کر کچھ
دنوں تک تحریک کا انتظام و انصرام اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔ ۱۹۳۲ء کے فرقہ پرستانہ فیصلے کو
انھوں نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ ۱۹۳۵ء کے حکومت ہند ایکٹ کی بنیاد پر ۱۹۳۷ء میں جب ملک
کے صوبوں میں جواب دہ سرکاروں کی تشکیل کی گئی تھی تو مولانا آزاد نے صوبۂ متحدہ آسام،
صوبہ سرحد اور بہار کے سرکاروں کی تشکیل نیز ان کے انتظامی امور سے متعلق مسائل کے حل
میں اہم کردار نبھایا تھا۔ متحدہ صوبے کی حکومت سازی و بہار کے کسان، زمیندار، سرکار
تعلقات کو قطعی شکل دینے میں بھی ان کا خاص ہاتھ تھا۔ اس دوران مسلم لیگ کی اُبھرتی ہوئی
طاقت پر روک لگانے کے لیے بھی انھوں نے اپنی کوئی کوشش باقی نہیں رکھی تھی۔ اس کے
لیے وہ صرف کانگریس ہی نہیں بلکہ دیگر سیاسی جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے میں بھی تامل
نہیں کرتے تھے اور نہ اس میں کوئی برائی دیکھتے تھے۔ لیگ کے اثرات کم کرنے اور کانگریس

کا اثر عوام، خاص کر مسلمانوں میں بڑھانے کے لیے وہ لگاتار کوشاں رہے تھے۔

مولانا ہر اچھے خیال کو قبول کر لیتے تھے۔ اس میں ان کا نقطۂ نظر ملکی مفاد سے وابستہ رہتا تھا جیسے کہ انھوں نے مدھیہ پردیش میں تعلیمی اداروں سے متعلقہ منصوبوں کو منظور کیا تھا، جب کہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر لیگ کے ذریعہ اس کی مخالفت کی جا رہی تھی۔ وہ ملکی مفاد کے پیش نظر ہی یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں، دونوں کی سماجی خصوصیات الگ الگ بنی رہنی چاہیے۔ اسی لیے انھوں نے ہندی کا دیوناگری رسم الخط اور اردو (بخط فارسی) دونوں کو بنائے رکھنے نیز استعمال میں لائے جانے پر زور دیا تھا۔

۱۹۳۷ء کی جوابدہ حکومتوں سے مشورہ لیے بغیر حکومت برطانیہ کے ذریعہ ہندوستان کو جنگ میں جھونک دینے پر مولانا آزاد چاہتے تھے کہ ہندوستان انگریزی حکومت کا جنگ میں ساتھ دینے کے بدلے میں اپنے لیے حصول آزادی کا مطالبہ کرے اور اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اس معاملے میں وہ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو دونوں سے ہی متفق نہیں تھے، اور ان کے اس خیال کی مخالفت کرتے تھے کہ برطانیہ پر اس وقت کوئی دباؤ ڈالنا اچھا نہیں ہوگا۔ ۱۹۴۰ء میں صدر کانگریس کے عہدے پر منتخب کیے جانے کے بعد انھوں نے پوری قوت و طاقت کے ساتھ برطانیہ کی مجبوری کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ انگریزوں کے خلاف تشدد آمیز طریقوں کا سہارا لینے میں بھی چوکنا نہیں چاہیے۔ اس کے باوجود وہ سب کے ساتھ مل کر چلنے کو ترجیح دیتے تھے اور اس کے لیے اپنے نظریات ترک بھی کر سکتے تھے جیسا کہ انھوں نے اگست ۱۹۴۲ء میں کانگریس اعلیٰ کمیٹی کے ذریعہ عدم تشدد پر مبنی تحریک چلانے کا فیصلہ لیے جانے پر پوری طرح اس کا ساتھ دیا تھا اور پُرتشدد تحریک کا اپنا خیال پھر کبھی بھی اپنی زبان پر نہیں لایا تھا۔ اگست ۱۹۴۲ء کے انقلاب میں طویل مدت تک قید میں رہ کر بھی وہ متزلزل نہ ہوئے اور انھوں نے کانگریس اور اس کے اصولوں کے تئیں اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔ لارڈ ویول کی دعوت پر ۱۹۴۵ء میں قید سے رہائی کے بعد انھوں نے شملہ اجلاس میں کانگریس پارٹی کی قیادت کی تھی۔ شملہ میں بھی مولانا نے اپنی جماعتی وفاداری، قومی مفاد کی فکر اور غیر متعصبانہ خیالات و نظریات کا ثبوت پیش کیا تھا نیز وہ کانگریس کے قوم پرستانہ مزاج کو ثابت کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ ان کی کوششوں سے ہی ملکی و بین الاقوامی سطح پر کانگریس کے مفاد میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔

انھوں نے اپنی عقلمندی اور بصیرت کے بل بوتے پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ کانگریس قومی مفاد نیز انسانی و اخلاقی اقدار کی حفاظت کے لیے سیاسی منچ پر کام کر رہی ہے جب کہ مسلم لیگ کا مقصد صرف فرقہ وارانہ جذبات سے لبریز لوگوں کی خود غرضی و مطلب پرستی اور انگریزوں کے قوت و اقتدار کو مضبوط کرنا ہے۔ وہ کانگریس کی طرح ہندوستان کی آزادی کے لیے نہیں لڑ رہی ہے۔ انھوں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ کانگریس کا مقصد ہندوستان کی مکمل آزادی کو حاصل کرنا تھا اور وہ آزادی ہندو مسلم دونوں کے لیے حاصل کی جا رہی تھی، جب کہ لیگ پاکستان کی مانگ اٹھا کر یہ ثابت کر رہی تھی کہ وہ صرف مسلمانوں کے لیے ہی آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے، اور اگر اس کے لیے ملک کے ٹکڑے بھی کرنے پڑیں تو وہ تیار ہے۔ لیگ کے ذریعہ فرقہ وارانہ بنیاد پر ہی کوئی سمجھوتہ کرنے کی ضد کی وجہ کر شملہ اجلاس ناکام ہو گیا۔ مولانا آزاد اس اجلاس میں جھکنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ انھوں نے لیگ و کانگریس کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کی بھی کوشش کی لیکن انگریزی سیاست اور لیگی قائد جناح کی موقع پرستی کی وجہ کر وہ کامیاب نہیں ہو سکے (۱)۔

۱۹۴۶ء میں برٹش سرکار کے ذریعہ کیبنٹ مشن کو ہندوستان بھیجنے سے ہندوستانی سیاست کے مسئلے کے حل کی نئی شروعات ہوئی تھی۔ اس مشن کے ساتھ ہونے والی بات چیت میں مولانا آزاد نے کانگریس کی نمائندگی کی تھی۔ انھوں نے کیبنٹ مشن کو یہ سمجھایا تھا کہ ہندوستان کے لیے مکمل آزادی سے کم کچھ بھی منظور نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ پاکستان کی تشکیل ہندوستانی مسائل کا حل نہیں ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ ہندوستان کو ایک رکھتے ہوئے صوبائی حکومتوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دے کر سارے مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔ کیبنٹ مشن نے ان کی بات منظور کر لی تھی۔ اور اپنی طرف سے تقریباً ویسا ہی منصوبہ پیش کیا تھا، لیکن لیگ کے ذریعہ فرقہ وارانہ بنیاد پر لیگ و کانگریس کو نمائندگی دیے جانے کا مطالبہ کرنے پر سارا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا (۲)۔ مولانا نے بھی فرقہ وارانہ بنیاد پر کوئی منصوبہ منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ لیگ کے مطالبات منظور نہ کیے جانے سے لیگی لیڈران رنجیدہ ہو گئے، لہٰذا انھوں نے سیدھی کارروائی کے نام پر خون خرابے کا راستہ اپنا لیا۔ مولانا آزاد نے لیگ کی اس کارروائی کی مذمت کی تھی۔ اسے غیر اسلامی حرکت قرار دینے والے واحد ہندوستانی مسلم رہنما تھے۔

مولانا آزاد ۱۹۴۶ء میں کانگریس کے عہدۂ صدارت سے آزاد ہو گئے تھے۔ ان کی جگہ پر پنڈت جواہر لال نہرو صدر کانگریس منتخب ہوئے۔ صدر کانگریس نہ رہنے پر بھی مولانا ہندوستان کی آزادی اور اس کی سالمیت کے تئیں بیدار و خبردار تھے۔ وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی آمد کے بعد کانگریس و لیگ کے درمیان سمجھوتہ کرانے اور ہندوستان کو آزادی دلانے کی نئی کوشش کی گئی تھی۔ جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن ملک کو تقسیم کرنے یا نہ کرنے پر غور کر رہے تھے تب بھی مولانا آزاد نے ان سے مل کر یہ کہا تھا کہ ملک کا بٹوارہ ملک کے لیے سنگین مسائل پیدا کرے گا۔ لہٰذا تقسیم کو روکنا ہی بہتر ہوگا، لیکن مولانا آزاد کی یہ کوشش بھی ناکام ہوگئی۔ انھوں نے مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کو بٹوارہ قبول نہ کرنے کے حق میں متعدد مرتبہ اپنے نظریات و خیالات سے آگاہی بخشی تھی۔ گاندھی جی خود بھی بٹوارہ قبول کرنے کے حق میں نہیں تھے، لیکن جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، گووند ولبھ پنت جیسے لیڈروں کے سامنے اپنی بات منوانے سے قاصر رہے اور کانگریس کی کثرت آراء کے آگے انھوں نے بھی گاندھی جی کی طرح اپنے ہتھیار ڈال دیے۔ کانگریس مجلس عاملہ و مجلس اعلیٰ میں انھوں نے کثرت رائے کے ساتھ مل کر تقسیم کی مخالفت نہیں کی تھی، گرچہ وہ کبھی دل سے تقسیم کو قبول نہیں کر سکے۔

اس طرح مولانا آزاد کی قوم پرستانہ سرگرمیوں کے ابتدائی دور میں کی گئی مسلح انقلابی کوششوں کی حمایت سے لے کر آزادئ ہند کے اعلان تک یہ دکھائی دیتا ہے کہ مولانا آزاد شروع سے آخر تک قوم پرست تھے، جن کا قلب ہندو مسلم جذبۂ اخوت سے لبریز تھا اور جو فرقہ وارانہ منافرت نیز آپسی بغض و عناد مٹانے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ قومی کاموں کے لیے مذہب اور سیاست کو ساتھ لے کر چلنے کی اپنی منفرد خوبیوں کی وجہ کر ہی انھوں نے تحریک عدم تعاون اور خلافت تحریک کو ایک ساتھ ملانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اپنی غیر جانبداری اور عقلمندی سے انھوں نے ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے خاتمے کو روکا تھا۔ انھوں نے کانگریس مجلس عاملہ میں اس کی تشکیل کے وقت سے ہی اپنا مقام بنالیا تھا اور اس کے صدر کی حیثیت سے بھی دو مرتبہ کانگریس کی خدمت کرتے ہوئے کئی اہم مواقع پر ملک و قوم کو نئی جہت عطا کی تھی۔ جنگ آزادی کے دوران تقریباً ساڑھے دس سال کا طویل عرصہ انھوں نے انگریزی حکومت کی جیلوں میں گزارا تھا (۳)۔ مطلب یہ ہے کہ ۱۹۴۲ء

تک کی زندگی کے ۵۹ برسوں میں وہ ہر چھ دن میں ایک دن سے کچھ زیادہ جیل میں رہے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں جیل سے رہا ہو کر انھوں نے لارڈ ویول کے ساتھ گفتگو میں کانگریس کی نمائندگی کی تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے مل کر بھی اس بات کی پوری کوشش کی تھی کہ ملک کی تقسیم نہ ہو۔

اس ساری مدت میں انھوں نے ایک کٹر مذہبی مسلمان ہوتے ہوئے بھی کبھی مذہب کی کوری تقلید یا مذہبی جانبداری کا رویہ اختیار نہیں کیا گرچہ کانگریس کے اندر ہی ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو انھیں مسلم پرست یا مسلمانوں کا حمایتی مانتا تھا نیز مکمل وطن پرست تسلیم نہیں کرتا تھا۔ دوسری جانب لیگ والے انھیں پوری طرح کافر اور مسلم مخالف نیز ہندوؤں کا حمایتی مانتے تھے (۴)۔ اگر ہم غیر جانبدارانہ طور پر غور کریں تو اس بات سے پتہ لگتا ہے کہ وہ پوری طرح غیر جانبدار اور درمیانی راہ اپنانے والے مسافر تھے اور کسی بھی فریق کے حق میں نامناسب اور غیر عادلانہ جھکاؤ نہیں رکھتے تھے۔ ان کی وطن پرستی کی وجہ کر ہی مختلف قسم کے لوگ ان سے اپنی کوئی ذاتی غرض یا مقصد پورا نہیں کرا سکے تھے اور ان کی تنقید کرتے تھے۔ غیر جانبدار آدمی کی تنقید ہمیشہ ہی ہر میدان میں کی جاتی ہے۔

آخر میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد پوری طرح ایک قوم پرست، کانگریس کے باعمل، وفادار اور قوی و بااثر کارکن تھے۔ کارکن اور قائد دونوں ہی حیثیت سے انھوں نے کانگریس کے ہر پروگرام، ہر تحریک اور ہر فیصلے کو حتی المقدور متاثر کیا تھا۔ سر سریندر ناتھ بنرجی، مہاتما گاندھی، لالہ لاجپت رائے، موتی لال نہرو، دیش بندھو چترنجن داس، سبھاش چندر بوس، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر راجندر پرساد، سردار ولبھ بھائی پٹیل جیسے قومی لیڈروں کی اگلی صف میں ان کا اپنا ایک مخصوص اور باعزت و پُروقار مقام تھا اور رہے گا۔ مکمل قومی تحریک میں ان کا تعاون لاثانی و غیر معمولی تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی تحریک آزادی میں مہاتما گاندھی تحریک کے محرک تھے تو مولانا آزاد تحریک کے اعلیٰ قائد کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کر کے تحریک میں ایک ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلانے کا بیڑا نہ اٹھایا ہوتا تو شاید ہماری تحریک آزادی کی شکل کچھ اور ہی ہوتی۔

*****

حواشی

۱- آزاد کی پیدائش سے آزادی تک

(۱) پنڈت سندر لال، بھارت میں انگریزی راج، حصہ دوم، ص ۹۹۰۔

(۲) گرومکھ نہال سنگھ، لینڈ مارک اِن انڈین کانسٹی ٹیوشنل اینڈ نیشنل ڈیولپمنٹ، حصہ اوّل، ص ۱۰۴۔ تجویز پیش کرنے والوں نے اُمید ظاہر کی تھی کہ تجویز مقامی انتظامیہ کو ترقی یافتہ نیز میونسپل اداروں کو مزید طاقتور ہونے کے مواقع فراہم کرے گی۔ ص ۲۰۷۔

(۳) پنڈت سندر لال، م.ب.ک، ص ۹۸۱۔

(۴) منمتھ ناتھ گپت ''راشٹریہ آندولن کا اتہاس''، ص ۹۴۔ آئی.سی.ایس میں جانے والے ہندوستانیوں کی لمبائی آٹھ فٹ چھ انچ لازمی تھی۔ اس کا امتحان صرف انگلینڈ میں لیا جانا طے کیا گیا تھا۔ دادا بھائی نوروزی نے ایسی پابندیوں کی سخت مخالفت کی تھی۔ سی. وائی چنتامنی، انڈین پالی ٹکس سِنس دی میوٹنی، ص ۲۷۔

(۵) وِپن چندر، ماڈرن انڈیا، ص ۲۰۵۔

(۶) سی. وائی چنتامنی، م.ب.ک، ص ۲۳۔

(۷) ایضاً۔ منمتھ ناتھ گپت، م.ب.ک، ص ۱۳۸۔ ۲۴ر فروری کو سول سروس کے امتحان دہندگان کی عمر گھٹا کر ۲۳ سال سے ۱۹ سال کر دی گئی تھی۔ اس کی مخالفت میں انڈین ایسوسی ایشن نے بیرسٹر لال موہن گھوش کو اپنا نمائندہ بنا کر انگلینڈ بھیجا تھا، جس کا اثر پڑا۔ سی. وائی چنتامنی، م.ب.ک، ص ۲۸-۲۹، منمتھ ناتھ گپت، م.ب.ک، ص ۱۴۹-۱۵۰۔

(۸) منمتھ ناتھ گپت، م.ب.ک، ص ۱۴۵۔

(۹) پٹا بھی سیتا رمیا، کانگریس کا اتہاس، حصہ اوّل، ص ۹۔

(۱۰) منمتھ ناتھ گپت، م.ب.ک، ص ۱۵۲-۵۳، شری بہاری لال کے دوست اور بنگال کے مجسٹریٹ مسٹر رمیش چندر دت نے ان سے کہا تھا کہ میں اپنی عدالت میں گوروں کا مقدمہ نہیں سن سکتا لیکن میرے نیچے کے گورے مجسٹریٹوں کو یہ حق حاصل ہے۔ تب شری گپتا نے یہ کوشش کی تھی۔

(۱۱) اس سے قبل ۱۸۴۹ء میں اس وقت کے وائسرا کے قانونی سکریٹری (معتمد) جان ایلیٹ ڈرنک واٹر نے ایک قانون کا خاکہ تیار کیا تھا کہ کلکتے کے باہر کی فوجداری عدالتوں میں گوروں پر مقدمہ چل سکے گا۔ گوروں کے ذریعہ اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے سے سرکار کی ہمت پست ہوگئی اور یہ قانون نہیں بنا۔ ایضاً، ص ۱۸۸-۱۹۔

(۱۲) پٹا بھی سیتا رمیا، کانگریس کا اتہاس، حصہ اوّل، ص ۹، منمتھ ناتھ گپت، م.ب.ک، ص ۱۶۰۔ مسٹر بنرجی کو ۱۸۷۷ء کا دلی دربار دیکھ کر اس کی تحریک ملی تھی۔

(۱۳) پٹا بھی سیتا رمیا، م.ب.ک، ص ۹

(۱۴) لارڈ ڈفرن نے مسٹر ہیوم سے کہا تھا کہ انگریز جانتے ہی نہیں کہ لوگ ان کے اور ان کی پالیسیوں کے بارے میں کیا خیال رکھتے ہیں۔ اس لیے ایسی حالت میں یہ اچھا ہوگا اور اس میں حاکم ومحکوم دونوں کی بھلائی ہے کہ یہاں کے سیاست داں ہر سال اپنا اجلاس منعقد کیا کریں اور سرکار کو بتایا کریں کہ حکومت میں کیا خامیاں ہیں اور اس میں کیا سُدھار کیے جائیں۔ لارڈ ڈفرن نے اس مشورے کے بارے میں مسٹر ہیوم سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ جب تک لارڈ ڈفرن ہندوستان میں رہیں تب تک اس سلسلے میں کہیں ان کا نام نہ لیا جائے۔ ایضاً، م.ب.ک، ص ۱۳، ۱۴، منمتھ ناتھ گپت، م.ب.ک، ص ۱۶۸۔

(۱۵) کانگریس کے ۱۸۸۵ء کے اجلاس میں مدراس کے ڈپٹی کلکٹر اور پونا کے ''اسمال کوز کورٹ'' کے جج موجود تھے۔ ۱۸۸۶ء میں اس وقت کے وائسرائے لارڈ ڈفرن نے کلکتہ اجلاس میں اور ۱۸۸۷ء میں مدراس اجلاس میں مدراس کے گورنر نے کانگریس کا استقبال کیا تھا۔ ۱۸۸۸ء میں مسٹر جارج ویول نے اور ۱۸۸۹ء میں سرولیم بیڈرون نے کانگریس کی صدارت کی تھی۔ پٹا بھی سیتا رمیا، م.ب.ک، ص ۱۵-۱۷۔ منمتھ ناتھ گپت، م.ب.ک، ص ۲۰-۱۷۱۔

(۱۶) کانگریس کا چوتھا اجلاس ۱۸۸۸ء میں الٰہ آباد میں ہوا تھا۔ یوپی کے گورنر سر آکلینڈ کالون نے جلسہ گاہ کے سلسلے میں رُکاوٹ ڈالی تب کانگریس مجلس استقبالیہ کے صدر پنڈت ایودھیا ناتھ کے ایک مکان میں اجلاس منعقد کیا گیا۔ مسٹر کالون نے ایک دستی خط کے ذریعہ سرکاری ملازمین کو کانگریس میں شریک نہ ہونے کی ہدایتیں بھی دیں۔ اجلاس میں شامل ہونے والے نمائندگان سے بیس ہزار روپیوں کے مچلکے لیے گئے۔ (منمتھ ناتھ گپت، م. ب. ک، ص ۱۹۶)۔ ۱۸۹۰ء میں بنگال سرکار نے ایک گشتی خط کے ذریعہ سبھی گورنروں اور اعلیٰ افسران کو ہدایت تھی کہ حسب حکم حکومتِ ہند ایسے اجلاس میں بطور ناظرین بھی سرکاری افسران کا جانا ٹھیک نہیں ہے نیز اس میں حصہ لینے سے منع کیا جاتا ہے۔ (پٹا بھی سیتا رمیا، م. ب. ک، ص ۶۳-۶۴)۔

(۱۷) ۵-۱۹۰۴ء میں ایشیائی ملک جاپان نے پورٹ آرتھر کی لڑائی میں روس کو شکست دے کر کالے لوگوں کے ذہن و دماغ سے گوروں کی غیر مفتوح طاقت کا خوف مٹا دیا تھا۔

(۱۸) انتہا پسندی کو بڑھاوا دے کر سورت میں کانگریس کے اندر پھوٹ ڈلوانے کے پیچھے مہارشی اروند کا بڑا ہاتھ تھا۔ شیو پرساد سنگھ، اتریوگی شری اروند اور جیون درشن، ص ۱۶۰۔

(۱۹) ہندوستانی انقلاب سے سبق ملتا ہے ... ہندوستانی، ہندو مسلمان ہمارے خلاف متحد ہو کر انقلاب برپا کر سکتے ہیں ... انقلاب نے یاد کرا دیا ہے کہ ہمارا اقتدار ایک پتلی پرت پر ٹکا ہے اور اصلاح معاشرہ و مذہبی انقلاب کے دھماکوں سے یہ پرت کسی بھی وقت تباہ ہو سکتی ہے۔ بی. ڈی. ساورکر، ۱۸۵۷ء کا بھارتی سوتنترتا سمر، ص ۴۸۴ پر فارسٹ کی کتاب ''ریئل ڈینجر ان انڈیا'' کے دیباچے سے ماخوذ۔

(۲۰) ڈاکٹر راجندر پرساد کھنڈت بھارت، ص ۱۴۷ پر درج، لارڈ ایلین برا نے ۱۸/ جون ۱۸۴۳ء کو ڈیوک آف ویلنگٹن کو لکھے ایک خط میں متذکرہ بالا خیال ظاہر کیا تھا۔ اسٹڈیز ان ہسٹری، ریسرچ پبلی کیشن ان سوشل سائنسز، ص ۲۷۔

(۲۱) اسٹڈیز ان ہسٹری، ص ۲۷۔

(۲۲) ڈاکٹر راجندر پرساد، م. ب. ک، ص ۱۴۷۔

(۲۳) رام گوپال، انڈین مسلم: اے پولیٹیکل ہسٹری، ص ۴۴۔

(۲۴) اسٹڈیز ان ہسٹری، ص ۵۷۔

(۲۵) ایک موقع پر انھوں نے لاہور میں کہا تھا کہ لفظِ ''قومی'' میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ ڈاکٹر راجندر پرساد، کھنڈت بھارت، ص ۱۲۴۔

(۲۶) وہ لفظ ''ہندو'' کو ہندوستان میں رہنے والے ہر شخص کا نام مانتے تھے اور اس مفہوم میں خود کو ''ہندو'' قبول کرتے تھے۔ ایضاً، ص ۱۵۳۔

(۲۷) ڈاکٹر عابد حسین، ڈیسٹینی آف انڈین مسلمس، ص ۳۴۔

(۲۸) مسٹر بیک نے ہندوستان آنے سے قبل کی شام کو ایک بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ پارلیمانی نظام میں مسلمان ہندوؤں سے پیچھے رہ جائیں گے۔ وہ ہندو کثرت رائے کے تحت ہوں گے، جس کی مسلمان مخالفت کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آسانی سے ہندوؤں کی بات نہیں مانیں گے۔ محمد نعمان، ''مسلم انڈیا''، ص ۵۲۔

(۲۹) ڈاکٹر راجندر پرساد، م. ب. ک، ص ۱۵۶۔

(۳۰) ۱۸۸۵ء میں کانگریس کے ۷۰ نمائندوں میں دو مسلمان تھے۔ ۱۸۸۶ء میں ۴۳۱ نمائندوں میں مسلمانوں کی تعداد ۳۳ تھی۔

(۳۱) ڈاکٹر راجندر پرساد، م. ب. ک، ص ۶۳۔

(۳۲) یہ فتویٰ ۱۸۸۸ء کے مارچ و اگست کے درمیان جاری کیا تھا۔ اس پر لدھیانہ، جالندھر، ہوشیارپور، کپورتھلہ، امرتسر، گجرات، جونپور، فیروزپور، قصور، مظفرنگر، دلّی، رامپور، بریلی، مرادآباد کے مذہبی رہنماؤں اور مدینہ منورہ و بغداد کے خلفا کے دستخط تھے۔ بعد میں جناب بدرالدین طیب جی، علی محمد بھیم جی و رحمت اللہ سیانی کی قیادت میں بمبئی اور مدراس کے مسلمانوں نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔ ایضاً، ص ۱۵۹۔

(۳۳) رام گوپال، م. ب. ک، ص ۶۷، اس کے مقاصد اس طرح تھے:

(الف) اخبارات و رسائل کے توسط سے انگلینڈ کے ممبران پارلیمنٹ وعوام کو یہ بتانا کہ ہندوستان کی سبھی قومیں، رئیس اور زمیندار کانگریس میں شامل نہیں ہیں۔

(ب) ہندوؤں اور مسلمانوں کے کانگریس مخالف اداروں کے خیالات سے انھیں مطلع کرنا۔

(ج) ہندوستان میں نظم امن و امان نیز حکومت برطانیہ کے استحکام کے لیے کوشش کرنا اور کانگریس کے نظریات کو لوگوں کے دلوں سے دور کرنا۔ شیخ الہند

مولانا حسین احمد، مسلم لیگ کیا ہے؟، ص ۳۰۔ ڈاکٹر راجندر پرساد، م. ب. ک، ص ۱۵۹-۶۰۔

(۳۴) مسٹر تھیوڈور بیک وعلی گڑھ کالج کے طلبا دلی جاکر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور ہر نماز پڑھنے آنے والوں سے کہا کہ ہندو گئوکشی بند کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خلاف سرکار کو خط بھیجا جا رہا ہے۔ اس طرح لوگوں سے دستخط کرائے گئے۔ ڈاکٹر راجندر پرساد، م. ب. ک، ص ۱۶۱ پر طفیل احمد کی کتاب ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' سے ماخوذ۔

(۳۵) مسٹر جی. ایس. چھابڑا، ایڈوانس اسٹڈی ان دی ہسٹری آف ماڈرن انڈیا، حصہ دوم، ص ۴۰۳۔

(۳۶) رام گوپال، م. ب. ک، ص ۷۱-۷۲۔

(۳۷) ''الہلال''، ۱۰ر ستمبر ۱۹۱۳ء

(۳۸) ڈاکٹر راجندر پرساد، کھنڈت بھارت، ص ۱۷۶۔

(۳۹) لال بہادر، ''دی مسلم لیگ: اِٹس ہسٹری، ایکٹی وٹیز اینڈ اچیومنٹس، ص ۴۳، منمتھ ناتھ گپت، م. ب. ک، ص ۲۵۲۔

(۴۰) رام گوپال، م. ب. ک، ص ۹۶۔

(۴۱) ۱۸۷۸ء کا معاہدہ برلن بلغاریہ، مانٹی نیگرو ترکی کے اقتدار سے آزاد کرائے گئے تھے۔ انگلینڈ نے سائپرس کا علاقہ ترکی سے اپنے لیے حاصل کر لیا تھا۔ یہ معاہدہ کرانے میں انگلینڈ کا بڑا ہاتھ تھا۔ جواہر لال نہرو، وشو اتہاس کی جھلک، حصہ دوم، ص ۸۸۳۔

(۴۲) دسمبر ۱۹۰۷ء میں ''ینگ ٹرکس'' کے ایک اجلاس کے نتیجے میں پارلیمنٹ کے قیام کو بھی ان کے پروگرام کا ایک حصہ مان لیا گیا تھا۔ دی ورلڈس گریٹ ایونٹس، حصہ ہشتم، ص ۲۳۶ - ۲۳۷۔

(۴۳) ڈاکٹر راجندر پرساد، م. ب. ک، ص ۱۸۱۔ رام گوپال، م. ب. ک، ص ۱۲۲۔

(۴۴) بذات خود لارڈ کرزن نے ایسا سمجھانے کے لیے عوامی رابطے کے پیش نظر ۱۹۰۴ء میں مشرقی بنگال کا دورہ کیا تھا۔ رام گوپال، م. ب. ک، ص ۹۱۔

(۴۵) لارڈ منٹو نے تقسیم بنگال رد کیے جانے پر ہاؤس آف لارڈ میں کہا تھا کہ پہلے مسلمانوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ بٹوارہ دائمی ہے۔ اب اسے ختم کر کے سرکار نے مسلمانوں کو

دھوکا دیا ہے۔ ڈاکٹر سچن سین، ''برتھ آف پاکستان''، ص ۶۰۔

(۴۶) پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں کے ذریعہ ترکی کی مخالفت کیے جانے سے اس وقت کے ایک بڑے مذہبی رہنما مولانا شبلی نعمانی نے ۹ر اکتوبر ۱۹۱۷ء کو لکھنؤ کے مسلم گزٹ میں انگریزی پالیسی کی مذمت کرتے ہوئے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس سے پہلے وہ انگریزوں کے حمایتی تھے۔ ڈاکٹر راجندر پرساد، م. ب. ک، ص ۱۸۱۔

(۴۷) ''جہانِ اسلام'' کا کچھ حصہ اُردو میں چھپتا تھا اور وہ کلکتہ اور لاہور میں آتا تھا۔ رام گوپال، م. ب. ک، ص ۱۲۵۔

(۴۸) ڈاکٹر راجندر پرساد، م. ب. ک، ص ۱۸۱۔ گرمکھ نہال سنگھ، م. ب. ک، ص ۲۸۰۔

(۴۹) منمتھ ناتھ گپت، م. ب. ک، ص ۲۷۶۔

(۵۰) گرمکھ نہال سنگھ، م. ب. ک، ص ۲۹۲-۹۳۔

(۵۱) بمبئی میں دونوں میں طے ہوا تھا کہ ایک مشترکہ کمیٹی دونوں کے آئندہ پروگرام کا خاکہ تیار کرے۔ اس کمیٹی کی اکتوبر ۱۹۱۶ء کی کلکتہ کی سفارشوں کو لکھنؤ میں دونوں کے درمیان سمجھوتے کے طور پر منظور کیا گیا تھا۔ پٹا بھی سیتا رمیا، م. ب. ک، حصہ اوّل، ص ۱۰۵۔

(۵۲) گرمکھ نہال سنگھ، م. ب. ک، ص ۲۸۳۔

(۵۳) رام گوپال م. ب. ک، ص ۱۲۰۔

(۵۴) محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے تھیولوجی کے استاد مولانا سید سلیمان اشرف نے اس وقت کہا تھا کہ مسلمانوں نے اپنا گئوکشی کا بنیادی حق چھوڑ دیا اور یہ بھی صرف ہندوؤں کی دوستی بنائے رکھنے کے لیے۔ لال بہادر، م. ب. ک، ص ۱۱۵۔

(۵۵) ۲۶ر جولائی ۱۹۱۷ء کو مراد آباد میں ''ہوم رول'' کی حمایت میں منعقد ایک جلسے میں الہ آباد کے مسلم رہنما سید رضا علی، لکھنؤ کے ہندو لیڈر پنڈت رادھا کرشن کول اور مراد آباد کے محمود الحسن، معظم علی، عبدالسلام و شانتی پرساد آریہ وغیرہ ہندو اور مسلمان لیڈر شامل ہوئے تھے۔ ابھیودے، ۳ر اگست ۱۹۱۷ء۔

(۵۶) لال بہادر، م. ب. ک، ۱۱۷-۱۸۔

(۵۷) راجندر پرساد، م. ب. ک، ص ۱۸۵۔

(۵۸) ایضاً

(۵۹) یہ رپورٹ مارچ ۱۹۱۶ء میں ہی تیار ہو چکی تھی۔ لارڈ مانٹیگو کا نام بعد میں اس کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔ پٹا بھی سیتا رمیّا، م۔ ب۔ ک، ص ۱۱۴۔

(۶۰) لال بہادر، م۔ ب۔ ک، ص ۱۱۸۔

(۶۱) ایضاً، ص ۱۴۰۔

(۶۲) ۲۴؍فروری ۱۹۱۹ء کو آشرم میں تفصیلی مشورہ کے بعد قوانین کی نافرمانی کے عدم تشدد پر مبنی تحریک کے آغاز کا فیصلہ کیا گیا۔ مہادیو بھائی کی ڈائری، حصہ اوّل، ص ۳۴۴۔

(۶۳) پہلے اس کے لیے ۳۰؍مارچ طے ہوا تھا لیکن بعد میں ۶؍اپریل کر دیا گیا۔ پٹا بھی سیتا رمیّا، م۔ ب۔ ک، حصہ اوّل، ص ۱۳۰۔

(۶۴) راجندر پرساد، م۔ ب۔ ک، ص ۱۸۶۔

(۶۵) منمتھ ناتھ گپت، م۔ ب۔ ک، ص ۳۰۸۔

(۶۶) ایضاً، ص ۳۰۵۔

(۶۷) پٹا بھی سیتا رمیّا، م۔ ب۔ ک، حصہ اوّل، ص ۱۵۰۔

(۶۸) منمتھ ناتھ گپت، م۔ ب۔ ک، ص ۳۰۵۔

(۶۹) راجندر پرساد، م۔ ب۔ ک، ص ۱۸۷۔

(۷۰) ''دی ورلڈس گریٹ ایونٹس'' ۳۹-۱۹۱۴ء، حصہ نہم، ص ۲۰۳۔ بعد میں خود ترکی حکومت نے ہی ۱۹۲۴ء میں خلیفہ کا عہدہ ختم کر دیا۔

(۷۱) لال بہادر، م۔ ب۔ ک، ص ۱۴۱۔

(۷۲) رام گوپال م۔ ب۔ ک، ص ۱۳۸۔

(۷۳) ایضاً

(۷۴) راجندر پرساد، م۔ ب۔ ک، ص ۱۸۹۔

(۷۵) آزاد سبحانی، تحقیقاتِ حوادثِ مالا بار، ص ۲۵۔ رام گوپال م۔ ب۔ ک، ص ۱۵۷۔

(۷۶) مراد آباد، میرٹھ، اجمیر، الٰہ آباد، جبل پور، گونڈا، رائے بریلی، آگرہ، پانی پت، امرتسر، سہارنپور، دہلی، ناگپور، لاہور، لکھنؤ، بھاگلپور، شاہ جہاں پور، گلبرگہ، کوہاٹ، کاکی ناڑا کوئی جگہ فساد سے نہیں بچی تھی۔

(۷۷) رام گوپال م۔ ب۔ ک، ص ۱۶۶۔

(۷۸) ایضاً، ص ۱۶۷۔

(۷۹) راجندر پرساد، م۔ ب۔ ک، ص ۱۹۵۔

(۸۰) پٹا بھی سیتا رمیّا، م۔ ب۔ ک، حصہ اوّل، ص ۵۶-۱۵۵۔ ای۔ ایم۔ ایس۔ نمبودری پاد، گاندھی جی اور ان کا واد، ص ۵۸۔

(۸۱) ہیکٹر بولیو، ''جناح کریکٹر آف پاکستان'' ص ۹۳۔

(۸۲) مسٹر جناح اس کے افسوس میں پھوٹ پھوٹ کر روئے اور ہندو مسلم اتحاد کی ساری اُمید چھوڑ بیٹھے۔ ڈاکٹر عابد حسین، م۔ ب۔ ک، ص ۶۳۔

(۸۳) ہیکٹر بولیو، م۔ ب۔ ک، ص ۹۵۔

(۸۴) لال بہادر، م۔ ب۔ ک، ص ۲۲۶-۲۷۔

(۸۵) سر مارلیس گیئر و اپّا دورائی، اسپیچز اینڈ ڈاکیومنٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، حصہ اوّل، ص ۲۵۴۔

(۸۶) ہیکٹر بولیو، م۔ ب۔ ک، ص ۱۰۹۔

(۸۷) لال بہادر، م۔ ب۔ ک، ص ۲۶۶-۲۷۔

(۸۸) سر مارلیس گیئر واے۔ اپّا دورائی، م۔ ب۔ ک، حصہ اوّل، ۸۹-۳۸۶۔

(۸۹) متحدہ صوبہ مدراس، بہار، مدھیہ پردیس، اُڑیسہ، ان میں کانگریس کی واضح اکثریت تھی اور بمبئی، آسام و سرحدی صوبے میں کانگریس سب سے بڑی پارٹی تھی۔ بنگال، پنجاب وسندھ میں وہ اقلیت میں تھی۔ پٹا بھی سیتا رمیّا، م۔ ب۔ ک، حصہ دوم، ص ۴۰۔

(۹۰) ڈاکٹر راجندر پرساد، م۔ ب۔ ک، ص ۵۶-۲۵۴۔

(۹۱) صوبۂ متحدہ کے موجودہ گورنر ''سر ہیگ'' نے کانگریس کی بے قصوری و انصاف پسندی کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی حمایت کی تھی۔ پروفیسر کوپ لینڈ، انڈیا: اے ری ٹیرمنٹ، ص ۱۸۵۔ درگا داس، ''بھارت کرزن سے نہرو اور اس کے پشچات''، ص ۱۹۲۔

(۹۲) مشہور شاعر محمد اقبال لیگ کے سربراہ مسٹر جناح کی رہنمائی کر رہے تھے۔ وہ اس بٹوارے کے لیے زمین ہموار کر رہے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے لیگ کے اجلاس میں عہدۂ صدارت سے بولتے ہوئے ہندوستان کو ہندو اور مسلم دو حصوں میں بانٹنے کی تجویز رکھی تھی۔ چٹان، ۲۲-۴-۵۷ء ''دی کوارٹر ریویو آف ہسٹوریکل اسٹڈیز'' حصہ

یازدہم (۷۲-۱۹۷۱ء)، ص ۱۲۷-۳۰۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، حصہ ۱۷، ص ۳۸۔

(۹۳) ہیکٹر بولیو، م.ب.ک، ص ۱۲۹۔

(۹۴) لال بہادر، م.ب.ک، ص ۲۷۶۔

(۹۵) ڈاکٹر امبیدکر کی اس وقت شائع شدہ کتاب ''تھاٹس آن پاکستان'' نے اس نظریے کی تشہیر میں بڑی مدد کی۔ ایضاً، ص ۲۸۰۔

(۹۶) ڈاکٹر راجندر پرساد نے اپنی کتاب ''کھنڈت بھارت'' میں اُن کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔

(۹۷) ڈاکٹر راجندر پرساد، م.ب.ک، ص ۵۳۸۔

(۹۸) پٹا بھی سیتا رمیا، م.ب.ک، حصہ دوم، ص ۳۷۹۔

(۹۹) فارغ بخاری، باچا خاں، ص ۲۲۱۔

(۱۰۰) اس میں کانگریس کی طرف سے مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، خان عبدالغفار خاں، مولانا آزاد، راج گوپال آچاری و راجندر پرساد، لیگ کی جانب سے محمد علی جناح، لیاقت علی خاں، سہروردی، سردار نشتر، حسین عالم، غلام حسین اور سکھوں و اچھوتوں کا ایک ایک نمائندہ شامل ہوا۔

(۱۰۱) سر مارلیس گیئر اینڈ اے۔ اپا دورائی، م.ب.ک، حصہ دوم، ص ۶۹-۵۶۸۔

(۱۰۲) لیونارڈ موسلے، ''بھارت میں برٹش راج کے اَنتم دن'' ص ۹۔

(۱۰۳) سر مارلیس گیئر اینڈ اے۔ اپا دورائی، م.ب.ک، حصہ دوم، ص ۷۴-۵۷۲۔

(۱۰۴) مولانا ابوالکلام آزاد، آزادی کی کہانی، ص ۱۱۳۔

(۱۰۵) لیونارڈ موسلے، م.ب.ک، ص ۲۰۔

(۱۰۶) ایضاً، ص ۹۔

(۱۰۷) ایضاً، ص ۲۲۔

(۱۰۸) ایضاً، ص ۳۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد، م.ب.ک، ص ۱۹۳۔

(۱۰۹) لیونارڈ موسلے، م.ب.ک، ص ۳۶۔

(۱۱۰) پٹا بھی سیتا رمیا، کانگریس کا اتہاس، حصہ سوم، ص ۳۹۴۔

(۱۱۱) جانسن، مشن ود ماؤنٹ بیٹن، ص ۶۰۔

(۱۱۲) وی. پی. مینن، ''دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا''، ص ۳۶۵۔

(۱۱۳) لیونارڈ موسلے، م.ب.ک، ص ۱۰۸۔

۲- ابتدائی زندگی

(۱) ابوالکلام آزاد، تذکرہ، ص ۳۱۰۔ عبدالرزاق ملیح آبادی، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۱۶۷۔ علی جواد زیدی نے انوار ابوالکلام آزاد کے ص ۱۷۹ پر مولانا کی سال پیدائش ۱۸۸۷ء دیا ہے۔ ''شاہراہ''، آزاد نمبر، ۱۹۵۹ء میں سید شہید الدین نے مولانا آزاد کی سنہ پیدائش ۱۸۸۹ء مانا ہے۔ ہوم پالی ٹیکل: اے ۵۶-۴۵۵'' مئی ۱۹۱۶ء، ص ۳ کے مطابق ان کی پیدائش ۱۸۹۰ء میں کلکتہ میں ہوئی تھی لیکن ان میں سے کوئی بھی جانکاری قابل یقین نہیں لگتی۔ مولانا سے متعلق کسی بھی ہم عصر ذرائع سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔

(۲) ہمایوں کبیر نے ''مولانا آزاد اِسرتی گرنتھ'' کے ص ۷۹ پر ۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء کو مولانا کی تاریخ پیدائش بتائی ہے۔ اسی گرنتھ میں ص ۷۹ پر علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر محمد حبیب نے مولانا کے نومبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہونے کی تائید کی ہے لیکن دیگر کسی بھی ذرائع سے اس سن کا ثبوت نہیں ملتا۔ اسلامی کلینڈر کے مطابق بھی مولانا کی پیدائش کا مہینہ ستمبر پڑتا ہے۔ لہٰذا ہمایوں کبیر کی تاریخ کو صحیح مانا جانا چاہیے۔

(۳) ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں انگریزی مظالم کی وجہ کر شیخ خیرالدین اپنے نانا کے ساتھ ہندوستان سے مکہ چلے گئے تھے۔ ابوالکلام آزاد، ''آزادی کی کہانی'' ص ۱۔

(۴) مولانا ابوالکلام آزاد، م.ب.ک، ص ۳۳۰۔ اے. پی. سین (مدیر) ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی، حصہ اوّل، ص ۹۲۔ مسلمانوں میں کچھ لوگ اپنے بچوں کا نام اس طرح رکھتے ہیں کہ نام کے حروف کے نمبرات جوڑنے پر بچے کا سن پیدائش نکل آتا ہے۔ فیروز بخت نام میں آئے ہوئے اُردو حروف تہجی کا کل جوڑ ۱۳۰۵ ہوتا ہے۔ اسی طرح سے مولانا کی سن پیدائش ان کے ذریعہ تذکرہ میں ص ۳۲۰ پر دیے گئے پیدائش کا ہجری سن نکالنے والے جملے ''جواں بخت و جواں طالع جواں باد'' کے نمبرات کا میزان نکالنے سے بھی ۱۳۰۵ ہی بیٹھتا ہے۔

(۵) ابوالکلام آزاد، م. ب. ک، ص ۳۱۲۔

(۶) مولانا ابوالکلام آزاد، آزادی کی کہانی، ص ۔ فاطمہ بیگم (مولانا کی بہن) آجکل، ستمبر ۱۹۵۹ء، ایشیا ویکلی، ۳؍ مارچ ۱۹۶۱ء۔ مہادیو دیسائی نے اپنی کتاب مولانا آزاد میں صفحہ ۱۲ پر لکھا ہے کہ وہ ۱۸۹۸ء میں دس سال کی عمر میں ہندوستان آئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر حبیب نے آزاد اِمرتی گرنتھ میں ص ۷۹ پر یہی بات لکھی ہے۔ سید شہید الدین بھی یہی مانتے ہیں کہ وہ دس سال کی عمر تک مکہ میں رہے۔ ''شاہراہ''، آزاد نمبر ۱۹۵۹ء، مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی کا کہنا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد ۱۸۹۵ء میں ہندوستان آئے تھے۔ الفرقان، دسمبر ۱۹۵۹ء لیکن خود مولانا آزاد کے قول اور ان کی بہن کے قول سے ان سارے بیانات کی عدم صداقت خود ہی واضح ہو جاتی ہے۔

(۷) عبدالرزاق ملیح آبادی، م. ب. ک، ص ۱۶۸۔

(۸) ایضاً، ص ۷۳-۱۵۹۔

(۹) مولانا آزاد، غبار خاطر، ص ۶۴۔

(۱۰) ایضاً، ۱۲-۱۰-۴۲، ص ۱۱۲۔

(۱۱) عبدالرزاق ملیح آبادی، م. ب. ک، ص ۲۱۳۔

(۱۲) اے. بی. راجپوت، مولانا آزاد، ص ۱۷۔

(۱۳) مولانا آزاد، غبار خاطر، ص ۱۱۱-۱۱۳۔

(۱۴) ایضاً، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالرحمٰن کے بیٹے تھے۔ انھوں نے ۶؍ مئی ۱۷۳۱ء کو ولی اللّٰہی جماعت کی بنیاد ڈالی تھی۔ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز کے بیٹے تھے۔ ان کے شاگردِ خاص مفتی صدر الدین مولانا آزاد کے والد کے شاگرد تھے۔ رتن لال بنسل، ریشمی پتروں کا شڈینتر، ص ۶۹-۷۲۔

(۱۵) آج کل، ستمبر ۱۹۵۹ء ایس. پی. سین، م. ب. ک، حصہ اوّل، ص ۹۳۔ مولانا کی تعلیم کے سلسلے میں مختلف خیالات اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔ سرکاری ذرائع کے مطابق پہلے انھوں نے کلکتہ کے ایک مدرسے میں تعلیم حاصل کی اور بعد میں لکھنؤ میں ندوۃ العلما میں پڑھا۔ اس کے بعد دلی جا کر مولانا شبلی نعمانی سے عربی و فارسی ادب کا علم حاصل کیا۔ ہوم پالی ٹکل ۴۵/۱۹۲۱ء، ص ۳۔ جواہر لال نہرو کے مطابق ان کی تعلیم کلکتہ کے

عربی اسکولوں میں ہوئی۔ ہمایوں کبیر ''آزاد امرتی گرنتھ''، ص ۳۔ اے. بی. راجپوت، ''مولانا آزاد'' ص ۱۸ کے مطابق مولانا آزاد نے درس نظامی کے نصاب تعلیم میں داخلہ لیا تھا۔ یہاں کا چودہ سال کا نصاب انھوں نے چار سال میں پورا کر لیا تھا۔ اس کے آخری امتحان میں معلمی اور فن تقریر کا امتحان بھی شامل تھا، جسے کامیابی کے ساتھ پاس کر کے ۱۴ سال کی عمر میں وہ ایک کامیاب مقرر و معلم بن گئے تھے۔ مہادیو دیسائی کے مطابق انھوں نے قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ مہادیو بھائی کی ڈائری، حصہ دوم ۱۹۲۰ء، ص ۳۹۸۔ مہادیو بھائی اپنی کتاب مولانا آزاد کے ص ۱۴ پر مولانا آزاد کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں کہ والد نے مجھے اور میرے بھائی کو پرانے طرز پر حصول تعلیم کے لیے مجبور کیا۔ تب بھی ان کی خواہش تھی کہ میں ممتاز ترین عالموں میں سمجھا جاؤں۔ اس لیے ۱۹۰۵ء میں انھوں نے مجھے قاہرہ کی مشہور الازہر یونیورسٹی میں عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے خرچ سے مصر بھیجا۔ میں وہاں دو سال تک رہا اور ۱۹۰۷ء میں ہندوستان لوٹ آیا۔ قاضی عبد الغفار نے بھی اپنی کتاب ''آثارِ ابوالکلام'' میں ص ۲۵ پر مولانا آزاد کو تعلیم کے لیے الازہر بھیجا جانا تسلیم کیا ہے۔ ابوسعید بزمی نے بھی اپنی تخلیق ''آزاد: تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں'' کے ص ۵ پر مولانا الآزاد کے الازہر میں پڑھنے کو صحیح مانا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے مطابق مولانا آزاد درس نظامی کا کورس پورا کرنے کے بعد حصول تعلیم کے مقصد سے عراق، مصر اور شام گئے تھے۔ علی جواد زیدی (مدیر) انوار ابوالکلام، ص ۶۴۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح ہمایوں کبیر اپنے ''اِمرتی گرنتھ'' میں ص ۶۹ پر ان کا الازہر بھیجا جانا تسلیم نہیں کرتے۔ اس تنازع میں سچ یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ بعد میں انھوں نے دیگر ذرائع سے علم حاصل کیا، لیکن باقاعدہ تعلیم کے وقت وہ کہیں گھر سے باہر پڑھنے نہیں گئے اور یہ مدت پندرہ سال کی عمر تک گزر چکی تھی۔ پندرہ سال کی عمر تک وہ ہندوستان سے باہر نہیں گئے تھے۔ لہٰذا باقاعدہ حصول تعلیم کے لیے ان کا باہر جانا غلط اور گھر رہ کر پڑھنا ایک قابل تسلیم حقیقت ثابت ہوتی ہے۔ جہاں تک درس نظامی کا کورس پاس کرنے کی بات ہے، مہادیو دیسائی کے مطابق یہ فارسی میں زبان، فلسفہ، منطق، حساب، جغرافیہ اور تواریخ کا ایک مکمل نصاب ہوتا ہے

جوانھوں نے گھر پر پورا کیا تھا، مولانا آزاد، ص ۱۲۔

(۱۶) آزاد ان کا تخلص تھا۔ خدنگ نظر کے مئی ۱۹۰۰ء کے شمارے میں اس نام سے ایک غزل چھپی ہے۔ خدنگ نظر، مئی ۱۹۰۰ء۔ مولانا کے والد، دادا، پردادا وغیرہ دہلی کے رہنے والے تھے اس لیے وہ نام میں دہلوی لگاتے تھے۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اپنی کتاب مولانا آزاد میں ص ۴۰ پر مولانا کے آبا و اجداد کو لاہور کا رہنے والا بتایا ہے، لیکن عرشؔ ملسیانی کی کتاب ''مولانا آزاد'' کے ص ۲۴ پر انھیں دہلی کا باشندہ مانا گیا ہے۔

(۱۷) عرش ملسیانی، جدید ہندوستان کے معمار : ابوالکلام آزاد، ص ۱۸۔ مجموعۂ مضامین آزاد، اسلام اینڈ نیشنلزم میں ص ۶۹ پر این. اے. کروندکر نے لکھا ہے کہ مولانا آزاد کو اٹھارہ سال کی عمر میں مکہ کے علما کے ذریعہ ابوالکلام کا خطاب عطا کیا گیا تھا لیکن یہ بات صحیح نہیں لگتی۔ یہاں اے. بی. راجپوت کا یہ کہنا ٹھیک لگتا ہے کہ کلکتہ کے درس نظامی کا نصاب پورا کرنے کے بعد وہ ۱۴ سال کی عمر میں ایک مشاق و ماہر مقرر اور معلم بن گئے تھے۔ واضح رہے کہ ابوالکلام کا معنی عظیم مقرر ہوتا ہے۔ مولانا کے بھائی مولوی غلام یٰسین اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ وہ آہ کے تخلص سے غزلیں لکھتے تھے۔ مولانا آزاد کو ایک ماہر مقرر ہونے کی وجہ کر ابوالکلام یا عظیم مقرر تسلیم کر لیا گیا اور لفظ ابوالکلام (قوت گویائی میں ماہر) ان کے نام کے ساتھ جڑ گیا اور آگے چل کر وہ مولانا ابوالکلام آزاد کہلانے لگے۔

(۱۸) خدنگ نظر، مئی ۱۹۰۲ء۔

(۱۹) ابوالکلام آزاد، آزادی کی کہانی، ص ۳۔

(۲۰) ایضاً، ہوم پالی ٹیکل نمبر ۴۵/۱۹۲۱، ص ۴ کے مطابق ابوالکلام الہلال میں جن انگریزی اخبارات کی تنقید کرتے تھے ان کے ترجمے کے لیے اپنے معاون قطب الدین پر انحصار کرتے تھے۔ چراغ حسن حسرت کے مطابق انھوں نے علی پور جیل میں انگریزی پڑھی تھی۔ صبح اُمید، ص ۴۹۔ عبدالرزاق ملیح آبادی نے ''ذکر آزاد'' میں ص ۲۱۶ پر لکھا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں انھیں انگریزی بالکل نہیں آتی تھی، جیل میں اپنے ذاتی مطالعے سے انھوں نے انگریزی کا علم حاصل کیا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں بھی متعدد حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ مولانا انگریزی نہیں جانتے لہٰذا اس وقت کے نظریے کے مطابق انگریزی نہ

جاننے کی وجہ کر انھیں نیم تعلیم یافتہ مانا جاتا تھا۔ سیٹھ گووند داس، نو بھارت ٹائمز، ۱۵؍ فروری ۱۹۵۸ء۔

(۲۱) لارڈ ویول، دی وائسرائے جرنل، ص ۱۴۴، گاندھی جی نے ایک مرتبہ آچاریہ کرپلانی کو بتایا تھا کہ مولانا آزاد انگریزی جانتے ہیں لیکن اس کے زبانی و خیالی تاثر کی باریکی کو نہیں سمجھ سکتے۔ کرپلانی، گاندھی : ہز لائف اینڈ تھاٹس'' ص ۲۷۸۔

(۲۲) عبدالرزاق ملیح آبادی، م. ب. ک، ص ۱۷۹۔

(۲۳) مولانا آزاد، غبار خاطر، ص ۱۱۴۔ مولانا آزاد کا ۱۵-۲-۳۵ء کا خط غلام رسول مہر کے نام، نقش آزاد، ص ۳۶

(۲۴) مولانا آزاد، غبار خاطر، ص ۹-۱۰۸۔

(۲۵) معین شاکر : اے. اسٹڈی اِن سنتھیٹک نیشنلزم، ص ۱۳۷۔

(۲۶) مولانا آزاد، غبار خاطر، ص ۵۰۔

(۲۷) ایضاً، ص ۹۶۔

(۲۸) ایضاً

(۲۹) عبدالرزاق ملیح آبادی، م. ب. ک، ص ۲۳۱۔

(۳۰) اے. بی. راجپوت، م. ب. ک، ص ۱۷۔

(۳۱) مولانا آزاد، غبار خاطر، ص ۹۶۔

(۳۲) ایضاً، ص ۶۱-۲۵۷۔

(۳۳) ایضاً، ص ۱۵-۱۱۴۔

(۳۴) عبدالرزاق ملیح آبادی، م. ب. ک، ص ۳۷۳۔

(۳۵) ایضاً، ص ۳۶۱۔

(۳۶) معین شاکر، م. ب. ک، ص ۱۳۷۔

(۳۷) تارنی شنکر چکرورتی، بھارت میں سشستر کرانتی کی بھومیکا، ص ۱۱۴۔

(۳۸) رام گوپال، م. ب. ک، ص ۹۴۔ سی. وائی. چنتامنی، م. ب. ک، ص ۸۶۔

(۳۹) ایضاً

(۴۰) کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، حصہ ۶، ص ۶۰۸۔

(۴۱) منمتھ ناتھ گپت، م۔ب۔ک، ص ۱۴۵۔

(۴۲) منمتھ ناتھ گپت، م۔ب۔ک، ص ۶۴-۲۶۳۔ تارنی شنکر چکرورتی، م۔ب۔ک، ص ۲۰۸۔ بعد میں ان سبھی کو خفیہ اداروں کے قیام اور انقلابی سرگرمیوں کی وجہ کر گرفتار کیا گیا تھا۔

(۴۳) یہ ۱۹۰۱ء کے قریب قائم ہوئی تھی۔ تارنی شنکر چکرورتی، م۔ب۔ک، ص ۸۸۔

(۴۴) تارنی شنکر چکرورتی، م۔ب۔ک، ص ۱۱۵۔ سڈیشن کمیٹی رپورٹ، ۱۹۱۸ء، ص ۲۹۔ آگے چل کر ۱۹۰۸ء میں سبھی کمیٹیوں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا۔

(۴۵) تارنی شنکر چکرورتی، م۔ب۔ک، ص ۱۵۱۔ منمتھ ناتھ گپت، م۔ب۔ک، ص ۲۳۸۔

(۴۶) شری اروند نے بذات خود قبول کیا تھا کہ تصور آزادی کی تشہیر اگر جرم ہے تو میں قبول کرتا ہوں کہ میں نے یہ کیا ہے اور اس سے کبھی انکار نہیں کرتا۔ اسی لیے میں نے اپنی زندگی کی ساری تمناؤں کی قربانی دی ہے۔ اسی لیے میں سب کچھ چھوڑ کر کلکتے آیا اور اسی کے لیے لگاتار کوشاں رہا۔ شیو پرساد سنہا، م۔ب۔ک، ص ۱۸۷۔

(۴۷) تارنی شنکر چکرورتی، م۔ب۔ک، ص ۳۸ - ۱۳۵۔

(۴۸) سڈیشن کمیٹی رپورٹ، ۱۹۱۸ء، ص ۱۴-۱۱۔

(۴۹) ایضاً، ص ۳۸ - ۲۶۔

(۵۰) ایضاً، ص ۱۲۳۔

(۵۱) ہوم پالی ٹیکل، ۴۵/۱۹۲۱ء، ص ۳۔

(۵۲) ان کے خاندان میں ولی اللٰہی فرقے کا اثر تھا، ان کے والد کے استاد صدر الدین اسی فرقے کے تھے اور اس فرقے کے دوسرے امام شاہ عبد العزیز نے ہندوستان کو مسلمانوں کے لیے دارالحرب قرار دے کر انگریزوں کے خلاف عوامی انقلاب کا اعلان کیا تھا۔ رتن لال بنسل، ریشمی پتروں کا شڑینتر، ص ۶۷-۶۹۔

(۵۳) علی پور جیل میں وہ اپنے ساتھیوں کو ۱۸۵۷ء کے مظالم کے قصے سنایا کرتے تھے۔ نریندر ناتھ بنرجی، اَیٹ دی کراس روڈس، ص ۱۷۲۔

(۵۴) ابوالکلام آزاد، آزادی کی کہانی، ص ۵، ایشیا ویکلی، ۳؍ مارچ ۱۹۶۱ء۔ علی جواد زیدی، انوار ابوالکلام، ص ۱۸۵۔

(۵۵) ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، مولانا ابوالکلام آزاد الہلال کے آئینے میں، ص ۱۰۳ پر مرقوم

گاندھی، شتابدی، حیدرآباد سمینار رپورٹ، ۱۲، ۱۳؍ جولائی ۱۹۶۹ء، ص ۱۲-۱۳۔

(۵۶) سر برن لاویٹ، اے ہسٹری آف انڈین نیشنلسٹ موومنٹ، ص ۶۵-۶۶۔

(۵۷) مولانا ابوالکلام آزاد، م۔ب۔ک، ص ۶۔

(۵۸) علی جواد زیدی، م۔ب۔ک، ص ۱۸۵۔

(۵۹) مہادیو دیسائی، مولانا ابوالکلام آزاد، ص ۱۸۔

(۶۰) ہوم پالی ٹیکل ۲۵/۱۹۲۱، ص ۳ اور ہوم پالی ٹیکل ۴۵/۱۹۲۲ پول، ص ۲-۴۔

(۶۱) ڈاکٹر پی۔ چوپڑا، نیشنل ہیرالڈ، خاص نمبر، ۲۲؍ فروری ۱۹۷۷ء، ۲؍ جون ۱۹۰۸ء کو مانک تلہ (بنگال) میں بم بنانے کا ایک کارخانہ پکڑا گیا تھا۔ اس سلسلے میں جو مقدمہ چلا وہ تاریخ میں علی پور بم کانڈ کے نام سے مشہور ہے۔ منمتھ ناتھ گپت، م۔ب۔ک، ص ۲۶۲۔ شری تارنی شنکر چکرورتی نے ''ہندوستان میں مسلح انقلاب'' میں ص ۱۶۳ پر اس کی تاریخ یکم مئی ۱۹۰۸ء دی ہے۔

(۶۲) مولانا ابوالکلام آزاد، آزادی کی کہانی، ص ۴۔ ایس. پی. سین (مدیر) ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی، حصہ اوّل، ص ۹۴۔

(۶۳) مولانا ابوالکلام آزاد، آزادی کی کہانی، ص ۴، ایس. پی. سین، م۔ب۔ک، ص ۹۴۔

(۶۴) عبدالرزاق ملیح آبادی، م۔ب۔ک، ۱۷-۲۱۵ (اس اخبار کو منشی گوپی ناتھ نکالتے تھے)۔

(۶۵) ایضاً، ص ۲۲۸۔

(۶۶) ایضاً، ص ۲۱۹

(۶۷) جس سطر کی پیروی میں اسے بنیاد مان کر غزل لکھی جاتی ہے اسے اردو میں ''طرح'' کہا جاتا ہے، ہندی میں اسے समस्या पूर्ति کہتے ہیں۔

(۶۸) عبدالرزاق ملیح آبادی، م۔ب۔ک، ص ۱۸-۲۱۶۔

(۶۹) ایضاً، ۲۲۱، فارسی کتاب نل دمن سنسکرت کی قدیم ہندوستانی کہانی ''نل دمینتی'' کا فارسی ترجمہ ہے۔

(۷۰) ایضاً، ص ۲۰۵۔

(۷۱) ایضاً، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، م۔ب۔ک، ص ۱۸۔

(۷۲) عبدالرزاق ملیح آبادی، م۔ب۔ک، ص ۲۲۲۔

(۷۳) ایشیا ویکلی، آزاد نمبر مارچ ۱۹۶۱ء۔

(۷۴) عبد الرزاق ملیح آبادی، م۔ب۔ک، ص ۵۳-۲۵۲۔ منظور احمد نے صفحہ ۱۹ پر لکھا ہے کہ اس کی طباعت ایک پریس مالک محمد موسیٰ کے تعاون سے شروع ہوا تھا۔

(۷۵) ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، م۔ب۔ک، ص ۲۰۔ عبدالرزاق ملیح آبادی، ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی''، ص ۲۵۵۔

(۷۶) لسان الصدق، اپریل، مئی ۱۹۰۵ء، لسان الصدق آزاد کی ادارت میں نکلنے والا ایک ماہوار رسالہ تھا۔

(۷۷) ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، م۔ب۔ک، ص ۲۵۔ عابد رضا بیدار، مولانا ابوالکلام آزاد، ص ۴۴۔ خدنگ نظر شعر و شاعری سے متعلق ایک رسالہ تھا، جو ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ منشی نوبت رائے نظر اس کے مالک تھے۔ جنوری ۱۹۰۰ء میں اس میں نظم کے ساتھ نثر کا بھی ایک حصہ بڑھانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ مولانا آزاد نے اپنے دوست غلام رسول مہر کو ۳-۱۲-۳۶ کے ایک خط میں لکھا ہے کہ میں نے خود منشی نوبت رائے نظر کو اپنے رسالے میں نثر کا حصہ بڑھانے کی صلاح دی تھی۔ ایشیا ویکلی، ۳ر مارچ ۱۹۶۱ء میں مرقوم خط)۔

(۷۸) ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے اپنی کتاب ''الہلال کے آئینے میں'' لکھا ہے کہ ۱۹۰۳ء میں احسن الاخبار بند ہوگیا لیکن سید شہید الدین ایشیا ویکلی کے آزاد نمبر میں لکھتے ہیں کہ اخبار بعد میں بھی انجمن ترقی اردو کے ماتحت نکلتا رہا اور مولانا اس کی ادارت کرتے رہے۔

(۷۹) ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، م۔ب۔ک، ص ۲۵ اور ایشیا ویکلی، ۳ر مارچ ۱۹۶۱ء۔

(۸۰) عرش ملسیانی نے اپنی کتاب ''جدید ہندوستان کے معمار: مولانا ابوالکلام آزاد'' میں ص ۲۱ پر لسان الصدق کی اشاعت کی تاریخ ۲۰ر ستمبر ۱۹۰۳ء دی ہے جو غلط ہے۔

(۸۱) لسان الصدق ۲۰ر نومبر ۱۹۰۳ء، ایضاً، اگست، ستمبر ۱۹۰۴ء۔

(۸۲) عابد رضا بیدار، م۔ب۔ک، ص ۹۴۔

(۸۳) ایضاً، ص ۸۷۔

(۸۴) اس وقت نئے اخبارات نکالنے پر دوسرے پرانے اخبار والے نئے اخبار کے تئیں

تنقیص کر رہے تھے۔ لسان الصدق، ۲۰ر دسمبر ۱۹۰۳ء۔

(۸۵) لسان الصدق ۲۰ر دسمبر ۱۹۰۳ء۔

(۸۶) ایضاً، جون - جولائی ۱۹۰۴ء۔

(۸۷) ایضاً، (بریکٹ کے الفاظ میرے ہیں)

(۸۸) ایضاً، اگست - ستمبر ۱۹۰۴ء

(۸۹) ایضاً

(۹۰) ایضاً

(۹۱) ایضاً

(۹۲) ایضاً

(۹۳) ایضاً

(۹۴) ایضاً

(۹۵) ایضاً

(۹۶) عابد رضا بیدار نے اپنی کتاب ''مولانا آزاد'' میں اس شمارے کو رسالے کا نواں اور آخری شمارہ بتایا ہے جب کہ یہ بارہواں شمارہ ہے۔ اس میں خود مولانا لکھتے ہیں کہ لسان الصدق کے گزشتہ گیارہ پرچے ہمارے سامنے ہیں۔

(۹۷) اس سے پانچ سال پہلے سے مولانا آزاد و شبلی نعمانی کی خط و کتابت چل رہی تھی۔ عبدالرزاق ملیح آبادی، م۔ب۔ک، ص ۲۸۸۔ الجمعیۃ، ستمبر ۱۹۵۸ء

(۹۸) عبدالرزاق ملیح آبادی، م۔ب۔ک، ص ۲۵۶۔

(۹۹) ایضاً، ص ۲۹۱۔ ۱۹۰۵ء کے آخر سے ۱۹۰۶ء کے شروع تک الندوہ کی ادارت کی۔ الجمعیۃ، دسمبر ۱۹۵۸ء، جناب غلام رسول مہر کے مطابق انھوں نے ۱۹۰۵ء کے آخری ایام سے لے کر ۱۹۰۶ء کے آغاز تک یہ کام کیا۔ (شاہراہ، آزاد نمبر، فروری، مارچ ۱۹۵۹ء)۔ عابد رضا بیدار نے لکھا ہے کہ الندوہ میں مولانا اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک معاون مدیر رہے تھے۔ مولانا آزاد، ص ۱۰۶۔ عرش ملسیانی نے اپنی کتاب میں یہ عرصہ چھ ماہ کا بتایا ہے۔ م۔ب۔ک، ص ۲۳۔

(۱۰۰) ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، ص ۲۹ پر مرقوم، شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی نے ۱۹۰۴ء میں

۱۰- خاتمہ

۱- برطانوی مصنف لائینل فیلڈین نے اپنی کتاب ''بیگر مائی نیبر'' میں لکھا تھا کہ ''حکومت برطانیہ اپنے بنے رہنے کے لیے ہی ''ہندوستان میں اقلیتوں کی حفاظت'' کی آڑ کا سہارا لے رہی ہے''۔

۲- ۱۹۲۷ء میں ہندوستان آئے ہوئے برطانوی لیڈر فینر براک وے نے مسٹر جناح کی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہر سماجی بحران میں مسٹر جناح عوام کے ساتھ نہ ہو کر حکمراں طبقے کے ساتھ کھڑے ہوں گے اور مسلم مسائل کا استعمال عوام کو بانٹنے کے لیے کریں گے۔ وہ صرف ایک موقع پرست ہیں (کے. کے. عزیز، بریٹین اینڈ مسلم انڈیا، ص ۱۹۳)۔

۳- ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک وہ رانچی میں ۴ سال تک نظر بند رہے۔ ۱۹۲۱ء میں علی پور جیل و بانکوڑا میں ۲ سال قید رہے۔ نینی جیل، میرٹھ سنٹرل جیل، گونڈا، مرادآباد اور دلی کی سنٹرل جیل میں ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء کے دوران قید رہے۔ ۹/ اگست ۱۹۴۲ء کو احمد نگر قلعے کی جیل میں قیدی بن کر گئے اور پھر ۱۵/ جون ۱۹۴۵ء کو بانکوڑا کی جیل سے رہا کیے گئے۔ الجمعیۃ، دسمبر ۱۹۵۸ء میں اس طرح نظر بندی قید کا کل عرصہ ۱۶ سال لکھا گیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں مانا جاسکتا، کیوں کہ ۱۱/ اگست ۱۹۴۲ء کو مولانا آزاد نے اپنے ایک خط میں اس وقت تک کی اپنی کل قید کی مدت ۷ سال ۸ ماہ لکھی ہے۔ (غبار خاطر، ص ۴۷۰)۔ میرے حساب سے بھی اتنا ہی عرصہ ہوتا ہے۔ اس میں ۹/ اگست ۱۹۴۲ء سے ۱۵/ جون ۱۹۴۵ء کی مدت اور جوڑ دینے پر کل عرصہ ۱۰ سال سوا چھ ماہ ہوتا ہے۔

۴- مسلم لیگی کانگریسی لیڈروں کو طرح طرح سے بے عزت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیگی اخبار ''ڈان'' کے ۳۰/ جون ۱۹۴۵ء کے شمارے میں مولانا آزاد کو ''سوَر''، ''ہندوؤں کا لونڈا'' کہہ کر گالیاں دی گئی تھیں۔ مولانا آزاد کے کشمیر جانے پر ان کے استقبال میں نکلے جلوس میں جو لوگ کشتیوں میں سوار تھے ان پر لیگیوں نے پتھر برسائے تھے اور جلوس دیکھنے والوں میں سے ایک شخص کو مکان کی چھت سے پھینک دیا تھا جو وہیں مر

گیا (قاسمی دہلوی، خانہ جنگی، ص ۸-۹)۔ لیگی قائد مسٹر جناح نے اپنے ایک بیان میں مولانا آزاد کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم غداروں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ (مولانا آزاد) اپنے آقا کے نمک حلال ثابت ہوئے ہیں لیکن اگر وہ اس جذبے کے نصف کے ساتھ بھی خدا کی عبادت کرتے، جس سے انھوں نے کانگریس کی خدمت کی ہے تو کم از کم سوسائٹی میں انھوں نے ایک باعزت رتبہ حاصل کیا ہوتا۔ قاسمی دہلوی، خانہ جنگی، ص ۳ پر لیگی اخبار ''منشور'' سے ماخوذ۔

(۷۱) ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری، پاکستان، منروا پبلی کیشن، لاہور، ۱۹۴۴ء۔
(۷۲) شیش دھر سنہا، انڈین انڈپنڈنس ان پرسپیکٹو، ایشیا پبلشنگ ہاؤس، کلکتہ، ۱۹۶۴ء۔
(۷۳) شیو نارائن رائے، گاندھی، انڈیا اینڈ دی ورلڈ، نچی کیتا پبلی کیشن، بمبئی، ۱۹۷۰ء۔
(۷۴) سچن سین، برتھ آف پاکستان، جنرل پرنٹرس اینڈ پبلشرس، کلکتہ، ۱۹۵۵ء۔
(۷۵) سکھبیر چودھری، گروتھ آف نیشنلزم اِن انڈیا، جزو اوّل و دوم، تریمورتی پبلی کیشن، انڈیا، ۱۹۷۳ء۔
(۷۶) سریندر سوری، پالی ٹیکس اینڈ سوسائٹی، نیا پرکاشن، کلکتہ، ۱۹۷۴ء۔
(۷۷) سلیم ایم. قریشی، جناح اینڈ میکنگ آف نیشن، کاؤنسل آف پاکستان اسٹڈیز، کراچی؛ ۱۹۶۹ء۔
(۷۸) سی. ایچ. فلپس اینڈ میری ڈورنی بید رائٹ، دی پارٹیشن آف انڈیا، پالیسیز اینڈ پرسپیکٹو، جارج ایلین اینڈ انون، لندن، ۱۹۷۰ء۔
(۷۹) سید شریف الدین پیرزادہ، ایوالیوشن آف پاکستان، آل پاکستان لیگل ڈیسیزنس، لاہور، ۱۹۶۳ء۔
(۸۰) ہمفری ٹیویلین، دی انڈیا وی لیفٹ، میک ملن، لندن، ۱۹۷۲ء۔
(۸۱) ہیرین مکھرجی، دی جینٹل کولوسس، منیشا گرنتھالیہ، کلکتہ، ۱۹۴۴ء۔
(۸۲) ہیریندر ناتھ مکھرجی، انڈیا اسٹرگلس فار فریڈم، کتب، بمبئی، ۱۹۴۸ء۔
(۸۳) آزاد، اسلام اینڈ نیشنلزم، قلم کار پبلی کیشن، دہلی۔
(۸۴) گاندھی شتابدی سمینار حیدرآباد، ۱۲-۱۳؍ جولائی ۱۹۶۹ء کی رپورٹ، ابوالکلام آزاد، حیدرآباد، ۱۹۶۹ء، اورینٹل ریسرچ انسٹی چیوٹ، حیدرآباد۔
(۸۵) اسٹڈیز ان ہسٹری، ریسرچ پبلی کیشن اِن سوشل سائنس، دہلی۔
(۸۶) کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جزو ششم، ایچ. چند اینڈ کمپنی، دہلی۔
(۸۷) انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا، جزو ۱۷، ولیم بینٹن، لندن ۱۹۶۲ء۔
(۸۸) ہندوستان اور پاکستان، اسلامی مرکز وائی. ایم. سی. اے. لاہور۔

□□□